اِنقلاب

اٹھارہ سو ستاون

پی۔ سی۔ جوشی



قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی

انقلاب ۱۸۵۷ء

انقلاب ۱۸۵۷ء

پی۔ سی۔ جوشی



قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل

حکومت ہند

ویسٹ بلاک۔I، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

پیش لفظ

"ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے"

پہلے جمادات تھے۔ ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔ نباتات میں جبلّت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔ اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رک جائے۔ تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔ تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔ زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی، اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔ جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

Inqilab 1857

By : P.C. Joshi

سنہ اشاعت:

پہلا اڈیشن : 1972

دوسرا اڈیشن : 1983

تیسرا اڈیشن : 1998 تعداد 1100

قیمت : -/75

سلسلۂ مطبوعات : 781

ناشر : ڈائریکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر۔ کے۔ پورم،
نئی دہلی۔ 110066

طابع : سپریم آفسیٹ پریس، مالویہ نگر، نئی دہلی۔

دیباچہ

پیپلز پبلشنگ ہاؤس نے، ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی صد سالہ سالگرہ کے موقع پر ایک یادگار صحیفہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس سو سال کی پرانی شورش کے قومی رنگ سے وطن پرست علمار میں بالعموم اتفاقِ رائے پایا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود بد قسمتی سے ہندوستان کی تاریخ میں یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے جو ابھی تک حل نہیں ہوا۔ یہ صحیفہ ایک مباحثے کی حیثیت رکھتا ہے اور ہر مقالہ نگار نے اپنے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔

تلمیذ خلدون ایک پرانے محقق ہیں اور آپ نے اس موضوع کے تحقیقی مطالعے میں قدیم تاریخی دستاویزات سے استفادہ کیا ہے۔ دلی یونیورسٹی کے ڈاکٹر کے ایم اشرف نے وہابیوں کا نظریہ اور بغاوت میں اُن کے کردار کی نقش گری کی ہے۔ وہابیوں کی ایک منظم اور مؤثر جماعت تھی جو کسی قدر قدیم تر جاگیردار مگر روشن خیال طبقے کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کرتی تھی۔ بینے گھوش نے روشن خیال بنگالیوں کے مخالفانہ مگر معقول رویّے کا پس منظر اجمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہ بنگالی جدید تعلیم سے بہرہ مند، نئے پڑھے لکھے طبقے کے نمائندے تھے۔ میں نے ۱۸۵۷ء کے انقلاب سے متعلق مختلف اور متضاد نظریات پر بحث کر کے اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ میں کوئی پیشہ ور مورّخ نہیں ہوں اس لیے میں نے طویل اقتباسات سے کام لیا ہے اگرچہ یہ ایک فرسودہ طریقہ ہے۔ اگر میرا یہ طریقہ جدت پسند ادبار کو ناگوار گزرتا ہے تو میں یہ عذر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ میں نوجوان متعلمین کو اُن قدیم اور نایاب نسخوں میں سے مواد مہیا کر رہا ہوں جو ان کی دسترس سے دور ہیں۔

مختلف زبانوں کے ہندوستانی قومی ادب میں جو حبِ وطن کا رجحان ہے، وہ بڑی حد تک ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی دین ہے۔ اس سے ہندوستانی ادبار کو درد و کرب، جد و جہد اور ایثارِ نفس کے ڈرامائی واقعات اور قوم پرستی کے بلند پایہ مضامین میسر آئے ہیں۔ اس کتاب کے ادبی حصے میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے پروفیسر پی۔ سی۔ گپتا نے ہندی ادب اور لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر احتشام حسین نے اردو ادب پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کے۔ ایم۔ اشرف نے غالب پر ایک مقالہ شاملِ تالیف

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجی ارتقاء اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتّب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظرِ ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائریکٹر

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست مضامین

کیا ہے۔ بنگال کے ادبی نقاد اور ادیب گوپال ہلدر نے معاصر بنگالی ادب پر بحث کی ہے۔

ہم اُن غیر ملکی علمار کے شکر گزار ہیں جنھوں نے اپنے بیش بہا مقالات سے ہمیں نوازا ہے۔ انھوں نے ان مقالات میں اپنے اپنے ملک میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس باب میں جیمز برائن کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ برطانوی ردعمل سے متعلق مقالے کے مصنف ہیں۔ ان کی ناگہانی وفات نے ہمیں تاریخ ہند کے ایک مخلص، ہمدرد اور دانش مند طالب علم سے محروم کر دیا ہے۔ یہ مقالات بڑی محنت، تحقیق و تدقیق کا نتیجہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے ظاہر ہے کہ ان تمام غیر ممالک میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا خیر مقدم کیا گیا کیوں کہ یہ غلامی کے برطانوی جوئے سے نجات پانے کے لیے ہندوستانیوں کی قومی بغاوت تھی جس نے عالمی جمہوری حلقوں میں یک جہتی کے جذبات کو ابھارا۔ ہمیں امید ہے کہ یہ غیر ملکی مقالات ہندوستان کی قومی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے میں مدد دیں گے جس کا ہمیں اب تک علم نہ تھا۔

ہم اپنے مقالہ نگاروں کے ممنون ہیں جن کے تعاون سے اس یادگار صحیفے کی اشاعت ممکن ہو سکی۔ ہم ان دوستوں کے بھی مرہونِ منت ہیں جن کی محبت آمیز اور بے غرض کوشش سے اس کتاب کا مسودہ طباعت کی منزل تک پہنچ سکا۔

پی۔ سی۔ جوشی

حصّہ اوّل

تلمیذ خلدون

بغاوتِ عظیم

۱۔ تمہید

ہندوستان کا غدر (۱۸۵۷ء) برطانوی اور ہندوستانی مورّخین کا ایک محبوب موضوع رہا ہے۔ برطانوی مورّخین نے اسے محض "فوجی بغاوت"[۲] تصور کیا ہے اور اسے اس سے زیادہ اہمیت دینے پر مائل نہیں ہوئے۔ اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ اس بغاوت کی تہ میں حب وطن کا کوئی جذبہ کارفرما نہ تھا بلکہ اس میں غرض مندی کا پہلو نمایاں تھا۔ اسے نہ تو وطن دوستوں کی رہنمائی حاصل تھی اور نہ ہی عوام کی حمایت[۳]۔ اس کے بالکل برعکس ہندوستانی مصنفین نے اسے شاندار "جنگِ آزادی[۴]" کا نام دیا ہے اور اس کی عظمت کے راگ گائے ہیں۔ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ عوام نے جوق در جوق اس جنگِ آزادی میں شرکت کی، فرنگیوں کو دم نہ لینے دیا اور آخر دم تک لڑتے رہے۔ اگر ہم برطانوی مورّخین کے نظریہ کو شہنشاہی نخوت کا نتیجہ قرار دیں تو یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ ہندوستانی مورّخین کی تاویل غیر معقول قوم پرستی کا مظاہرہ ہے۔ دونوں نظریے انتہا پسندانہ ہیں اور فریقین پر اپنے اپنے مفاد کی طرف داری اور مصلحت کا گمان گزرتا ہے۔

برطانوی نظریہ یقیناً کمزور ہے۔ یہ اس صورتِ حال کے سبب پر روشنی نہیں ڈالتا کہ "دس دنوں کے اندر صوبۂ اودھ میں انگریزی حکومت کے پرخچے اڑ گئے اور اس کا نام ونشان باقی نہ رہا"[۶]۔ برطانوی نظریہ اس حقیقت کو بھی نظرانداز کرتا ہے کہ "متعدد مقامات پر فوجیوں کی سرکشی سے پہلے ہی لوگوں نے علم بغاوت بلند کر دیا تھا"[۷] نیز اگر یہ خالص فوجی شورش تھی اور عوام کا اس سے کوئی تعلق نہ تھا تو "ملک کے دیہاتیوں اور شہریوں کو کن جرائم کی بنا پر جرمانے اور پھانسی کا سزاوار سمجھا گیا"[۸] اور پھر باغیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لارڈ کیننگ "سرکش سپاہیوں کی بہ نسبت ان شہریوں پر کیوں زیادہ شد ومد کے ساتھ برسے جنھیں بغاوت پر اکسایا گیا تھا۔"[۹] پھر سوال اٹھتا ہے کہ اورنگ آباد کے غدر

کے ہر خیمے میں خدمت گزاری پر مامور تھے اور کھانے کی میز تک کے گرد کھڑے ہوتے تھے۔ کوئی اچانک حملہ کرنا ایک معجزہ تھا کیوں کہ زبانی افواہیں تیز رفتاری میں ہمارے رسالے کو بھی مات کرتی تھیں[13]۔ کے اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ دریائے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقوں میں وہ شاید ہی کوئی مسلم یا ہندو ہوگا جو ہمارے خلاف صف آرا نہ ہو[14]۔ مالیسن کا بھی یہ بیان ہے کہ اودھ، روہیلکھنڈ، بندیلکھنڈ اور ساگر و نربدا کے چار شمالی صوبوں میں "عوام کی اکثریت نے برطانوی حکومت کے خلاف بغاوت کی[15]۔ پادری کیو براؤن نے بھی اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ "اودھ شدید تر اور بے باکانہ بغاوت کا مرکز تھا کیوں کہ یہاں یہ واقعی مقبول عام تھی[16]۔" پنجاب میں جہاں کوئی بغاوت رونما ہوئی وہ تمام مقامی آبادی متمول ساہوکار سے معمولی بیوپاری تک اور سرکاری ٹھیکہ دار سے ادنیٰ قلی تک الگ تھلگ رہی، کسی سے کوئی مدد یا رسد وغیرہ نہ ملی۔" یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے ماہ ستمبر کے وسط میں دہلی پر قبضہ ہو گیا[17]۔ تھامسن تو کے قول کے مطابق "دختر کُش راجپوت، کٹر برہمن، متعصب مسلمان اور عیش پسند توند والا امن چلا مرہٹہ سبھی اس جہاد میں شامل ہو گئے۔ گائے کا قاتل اور گائے کا پجاری، خنزیر سے کراہیت رکھنے والا اور خنزیر کا گوشت کھانے والا۔ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا کلمہ پڑھنے والا اور برہم کے منتروں کو گنگنانے والا" سبھی نے مل کر بغاوت کی[18]۔ آر۔ سی دت فرماتے ہیں: "اس میں کوئی شک نہیں کہ سیاسی مقاصد محض ایک فوجی بغاوت کو شمالی اور وسطی ہندوستان کے اکثر طبقوں میں پھیلانے میں معاون ثابت ہوئے اور اسے ایک سیاسی شورش میں بدل دیا[19]۔" غرض برطانوی مورخین کا یہ بلند بانگ دعویٰ کہ ۱۸۵۷ء کا انقلاب صرف ایک فوجی بغاوت تھی، حقیقت کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بغاوت پھوٹنے کے چند ہی ہفتوں کے اندر شمالی ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے نام و نشان مٹنے میں تھوڑی سی ہی کسر باقی رہ گئی تھی۔

لیکن اس بغاوت کو صرف اس لیے کہ یہ انگریزوں کے خلاف بہت بڑی شورش تھی، قومی آزادی کی جنگ کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس دعوی کی صاف تردید" اس امر سے ہوتی ہے کہ جوں ہی کسی ضلعے سے باغی فوجیوں اور سرکش سرداروں کو بھگا دیا جاتا وہاں فوراً امن و امان بحال ہو جاتا[21]۔" اس کے علاوہ یہ خیال تاریخی اعتبار سے بھی صحیح نہیں۔ اُس وقت ہندوستانیوں میں قومیت کا ایسا جذبہ نہ پایا جاتا تھا جس کا مفہوم آج ہمارے ذہن میں ہے۔ قوم پرستی کا یہ فقدان اس بات سے بھی ظاہر ہے کہ بغاوت کے لیے کوئی عوامی منصوبہ نہیں مرتب کیا گیا تھا اور جب بغاوت پھوٹی تو باغیوں کی رہنمائی کے لیے کوئی مرکزی تنظیم موجود نہ تھی۔ بخت خاں، نانا صاحب، تانتیا ٹوپے، رانی جھانسی،

اور ناگپور کے تمام فرنگیوں کے قتل کی سازش کے ساتھ ساتھ واقع ہوتے کا کیوں کر انکشاف ہوا؟ اور مشرق سے ناگہاں اٹھنے والے طوفان کی سی تیزی کے ساتھ بغاوت کی کونسی آندھی چلی جس نے ہر طرف "ہزاروں میلوں تک کمپنی کے نظام حکومت کا تختہ الٹ کر اسے تہس نہس کر دیا حالاں کہ یہ نظام ہر قسم کے صدمے سے محفوظ نظر آتا تھا۔"

بغاوت کا طول و عرض پادری الیگزینڈر ڈف، چارلس بال بلکہ سر جان ولیم کے اور کرنل جی بی۔ مالیسن کے مذکورۂ ذیل بیانات سے بخوبی ظاہر ہے حالاں کہ وہ اسے محض ایک فوجی غدر قرار دیتے ہیں۔ بقول ڈف "جب بھی دشمنوں کا سامنا ہوا اُن میں بھگدڑ مچ گئی۔ وہ تتر بتر ہو گئے اور اپنی توپیں بھی کھو بیٹھے لیکن متواتر شکستوں کے باوجود وہ منظم ہو کر آدھمکے گویا از سر نو آمادۂ پیکار ہیں۔ جوں ہی ایک شہر پر قبضہ کیا جاتا ہے یا کمک بھیج کر کسی اور کو نجات دلائی جاتی ہے تو دوسرا خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ جیسے برطانوی لشکر کی ریل پیل سے ایک ضلع میں امن و امان کا اعلان کیا جاتا ہے تو کسی اور میں فتنہ و فساد بپا ہو جاتا ہے۔ جب بھی اہم مقامات کے درمیان کوئی شاہراہ کھلتی ہے فوراً دوبارہ مسدود ہو جاتی ہے اور سال بھر کے لیے رسل و رسائل کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اِدھر ایک بستی کو باغیوں اور سرکشوں سے پاک کیا اُدھر دوسری میں وہ دُگنے تگنے ہجوم کے ساتھ ٹوٹ پڑے۔ جوں ہی نقل و حرکت کرنے والا فوج کا پرا دشمن کی صفوں کو چیرتا ہوا گزر جاتا ہے اس کے پس پشت تمام علاقے پر مخالف پھر سے قابض ہو جاتے ہیں۔ بدخواہوں کے ہرے میں اگر کوئی شگاف پیدا ہوتا ہے تو آن کی آن میں پُر ہو جاتا ہے اور مستقل صفائی یا فتح کا نشان کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہماری قلیل مگر بہادر فوجیں باغیوں کے ٹڈی دل میں سے بجائے ایک زبردست ہل کی طرح ناہموار کھیت میں کوئی نشان چھوڑنے کے اس طرح گزر جاتی ہیں جیسے ایک عقاب کرۂ ہوائی میں سے، یا جیسے ایک ذی شان جہاز سمندر کی ہموار سطح کو بغیر کوئی لکیر ڈالے عبور کر جاتا ہے۔"[12]

چارلس بال نامی ایک اور برطانوی مورخ بغاوت کی مقبولیت کو یوں بیان کرتا ہے:

'اودھ میں باغیوں کو نقل و حرکت کے وقت رسد رسانی کی ضرورت نہ تھی کیوں کہ لوگ ہمیشہ ان کی خاطر تواضع کرتے۔ وہ اپنا سامان بغیر محافظ کے راستے میں چھوڑ جاتے کیوں کہ لوگ اس پر ہاتھ نہ ڈالتے۔ انھیں ہمیشہ اس بات کا علم ہوتا تھا کہ وہ خود کہاں ہیں اور ان کا فرنگی دشمن کہاں مقیم ہے کیوں کہ لوگ گھنٹے گھنٹے کے بعد ان کو صورت حال سے مطلع کرتے رہتے۔ انگریزوں کی کوئی تدبیر بھی راز میں نہ رہ سکتی تھی کیوں کہ بغاوت سے خفیہ ہمدردی رکھنے والے ہندوستانی، برطانوی لشکرگاہ

کارندوں اور ملازموں کی نجی بالائی آمدنی شامل نہ تھی۔[۲۶] کمپنی کے ادنیٰ ملازم بھی جب انگلستان کو لوٹتے تو امرا کی طرح ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہنے لگتے اور بالعموم انھیں "نواب" کہہ کر مخاطب کیا جاتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ کس طرح اس ملک میں غیر قانونی طریقوں سے بے حساب دولت بناتے۔

۱۷۶۵ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال کی دیوانی حاصل کر لی۔ اس وقت تک یہ کمپنی تمام یورپی حریفوں کو ہندوستان کی منڈی سے خارج کر چکی تھی۔ دیوانی کے اصول اور ہندوستان کے ساتھ تجارت کی اجارہ داری سے کمپنی اور اس کے ملازمین کے منافع میں اور بھی اضافہ ہوا لیکن ہندوستان کے لوگوں کی پریشانی اور ناداری بڑھ گئی۔ دیوانی کے بارے میں ایڈم سمتھ فرماتے ہیں: "کسی بھی ملک کے لیے خالص تجارتی کمپنی کی حکومت شاید ہر قسم کی حکومت سے بدتر ہے۔ کبھی بھی کوئی اور فرماں روا اپنی رعایا کی خوشی یا خستہ حالی، اپنی قلمرو کی بہبودی یا بربادی اور اپنی حکومت کی شان یا ذلت سے اس قدر لاپروا نہ تھا یا تقاضائے حالات سے نہ ہو سکتا تھا جس قدر کہ ناقابلِ مزاحمت اخلاقی اسباب کی بنا پر ایسی تجارتی کمپنی کے بیشتر مالک ہیں یا لازماً ہونے چاہئیں۔ یہ ایک انوکھی حکومت ہے جس کا ہر حاکم ملک سے نکل جانا اور سرکار کے ساتھ جلد سے جلد اپنا قطع تعلق کرنا چاہتا ہے۔ جونہی وہ یہاں سے مال وزر کے ساتھ رخصت ہوتا ہے، اس سرکار کے مفاد سے کامل بے رخی کا اظہار کرتا ہے۔ گویا سارے ملک کو بھونچال ہڑپ کر گیا ہے۔"[۲۷] ولیم بولٹس کے قول کے مطابق "جب کہ یہ (برطانوی) قوم آیندہ حاصل ہونے والے پھل پر نظریں گاڑے ہوئے ہے، کمپنی اور اس کے نائبوں کو درخت کو جڑ سے اکھیڑ پھینکنے کی کھلی چھٹی ہے۔ اگر کمپنی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا تو یہ تباہ ہو جائے گی۔ بنگال میں برطانوی مقبوضات کنگال ہو جائیں گے۔"[۲۸] ہومز کا بیان ہے کہ "دیسی حکام کسانوں پر ظلم روا رکھتے اور مالیہ میں غبن کرتے تھے۔ کمپنی کے ملازمین ان بدعنوانیوں سے چشم پوشی کرنا سود مند سمجھتے تھے۔"[۲۹]

انگلستان میں لوٹ کے مال کا انبار لگنے لگا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ملک میں اس قسم کی دوسری ذخیرہ اندوزیوں کے ساتھ سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پڑ گئی۔ مارکس کا قول ہے کہ "منشور یافتہ کمپنیاں، دولت اندوزی کی ہوس کو بڑھانے کا قوی سبب تھیں۔ جو خزانے یورپ سے باہر قتل و غارت اور دوسروں کو غلام بنانے سے حاصل ہوئے متواتر مادرِ وطن (ام البلاد) میں پہنچتے رہے اور وہاں بہت بڑا سرمایہ فراہم ہو گیا۔"[۳۰] مارکس سے اتفاق رائے کرتے ہوئے بروکس ایڈمس طنزاً کہتا ہے: "اگر واٹ اپنے زمانے سے پچاس سال قبل ہوتا تو وہ خود اور اس کی ایجاد ایک ساتھ خاک میں ملتے" کیونکہ دونوں سے کام لینے کے لیے مطلوبہ سرمایہ کی کمی ہوتی۔[۳۱]

کنور سنگھ اور فیض آباد کے مولوی صاحب کی مہمات اپنے اپنے علاقوں تک محدود تھیں۔ مختلف باغی راہ نماؤں یا بغاوت کے مرکزوں کے مابین کوئی رابطہ قائم نہ تھا۔ اس کے برعکس جوں ہی برطانوی حکومت کے آثار شتے دکھائی دیتے، باغی سرداروں اور عوام میں علاقائی اور طبقاتی تفرقات رونما ہو جاتے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ انگریزوں کے خلاف متحدہ محاذ کمزور ہو جاتا۔ ۲۲

انتہا پسندانہ ہندوستانی نظریہ بغاوت کی جغرافیائی حد بندی کے لحاظ سے بھی غلط ثابت ہوتا ہے۔ اس بغاوت سے ملک کے رقبے کا صرف چھٹا حصہ اور آبادی کا فقط دسواں حصہ متاثر ہوا۔ صرف اسی پر بس نہیں، اس شرمناک حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بغاوت کو خود ہندوستانیوں کی امداد کے بغیر فرو نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ۲۳

لہٰذا بغاوت کی ماہیت کو سمجھنے اور ہندوستان کی تاریخ مابعد پر اس کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی اثرات کا جائزہ لینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم بغاوت کے حقیقی اسباب کی تحقیق، اس خونریز اور دہشت انگیز دور کی چھان بین اور اس میں مختلف طبقات کے کردار کا مطالعہ کریں۔ صرف اسی صورت میں ہم داستانِ انقلاب کو اس کیچڑ سے پاک کر سکیں گے جو مخصوص دلائل اور خود غرضانہ بیانات نے اچھالا ہے۔

۲- اسباب

بغاوت کا اصلی سبب شہنشاہیت پرستوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی اقتصادی لوٹ کھسوٹ تھا۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے قیام کے دنوں کی طرف رجوع کرنا مناسب ہوگا۔ جب پرتگیزی، ولندیزی اور فرانسیسی کمپنیوں کے ہندوستان کی تجارت سے بے انتہا منافع کمانے کی داستانیں پھیلیں تو برطانوی من چلے سوداگر بھی اسی غرض سے ایک تجارتی کمپنی قائم کرنے پر آمادہ ہوئے۔ ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملکہ الزبتھ اوّل سے ہندوستان اور مسالوں کے جزیروں کے ساتھ تجارت کرنے کے لیے ایک اجازت نامہ حاصل کیا۔ اُس زمانے میں ہندوستان کے ساتھ تجارت سے مراد یہ تھی کہ اس ملک سے ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں اور دوسری نفیس اور قیمتی مصنوعات خریدی جائیں۔ ہندوستانی کاریگر چونکہ عام طور پر بین الاقوامی منڈی میں اپنے مال کی قدر و قیمت سے بے خبر تھے اس لیے چالاک اور بے ایمان غیر ملکی تاجر اُن کا مال کوڑیوں کے مول خرید لیتے اور اونچے داموں بیچتے۔ ۱۶۶۵ء تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے منافع کی شرح ایک سو سے ڈھائی سو فی صدی تک سالانہ تھی۔ ۲۵ اس میں کمپنی کے ہندوستان میں

تجارتی تعلقات میں اس انقلاب کا ہندوستان کی سیاسی تنظیم پر بہت ناگوار اثر پڑا۔ اجڑے ہوئے صنعت کاروں نے زراعت کا سہارا ڈھونڈا۔[38] شہنشاہی حلقۂ اقتدار کے اندر کسی جدید صنعتی نظام کی ترقی کا کوئی امکان نہ تھا۔ زمین پر پہلے ہی کافی دباؤ تھا اور یہ مزید بار سنبھالنے کے قابل نہ تھی۔ موجودہ ابتدائی قسم کے زرعی آلات کے ساتھ گہری کھدائی کی کاشت ناممکن تھی اور پھر بھاری لگان کی شرح کے نئے طریقے نے اور بھی غضب ڈھایا۔ بنگال میں ۶۵-۱۷۶۴ء میں مالیہ کی کل رقم آٹھ لاکھ گیارہ ہزار پونڈ تھی لیکن دیوانی کے پہلے ہی سال یعنی ۶۶-۱۷۶۵ء میں یہ رقم بڑھ کر سترہ لاکھ چالیس ہزار پونڈ ہو گئی۔[39]

ہندو اور مسلم حکومتوں کے عہد میں بادشاہ سالانہ پیداوار کا کچھ حصہ بطور لگان وصول کرتا تھا۔ یہ حصہ ٹیکس کے طور پر خود اختیار گرام پنچایت کے مشترکہ مالکان زمین کی طرف سے حکمراں یا اس کے نامزد نائب کو ادا کیا جاتا تھا۔ "ہندوستان میں زمین کا مالک قبیلہ یا اس کی شاخ۔ گرام پنچایت۔ فرقہ یا گاؤں میں آباد برادری۔ ہوتی تھی۔ بادشاہ کو کبھی بھی زمین کا مالک تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ جاگیرداری یا شہنشاہی نظام کے تحت سوائے کسانوں کے، زمین کی ملکیت کا حق کسی کو حاصل نہ تھا۔"[40] کمپنی کے عہدِ حکومت میں یہ فرض کر لیا گیا کہ سرکار ہی زمین کی سب سے بڑی مالک ہے۔ پہلے گرام پنچایتیں مل کر بحیثیت مجموعی جنس کا خاص حصہ حکومت کو ادا کرتی تھیں۔ اب اس روایتی دستور کی جگہ کمپنی نے زمین پر نقد لگان کا طریقہ نافذ کیا اور یہ لگان بلا لحاظ اچھی یا بُری فصل یا رقبہ کاشت مقرر کر دیا جاتا۔ بیشتر صورتوں میں مالیہ کی تشخیص شخصی ہوتی تھی۔ یہ لگان یا تو سیدھا کاشتکار پر لگا دیا جاتا یا سرکار کے مقررہ زمینداروں پر۔ اس شخصی تشخیص کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ گرام سماج کی معاشیات میں رخنہ پیدا ہو گیا۔ جہاں کسانوں کی جماعتوں یا گرام پنچایتوں کو زمین کا مالک تسلیم کیا گیا وہاں بھی نتائج زیادہ مختلف نہ تھے کیوں کہ مشترکہ ذمہ داری محض برائے نام تھی، شخصی تشخیص کی طرف زیادہ رجحان تھا اور عملی طور پر زمین کے حصے داروں کو الگ الگ مالک تصور کیا جاتا تھا۔ انھیں اپنی زمین بیچنے یا گرو رکھنے کا حق حاصل تھا۔[41] سر جان اسٹریچی نے لکھا: "ہماری حکمتِ عملی زمین کی نجی ملکیت کی حوصلہ افزائی کرنی ہے۔ (اگرچہ) سابقہ حکمراں ایسی ملکیت کو تسلیم نہ کرتے تھے۔"[42]

زمین کی نجی ملکیت کے حق کا نتیجہ مقروضیت ہوا کیوں کہ "جس زمانے میں ایسا حق نہ تھا، نسبتاً کسانوں کی ساکھ بھی نہ تھی جو زمیندار قرض لینا چاہتا تھا وہ قابلِ اعتماد ضمانت پیش نہ کر سکتا تھا۔ اس لیے مقروضیت کم تر تھی۔"[43] اگرچہ زمینیں اکثر گروی رکھی جاتی تھیں لیکن مستقل بے دخلی

اصل چارٹر کی شرائط کے مطابق ایسٹ انڈیا کمپنی حتی الامکان انگلستان کی مصنوعات کے ہندوستان کی پیداوار کے ساتھ تبادلے کی مجاز نہ تھی بلکہ ہندوستان اور یورپ کی مصنوعات اور اشیاء اٹھانے کی پابند تھی۔"۳۲ اس کے برعکس ۱۷۰۰ء اور ۱۷۲۱ء میں برطانوی پارلیمنٹ میں ایسے قانون منظور کیے گئے جن کی رو سے چند مخصوص چیزوں کے سوا انگلستان میں "چھپی ہوئی یا رنگی ہوئی سوتی چھینٹ کا لباس یا فرنیچر میں استعمال اور ایسی چھپی ہوئی رنگین چیز کو جس میں جز واً روئی بھری گئی ہو، کام میں لانا قطعی طور پر ممنوع قرار دیا گیا۔"۳۳ ہندوستان، ایران اور چین کا "پختہ ریشم یا چھپی ہوئی یا رنگین چھینٹوں کا پہننا تعزیری جرم تھا اور دو سو پونڈ تک جرمانے کی سزا تھی۔"۳۴ "اگر ہندوستان آزاد ہوتا تو وہ انتقام لیتا۔ برطانوی مال پر امتناعی محصول لگاتا اور اس طرح اپنی صنعت وحرفت کو محفوظ کرتا لیکن اسے مدافعت کی اجازت نہ تھی۔ وہ ایک بدیشی حکمراں کے رحم وکرم پر تھا۔ برطانوی مال اُس پر ٹھونسا گیا جس پر کوئی محصول نہ تھا۔ غیر ملکی کارخانے دار نے سیاسی ناانصافی کے بل بوتے پر پہلے اپنے ہندوستانی حریف کو دبایا اور بالآخر اس کا گلا گھونٹ دیا جس کا وہ مساوی طور پر مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔"۳۵ یہ اُس وقت کے واقعات ہیں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی علاقائی توسیع اور الحاق کی پالیسی کی وجہ سے ہندوستانی مصنوعات کی مانگ کے بڑے ذرائع یعنی دیسی حکمرانوں کے دربار ہندوستان کے نقشے سے محو ہو رہے تھے۔ زوال کا یہ عمل غیر ملکی حکومت کے قیام سے شروع ہوا۔ غیر ملکی اقتدار کے اثر سے تیز ہوا اور غیر ملکی مال کی درآمد کے مقابلے سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

انگلستان کے صنعتی انقلاب نے ہندوستان کے ساتھ اس کے تعلقات کی نوعیت کو یکسر بدل دیا۔ برطانوی مصنوعات نے ترقی کر کے پہلے ہندوستان کی صنعت پر جو ابتدائی حالت میں تھی، غلبہ پایا اور آخر کار اُسے تباہ کر دیا۔ اس سے ملک خام مال کی منڈی بن کے رہ گیا۔ ہندوستان برطانوی مال کی کھپت کے لیے سب سے بڑی مارکیٹ بن گیا۔ اُجڑے ہوئے صنعت کاروں اور کاری گروں کی حالت خستہ ہو گئی۔ لارڈ ولیم بنٹنگ نے کمپنی کے ڈائرکٹروں کی کورٹ کو لکھا کہ "تجارت کی تاریخ میں اس پریشان حالی کی کہیں نظیر نہیں ملتی۔ سوتی کپڑا بننے والے جولاہوں کی ہڈیاں سرزمین ہند پر دھوپ میں سڑ رہی ہیں۔"۳۶ ڈھاکہ کے لوگوں کی آبادی — جو نفیس ململ پیدا کرنے میں شہرۂ آفاق تھے — ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۷ء کے دوران میں ایک لاکھ ۵۰ ہزار سے گھٹ کر صرف بیس ہزار رہ گئی۔"۳۷

زمین پر حق ملکیت عطا کیا جائے لیکن محض لگان وصول کرنے والے کارندوں کی حیثیت سے نہیں (جیسا کہ وہ ہمیشہ رہے ہیں) بلکہ اسی معنی میں جس میں انگلستان کے زمیندار ہیں۔ جو منصوبہ پیش کیا گیا ہے اس کا تخمینہ کچھ اس طرح لگایا گیا ہے کہ کمپنی کی آمدنی نہ صرف محفوظ رہے گی بلکہ بڑھ بھی جائے گی۔" ۵۱

امیدوں کے جو شگوفے لارڈ کارنوالس نے کھلائے تھے، جلد مرجھا گئے۔ کورٹ آف ڈائرکٹرس نے بلا کسی غل غپاڑہ کے بندوبستِ دوامی کی تجویز منظور کر لی اور ۱۷۹۳ء میں بنگال میں مالیہ سے متعلق بندوبست دوامی کا اعلان کر دیا گیا۔ سر رچرڈ ٹیمپل کے قول کے مطابق بندوبست دوامی ایک ایسا "اقدام تھا جو انگلستان کی زمینداری کی روایات کو بنگال کے باشندوں میں مروج کرنے کی غرض سے کیا گیا تھا۔" ۵۲ لیکن جیسا کہ لارڈ منٹکاف نے کہا ہے "اس اقدام سے مزارعین کے قدیم حقوق واقعی غصب ہو گئے جب ہم نے حق ملکیت ان لوگوں کو دے دیا جن کا زمین پر کوئی دعویٰ نہ تھا۔" ۵۳

بندوبست دوامی کے تحت بھی "ایکٹ اول ۱۸۴۵ء کی دفعات کے تحت عدم ادائیگی مالیہ کی صورت میں جائدادیں قابلِ فروخت تھیں۔" ۵۴ ہومز "ہسٹری آف انڈین میوٹنی" (تاریخ بغاوت ہند) میں رقمطراز ہیں: "کارنوالس کے اقدام کا نتیجہ یہ تھا کہ اس سے ادنیٰ مزارعین کو کوئی فیض نہ پہنچا۔ زمیندار بار بار مالیہ ادا کرنے میں ناکام رہے اور ان کی زمینیں سرکار کے فائدے کے لیے بیچ دی گئیں۔" ۵۵ کلکٹر مدناپور نے ۱۸۰۲ء میں اس رائے کا اظہار کیا کہ "فروخت اور قرقی کے اس طریقے" کے نفاذ سے چند ہی سالوں کے اندر بنگال کے بڑے بڑے زمیندار "خستہ حال گداگر بن کر رہ گئے۔ اندرونی ضابطوں کے زیرِ اثر بنگال کی جائداد آراضی میں جو تبدیلی پیدا ہوئی اس سے زیادہ تبدیلی اتنی مدت میں شاید کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی ملک میں رونما نہیں ہوئی۔" ۵۶

بنگال کے بندوبست دوامی کا ایک اور نتیجہ زمین کے حقوق کی تقسیم در تقسیم تھا۔ زمیندار اپنے حقوقِ آراضی دلالوں کو پٹے پر دے دیتے تھے اور پھر دلال بھی انھیں آگے اجارہ پر دے دیتے۔ اس سے اصلی کاشتکار اور سرکار کے مابین لگان وصول کرنے والوں اور ادا کرنے والوں کا ایک طویل سلسلہ قائم ہو گیا۔ ۱۸۱۹ء میں کاشتکاروں کے مطلقاً زمینداروں کے رحم پر پڑ جانے کا "افسوس کے ساتھ اعتراف کیا گیا لیکن پھر بھی کاشتکار کی حفاظت کے لیے کوئی اقدامات نہ کیے گئے۔" ۵۷ پس ایک طرف جاگیرداری اور دوسری طرف کمپنی کی غلامی بنگال کے بندوبست

کبھی عمل میں نہ آتی تھی۔ کسی بھی آدمی کو سرکار یا کسی فرد کے قرض کے عوض اس کی موروثی زمین سے محروم نہ کیا جا سکتا تھا۔

کمپنی کے قانون کے تحت سارا گاؤں، زمیندار سے کمین تک، اکثر مقروض رہتا اور تمام قرض خواہوں میں بنیا سب سے زیادہ بے رحم تھا۔[۴۴] اور اس کے برعکس توقع بھی نہ ہو سکتی تھی۔ کمپنی کا قانون نہ صرف اس کی پشت پناہی کرتا تھا بلکہ مقروض کی زمین بھی قرض کی ضمانت کے طور اس کے حق میں رہن ہوتی تھی بہ قول مارک تھارن ہل "یہ تسلیم کرنا افسوس ناک ہے کہ نئے ضابطۂ قانون کے تحت عدالتی چارہ جوئی کے وبال، فیصلے کی تاخیر اور مقدمہ بازی کے کثیر مصارف کے سبب بنیے کو اپنے مطالبات میں جعل سازی کا موقع مل جاتا۔ قانون کی آڑ میں اُسے اس قدر سہولتیں میسر تھیں کہ جعلی دستاویز اور جھوٹے گواہ اس کی کامیابی کی ایسی ہی پونجی تھے جیسے کہ اس کے بہی کھاتے اور اشیائے تجارت"۔[۴۵] اس کے علاوہ بنیا اب جابرانہ وطیرہ بھی اختیار کر سکتا تھا۔ قدیم طرز حکومت کے برعکس اب قرض کی جبری وصولی میں بنیے کو کسی سخت انتقام کا خطرہ بھی درپیش نہ تھا۔ ضابطۂ قانون میں اس تبدیلی کا یہ اثر ہوا کہ جتنی آراضی کا انتقال ایک پشت میں مختلف مالکوں کے ہاتھوں ہوا، کبھی دیکھنے سننے میں نہیں آیا۔ پرانے زمینداروں کی جگہ نئے مالکوں نے لے لی جن میں بیشتر بنیے تھے۔[۴۶] کے کا دعویٰ ہے کہ نیلام میں زمین کے یہ خریدار زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے۔[۴۷] اُن کا مقصد صرف یہ تھا کہ روپیہ لگا کر نفع کمایا جائے۔ جبکہ قدیم مالکانِ آراضی زمین کے ساتھ طبعی وابستگی رکھتے تھے۔ اُن کو زمین کے ساتھ بے لوث الفت تھی اور اس بات کی مطلق پروا نہ تھی کہ اس سے انھیں کس قدر آمدنی ہوتی ہے۔[۴۸]

کمپنی کے ڈائرکٹروں کی نگاہ میں بھی زمین کی حیثیت مالِ تجارت سے زیادہ نہ تھی۔ ۱۷۷۶ء میں جب زمیندار حسب معاہدہ سرکار کو مالیہ ادا کرنے میں ناکام رہے تو ان کی زمین فروخت کر دینے کا حکم صادر کر دیا گیا۔[۴۹] کے لکھتا ہے: "نئے نظام کے تحت وہ لوگ جو اتنے وسیع قطعاتِ آراضی کے مالک تھے کہ جہاں تک نظر جاتی تھی انہی کی زمین تھی، مٹی کی جھونپڑیوں میں مزارع بن کر سمٹ گئے اور اُن کی جائداد کھانا پکانے کے چند برتنوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔"[۵۰]

لیکن نئے نظام میں کچھ اپنے مخصوص نقائص تھے۔ کمپنی کو اپنی نوآبادیوں کی آمدنی پہ پورا پورا اعتماد نہ تھا۔ اس غیر یقینی حالت پر قابو پانے کے لیے لارڈ کارنوالس نے ۲ اگست ۱۷۸۹ء کو کورٹ آف ڈائرکٹرس کی خدمت میں لکھا کہ "بہبودیِ عامہ کے [illegible] ضروری ہے کہ زمینداروں کو

کاشت کے روح فرسا کام کو اپنے لیے نہیں بلکہ اُن کے لیے از سرِ نو شروع کرے۔" ۵۹

ڈاکٹر فرانسس بکانن نے ۱۸۰۰ء اور ۱۸۱۴ء کے درمیان کمپنی کی طرف سے "اعداد و شمار" مرتب کیے اور رپورٹ پیش کی کہ "ہندوستانیوں کا کہنا ہے کہ جو کچھ ہم اب ادا کر رہے ہیں دراصل اس کا نصف بھی مغل افسروں کو ادا نہ کرتے تھے۔" ۶۰ بشپ ہیبر نے ۱۸۴۰ء میں اپنی سوانح حیات میں یہ خیال ظاہر کیا کہ کمپنی کے تحت علاقوں میں کسان "مجموعی طور پر والیانِ ریاست کی رعایا کی نسبت زیادہ خستہ حال، زیادہ مفلس اور زیادہ بد دل ہیں"۔ بشپ نے دعویٰ کیا کہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی دیسی حکمراں اس قدر مالیہ کا تقاضا نہیں کرتا جس قدر ہم کرتے ہیں۔" ۶۱

کمپنی نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی لوٹ کھسوٹ سے اتنی دولت حاصل کی کہ اسے اپنے علاقے کی توسیع کی ترغیب ہوئی۔ پلاسی کی جنگ اور بغاوتِ عظیم کے درمیان کمپنی کی فوجوں نے بیس لڑائیاں لڑیں۔ ایک سو سال میں میسور، مہاراشٹر، کرناٹک، تنجور، بندیلکھنڈ، روہیلکھنڈ، ہریانہ، پنجاب (جس میں تقسیم سے پہلے شمال مغربی سرحدی صوبہ بھی شامل تھا) اور اودھ کمپنی کی قلم رو میں شامل کر دیے گئے۔ تمام سابقہ دیسی ریاستیں کشمیر سے لے کر کوچین تک کمپنی کے "زیرِ سایہ" آگئیں۔ جس چیز کا کمپنی کے سپاہیوں پر سب سے زیادہ اثر پڑا وہ ۱۸۵۶ء میں لارڈ ڈلہوزی کا الحاقِ اودھ تھا جو "کمپنی کی فوج کے پچھتر فی صدی سپاہیوں کا وطن تھا۔" ۶۲ (درحقیقت اٹھارویں صدی کے وسط سے ہی کمپنی نے اودھ کی حکومت میں دو عملی رائج کر رکھی تھی) ۶۳ لفٹیننٹ جرنیل میکلوڈ انس نے اپنی بلند پایہ تصنیف "فوجی بغاوت" ۶۴ (THE SEPOY REVOLT) میں لکھا ہے: "جو چند مسلم حکمراں خاندان با اقتدار باقی رہ گئے تھے اُن میں سے جب ایک اور کو اختیاراتِ حکومت سے محروم کر دیا گیا تو نہ صرف اودھ کے بلکہ سارے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔"

شہر کے چھ سات ہزار باشندے جن کا مدار سابقہ دربار کی ادباشی پر تھا اور تاجر جو اس دربار کے لیے سامانِ عیش و عشرت کا اہتمام کرتے تھے، بے روزگار ہو گئے۔ ۶۵ اس کے علاوہ اور ہزاروں لوگ جن کا کام صرف دربار کی شرمناک رنگ رلیوں کا سامان کرنا تھا، بیکار ہو گئے۔ ۶۶ ملبوساتِ فاخرہ، نفیس پگڑیاں، اعلیٰ درجے کے آرائشی جوتے اور ان سے وابستہ کئی دوسرے ادنیٰ دھندے کرنے والوں کو سخت نقصان پہنچا جب ان کی مصنوعات کی مانگ ختم ہو گئی۔ ۶۷ دربار کی سرپرستی کے خاتمے کے اثرات کو ایل۔ ای۔ روٹز یز نے وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے: "ہزاروں امراء،

آراضی کی بڑی خصوصیتیں ہوگئیں۔ تھارن ہل نے اس نئے تعلق کا یوں جائزہ لیا "پرانے زمیندار گاؤں کے رہنے والے ہوتے تھے اور کاشتکار اُن کی اپنی ذات کے آدمی بلکہ اکثر اُن کے رشتہ دار ہوتے تھے۔ وہ زمین کے ساتھ فطری وابستگی رکھتے تھے بلالحاظ اس بات کے کہ انھیں اس سے کس قدر آمدنی ہوتی ہے۔ نئے مالکوں کا جذبہ مختلف تھا۔ انھیں زمین کی مطلق پروا نہ تھی۔ ان کا مقصد صرف روپیہ لگا کر نفع حاصل کرنا تھا۔"۵۸

سر تھامس منرو کے رعیت داری بندوبست آراضی سے بھی کچھ مختلف نتائج برآمد نہ ہوئے یہ بھی زمینداری سسٹم کی طرح ہندوستانی روایات سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگیا۔ مدراس کے ریونیو بورڈ نے ۵ر جنوری ۱۸۱۸ء کو لکھا: "ہم دیکھتے ہیں کہ غیر ملکی فاتحین کی ایک چھوٹی سی ٹولی ہے جو نئے مفتوحہ ممالک کے وسائل اور ان کے حقوقِ ملکیت آراضی کی صحیح کیفیت سے ناواقف ہے، جوں ہی یہ فاتحین ایک وسیع علاقے پر قبضہ کرتے ہیں جس میں مختلف زبانیں، رسم و رواج اور عادات رکھنے والی مختلف قومیں آباد ہیں، وہ ہفت خوانِ رستم کا سا کارنامہ انجام دینے کی کوشش کرتے ہیں یعنی وہ زمین کا مالیہ مقرر کرنا چاہتے ہیں ہر صوبے، ضلع یا ملک کا نہیں اور نہ ہی ہر جائداد اور جاگیر کا بلکہ اپنے تحت علاقوں کے اندر ہر الگ الگ کھیت کا۔ یہ ایسا کام ہے جو یورپ کے مہذب ترین ملکوں میں بھی شیخ چلّی کا منصوبہ تصور ہوگا جہاں ہر قسم کے اعداد و شمار دستیاب ہیں اور جہاں حکومت اور رعایا میں یک جہتی پائی جاتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس نام نہاد اصلاح کی غرض سے وہ بلا ارادہ ان قدیم ایلیوں اور روایتوں کو مٹا رہے ہیں جو ہندو گرام پنچایتوں کے اتحاد کا موجب تھے اور ایک قسم کے زرعی قانون کے ذریعہ ان زمینوں کی از سرِ نو تشخیص کرکے ان کے ٹکڑے کر رہے ہیں جو صدیوں سے گرام پنچایت کی مشترکہ ملکیت تھیں۔ وہ ہر کھیت پر مالیہ کے مطالبہ کا حق جتاتے ہیں لیکن دراصل اُن پر پابندیاں عاید کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کا تقاضہ کرتے ہیں جو حاصل نہ ہو۔ رعیت پر اپنی مرضی سے لگان کی تشخیص کرتے ہیں اور سابقہ مسلم حکومت کی طرح کاشتکار سے جبراً ہل چلواتے ہیں اور اُس زمین کی کاشت پر مجبور کرتے ہیں جس پر حد سے زیادہ لگان عائد کیا گیا ہے۔ اگر کاشتکار فرار ہو جاتا ہے تو اسے گھسیٹ کر واپس لے آتے ہیں اور فصل پکنے تک لگان کا تقاضہ ملتوی کر دیتے ہیں۔ پھر فصل تیار ہوتے ہی اس سے زیادہ سے زیادہ وصول کر لیتے ہیں اور کسان کے پاس سوائے بیلوں اور بیج کے کچھ نہیں چھوڑتے بلکہ یہ بھی فراہم کر کے اس پر احسان دھرتے ہیں تاکہ وہ

اعلیٰ طبقوں کی حد درجہ نااہلیت کمپنی کی نگاہ میں ایک مسلّمہ حقیقت تھی۔ کمپنی کے ملازموں کو یقین ہوگیا کہ اودھ کے لوگوں کو جس چیز سے سب سے زیادہ فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ زمیندار امیروں کے طبقے کا خاتمہ تھا۔[۷۸] اس مقصد کے پیشِ نظر زمینداروں کے حقوق اور دستاویزات کی جانچ پڑتال کے لیے انعام کمیشن مقرر کیا گیا۔ بغاوت سے پہلے پانچ سالوں میں پینتیس ہزار جاگیروں میں سے اکیس ہزار کو ضبط کرلیا گیا۔[۷۹]

بی۔ جی۔ اسٹیئن کر نے گورنر جنرل کے نام اپنی عرض داشت میں انعام کمیشن کے کام کو بھیڑ مونڈنے سے مشابہ کیا ہے۔ اس نے لکھا: "ہر روز مظلوم زمینداروں کی فہرست تیار کی جاتی جو بچ جاتے ان کی خوش بختی سے زمینداروں کے اس گروہ کا درد و کرب اور بھی بڑھ جاتا جو بھیڑ خانوں سے اپنا بال بال منڈواکر باہر نکلتے اور کسی کام کے نہ رہتے، جنھیں بھیک مانگتے شرم آتی اور جو کوڑی کوڑی کو محتاج ہوجاتے۔"[۸۰] تھارن ہل نے کمیشن کے فیصلوں کو "خبطی کے احکام"[۸۱] قرار دیا۔

چنانچہ وہ خاندان جو سالوں موروثی جاگیروں پر قابض رہے اور جنھیں اپنے حق ملکیت کے سلب ہوجانے کا کبھی سان گمان بھی نہ تھا، اپنی جاگیر سے محروم ہوگئے۔ کے نے فرمایا: "اس طرح آہستہ آہستہ انگریزی قانون کے اطلاق کے وسیلے سے ایک انقلاب بپا ہوا جس نے اتفاقاً دوسرے اسباب کے ساتھ اُن بددل اور خطرناک طبقات کی تعداد میں اضافہ کیا جو اپنے زوال کو برطانوی حکومت کی کارروائیوں سے منسوب کرتے تھے۔ وہ کسی نئے انقلابی دور میں اپنے کھوئے ہوئے مقبوضات کو ازسرِنو حاصل کرنے کے لیے موقعہ کے انتظار میں تھے۔"[۸۲]

اس سے زمین کی کاشت کرنے والے کو کوئی فائدہ نہ پہنچا جیساکہ کمپنی نے دعویٰ کیا تھا۔ کمپنی کے ملازمین کورٹ آف ڈائرکٹرس کی خدمت میں ایک کثیر رقم کا حاصل باقی پیش کرنے کے لیے فکرمند تھے تاکہ یہ ثابت کریں کہ نئے استحصالات نفع بخش ہیں۔ اس لیے انھوں نے میزان مالیہ کو بڑھانے کی غرض سے لگان کی شرح بڑھادی۔[۸۳] گبنس ناچار اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ کئی ضلعوں میں سرکار کے تقاضے کا دباؤ "حد سے زیادہ"[۸۴] تھا۔ تھارن ہل لگان آراضی کے تعین کو "ظالمانہ"[۸۵] قرار دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "ہمارے لگان آراضی کی تشخیص بلاشبہ بہت زیادہ تھی۔ زمین کی فروخت کے ذریعے جبری وصولیوں نے اس کی سختی میں اور بھی اضافہ کیا۔ ہمارے قانون نے سراسر بنیوں کی جبر ستانیوں میں مدد کرکے ان کے حرص کا کلنک حکومت کے ماتھے پر لگا دیا۔ سرسید احمد خاں، جن پر

شرفاء اور حکام جو بادشاہ کے عہد میں نفع بخش عہدوں پر فائز تھے اور اس قدر کاہل تھے کہ کام سے جی چراتے تھے، اب مفلسی اور تنگ دستی کا شکار ہو گئے۔ اور اُن کے ہزاروں نوکر چاکر اور ملازم روزگار کھو بیٹھے۔ پھر بے شمار آوارہ گرد، من چلے، شہدے اور گداگر جن کی دیسی حکومت کے تحت شہر میں کثرت تھی اور جنھیں اس میں روزی ملتی تھی، ہمارے عہدِ حکومت میں بھوکوں مرنے لگے۔ جب واجد علی تخت پر رونق افروز تھے ہندوستانی سوداگر، دوکاندار اور ساہوکار، بادشاہ اس کے درباریوں اور بھرے حرم کی دولت مند بیگمات کے لیے عیش و عشرت کے سامان فراہم کرکے بڑے بڑے منافع کماتے تھے۔ اب ان کے مال کا کوئی خریدار نہ رہا۔ لوگ بالعموم اور غریب بالخصوص بیزار تھے کیوں کہ ان پر بلاواسطہ اور بالواسطہ ہر طرح سے ٹیکس لگائے جاتے تھے۔[۶۸]

جس طبقے نے شاید سب سے زیادہ خسارہ اٹھایا وہ تعلقہ داروں کا تھا۔[۶۹] نواب وزیر اودھ کی کمزور حکومت کے تحت انھوں نے اس کی پروا کیے بغیر اختیارات کا استعمال کیا تھا۔ "سنگین کی نوک"[۷۰] پر جبراً مالیہ وصول کیا تھا اور ملک کو ناپائداری کی حالت میں مبتلا کیے رکھا جس سے جان و مال اور صنعت و حرفت غیر محفوظ ہو گئے تھے۔[۷۱] بقول سر ڈبلیو۔ ایچ۔ سلیمن "جب وہ ایک دوسرے کے ساتھ یا دیسی سرکار کے مقامی حکام کے ساتھ کسی سبب سے لڑتے جھگڑتے ہیں تو اندھا دھند قتل و غارت کا بازار گرم کر دیتے ہیں۔۔۔ ان تمام زمینوں پر جہاں ایک ہی طبقہ کے آدمیوں کا قبضہ نہیں ہوتا۔۔۔ کوئی سڑک، قصبہ، گاؤں یا بستی اُن کے ظالمانہ حملوں سے محفوظ نہیں۔۔۔ قتل و غارت اُن کے لیے تفریحِ طبع کا سامان یا کھیل تماشا ہو جاتا ہے۔ وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو یوں بلا دریغ موت کے گھاٹ اتارتے ہیں گویا وہ ہرن یا جنگلی سؤر ہیں"[۷۲] بلکہ جہاں تعلقہ داروں کا بھی ہاتھ نہ تھا، سیکڑوں گاؤں حریص اور لالچی حکام کی جبری وصولیوں سے تباہ و برباد ہو گئے تھے۔[۷۳] تباہ حال اور مریل مویشی جو فرسودہ آلاتِ زراعت کھینچنے کے قابل نہیں تھے، غلیظ اور غیر آباد دیہات، برباد اور بیکار کنوئیں اور ننگے اور فاقہ زدہ کسان خستہ حالی کے واضح ثبوت تھے۔[۷۴] ایم۔ آر۔ گبنس جوڈیشنل کمشنر اودھ نے عین بغاوت سے پہلے اور اس کے دوران یہ کہا کہ "میں نے عام افلاس کے ایسے منظر کبھی نہیں دیکھے جیسے کہ اودھ میں"[۷۶]
الحاق سے پہلے کے زمانے میں اودھ کے کسانوں کی حالت کے بارے میں کے نے فرمایا: "بدنظمی کی ایسی ہولناک خرابیاں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھیں۔ کبھی کسی کاہل اور جابر حکومت کے نقائص اس سے زیادہ مصائب کا موجب نہیں ہوئے تھے۔"[۷۷]

لگ بھگ ہر کسان کے گھر میں جبری بیروزگاری تھا۔

اس فوجی طبقے کے لیے جسے اب تک خاص حقوق حاصل تھے، اودھ کا الحاق ایک اور سبب سے بھی نقصان دہ ثابت ہوا: "فوجی کا مکان اور پنشن خوار کا قطعہ باغ بھی اب ٹیکس سے مستثنیٰ نہ رہے۔"۹۴

یہی وجہ ہے کہ سنِ الحاق اور سنِ غدر کے دوران اس صوبے کے رہنے والے پچھتر ہزار سپاہیوں سے چودہ ہزار درخواستیں لگان کی سختیوں کے خلاف وصول ہوئیں۔"۹۵ ان سپاہیوں میں پچیس ہزار برہمن تھے۔ جب خیراتی اداروں سے ملحق زمینیں ضبط کر لی گئیں تو ان برہمنوں کو دوگونہ چوٹ لگی۔ اس سہل آمدنی کے چھن جانے سے پروہت طبقہ کے افراد نے اپنی تمام تر قوت اور اپنے اثر کو اپنے معتقدین میں بے اطمینانی پیدا کرنے اور ان کے دلوں میں مذہبی خوف پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔"۹۶

اودھ کے الحاق سے جو حالات پیدا ہوئے ان کو مالیسن نے خوب اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ الحاقِ اودھ سے دیسی ریاستوں کے حکمراں منحرف ہوگئے۔ انھوں نے اس اقدام میں اقتدار کی ایسی ہوس دیکھی جس کی تسکین نہ تو کامل وفاداری کے اظہار سے ہو سکتی تھی اور نہ ہی اس اہلِ اقتدار کو قرض پر پیشگی رقوم دینے سے۔ اس سے علاقائی امرار کے طبقے نے بھی منہ موڑ لیا کیوں کہ نئے مروجہ برطانوی نظام کی رو سے انھوں نے اپنے آپ کو اچانک اپنی جائدادوں کے نصف بلکہ بعض اوقات اس سے بھی زیادہ حصّے سے محروم پایا۔ اس سے مسلمان طبقۂ امرار بھی خلاف ہوگیا یعنی درباری جن کی آمدنی کا مدار اس منصب اور وظیفہ پر تھا جو وہ والیِ ریاست کی عنایت سے پاتے تھے۔ اس سے ان فوجیوں کا طبقہ بھی بگڑ گیا جو بادشاہ کے ملازم تھے اور جنھیں بے دردی کے ساتھ کنبے کے قلیل وظائف یا انعامات پر پھینک دیا گیا۔ اس سے وہ سپاہی بھی بدظن ہوگئے جو برطانوی حکومت نے اودھ میں بھرتی کیے ـــ جب تک ان کا ملک آزاد رہا انھیں خاص حقوق حاصل تھے اور وہ برطانوی ریزیڈنٹ کے ذریعہ پیش کی گئی درخواستوں سے دربارِ لکھنؤ پر اثرانداز ہو سکتے تھے اور اس طرح وہ یقینی طور پر اپنے کنبوں کو جبر و استبداد سے محفوظ رکھ سکتے تھے۔ اس سے ملک کے کسان اور شہروں کے چھوٹے چھوٹے صنعت کار دونوں ہی ناخوش تھے۔ پرانا نظام اگرچہ جابر اور تاناشاہی تھا تاہم انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کی جگہ ایک ایسا نظام لے لے جس کا پہلا اصول بنیادی ضرورت کی چیزوں پر ٹیکس لگانا تھا۔ غرضیکہ اودھ کے الحاق نے ایک ملک کو جس کے باشندے برطانیہ کے

انگریزوں کا مخالف ہونے کا الزام نہیں دھرا جا سکتا، اپنے "رسالۂ اسباب بغاوت ہند" میں فرماتے ہیں: "انگریزی حکومت نے لگان آراضی کے تقرر کا جو طریقہ نافذ کیا ہے وہ بلا شبہ قابلِ تعریف ہے لیکن سابقہ لگانوں کی نسبت شرح لگان زیادہ ہے۔ غیر متوقع مصارف کا لحاظ رکھے بغیر انگریزی سرکار نے لگان آراضی کی تشخیص کی ہے۔ بنجر زمین پر بھی اسی حساب سے مالیہ لگایا جاتا ہے جس سے قابلِ کاشت زمین پر۔ مالیہ کی ادائیگی کے لیے کاشتکار قرض لینے پر مجبور ہیں۔ ان قرضوں پر شرح سود بہت زیادہ ہوتی ہے۔"[۸۶]

بہت سی جاگیروں کو ہر سال عدالتی ڈگری کے تحت اُن قرضوں کے عوض نیلام کر دیا جاتا تھا جو بعض اوقات چند روپوں کی رقم سے زیادہ نہ ہوتے تھے۔ اُن کو نچلے طبقوں کے نئے لوگ خرید لیتے تھے۔ سابقہ مالک جو اب بھی زمین کے ساتھ وابستہ تھے، اپنی ہی آبائی زمینوں پر چھوٹے کسان اور ادنیٰ اسامی بن کر رہ جاتے۔ بقول سر سید احمد خاں برطانوی حکومت کے ابتدائی ایام میں جائداد کی بار بار فروخت کا اثر یہ ہوا کہ ہندوستانی معاشرہ تہ و بالا ہونے لگا۔[۸۷]

عدالتی اور ریونیو اسٹامپ کے اجراء سے جو ہندوستانی رواج اور روایت کی سپرٹ کے خلاف تھا لوگوں پر اور بھی زیادہ بوجھ پڑا جب کہ وہ پہلے ہی کنگال ہو چکے تھے۔ اس سے دادرسی میں بھی بڑی رکاوٹ پڑتی تھی۔[۸۸] اس پر طرہ یہ کہ افیون پر ایک بھاری محصول لگا دیا گیا۔ اس سے غریب طبقے کی بے اطمینانی کی سلگتی آگ بھڑک اٹھی۔[۸۹] چنانچہ اب "عرائض پر، خوراک پر، مکانات پر، کھانے کی چیزوں پر اور کشتیوں کے گھاٹ پر بھی ٹیکس تھا۔ ایک افیون کا ٹھیکہ دار تھا تو دوسرا غلے اور اشیائے خورونوش کی بہم رسانی کا، ایک اور نمک اور شراب کا ٹھیکیدار تھا۔ درحقیقت ہر اس چیز کا ٹھیکہ دیا جاتا تھا جو پیرس میں چنگی کے تحت آتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کھانے کی ہر چیز بہت گراں ہو گئی۔ ٹھیکہ دار خوب دولت کما رہے تھے اور عوام ان کے استحصال کے شکار تھے۔"[۹۰]

سابق بادشاہ کی فوج ختم ہو جانے کی وجہ سے سبکدوش فوجیوں کی تعداد، ریزیڈنٹ لو کے تخمینے[۹۱] کے مطابق ستر ہزار تک پہنچ گئی تھی جس کی وجہ سے اودھ میں گنڈوں، شہدوں کا ایک لشکر پیدا ہو گیا تھا۔ بقول لفٹیننٹ نیل انس "ایک سپاہی کو موقوف کرنا گویا ایک لٹیرا پیدا کرنا تھا۔"[۹۲] اودھ میں کوئی ایسا کنبہ نہ تھا جس کا کم از کم ایک فرد فوج میں ملازم نہ ہو۔ ملازمت سے سبکدوش کیے گئے جن فوجیوں کو اودھ کی نئی بے ضابطہ فوج اور فوجی پولیس میں کوئی جگہ نہ ملی انھوں نے سارے علاقے میں اودھم مچا دیا۔[۹۳] فوجی خدمت سے سبکدوشی کا نتیجہ اودھ کے

تھے۔ درحقیقت اُن میں سے بہت سے ایک آنے اور ڈیڑھ آنے فی یوم کی حقیر اجرت پر باغیوں کے ملازم ہوگئے اور بہت سے ایسے تھے جنھوں نے بجائے نقدی کے ڈیڑھ دو سیر اناج یومیہ قبول کیا۔[۱۰۲]

اِدھر "مذہبی اوقاف کی ضبطی نے قدیم مسلمان خاندانوں پر ناگوار اثر ڈالا اور انھیں مشتعل کر کے بغاوت پر آمادہ کیا"۔[۱۰۳] اُدھر جدید طریقۂ تعلیم سے جس میں انگریزی زبان، مغربی ادب اور سائنس کو فوقیت حاصل تھی، روشن خیال مسلم طبقہ کی وقعت خاک میں مل گئی۔ کے اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ "ہمارے تعلیمی اقدامات اور ہمہ گیر انگریزیت جس سے ملک کو خطرہ درپیش تھا، شانِ مسلمانی کو گھٹانے اور اُس متعصب دین کے بہت سے بارسوخ لوگوں کو ان کی آمدنی سے محروم کرنے کا موجب ہوئے"۔[۱۰۴] عدالتوں میں فارسی زبان کے ترک سے اور سرکاری ملازمت میں امتحان کی بنا پر بھرتی سے مسلمانوں کے لیے سرکاری نوکری کے مواقع اگر یکسر مٹے نہیں تو کمتر ضرور ہو گئے۔[۱۰۵]

کو نے صورتِ حالات کو جس جامع طور سے بیان کیا ہے وہ کسی قدر طویل ہونے کے باوجود نقل کیے جانے کے قابل ہے: "یہ صاف ظاہر ہے کہ اس ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے بجائے اسی حالت میں چھوڑ دیا گیا جس میں وہ ہزار سال قبل تھے اور انھیں روبہ زوال رہنے دیا گیا۔ جو فنون اور مصنوعات تمام مغربی دنیا میں ہندوستان کا نام بلند کرتے تھے اور باعثِ حیرت تھے آج اُن کا نام و نشان بھی نہیں رہا۔ جو شہر کبھی شہرت و عظمت [illegible] تھے اب محض کھنڈرات کے ڈھیر ہیں جن میں لکڑ بھگے اور گیدڑ رہتے ہیں۔ اس [illegible] بڑی بڑی درس گاہیں نیست و نابود ہو چکی ہیں مشرق کے داناؤں کا وجود صرف ماضی کی داستانوں اور تاریخوں میں رہ گیا ہے۔ اس کے مندر اور اجنتا اور الورا کے حیرت انگیز غار اور دوسرے مقامات ٹوٹ پھوٹ کر تیزی سے خاک میں مل رہے ہیں اور آہستہ آہستہ اُن کا کوئی نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ اس کے اکثر تالاب خشک ہو چکے ہیں اور [illegible] سرائیں [illegible] ہو چکی ہیں اور جو باقی ہیں وہ بھی تیزی سے برباد ہو رہی ہیں۔ اس کی آبپاشی کی نہریں پٹ چکی ہیں اور بھلائی جا چکی ہیں۔ اس کی آبادبستیاں ویرانے بن چکی ہیں جہاں اب جنگلی جانوروں کا ڈیرہ ہے اور چاروں طرف مہلک ملیریا پھیلا ہوا ہے۔ جا بجا تباہی و بربادی اور مفلسی کے دل سوز منظر ہیں گویا سارے ملک کو کوئی کوڑھی چھو گیا ہے۔ جو کوئی دیکھنے کو آنکھیں اور سننے کو کان رکھتا ہے، بلاشبہ فوراً اعتراف کرے گا کہ ہم نے اس قدر عظیم ملک کے وسائل پر

شالی وفادار تھے بے اطمینانی اور سازش کا اکھاڑہ بنا دیا۔"۹۷

اس کے علاوہ ہندوستانی لوگ اس بات پر بھی کڑھتے تھے کہ انھیں نفع بخش عہدوں اور اسامیوں سے محروم رکھا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمانوں کو اس مشکل کا زیادہ سامنا تھا۔ موخرالذکر عام طور پر ملازمت اختیار نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے آباؤ اجداد کے پیشوں کو اپنا رکھا تھا۔ برہمنوں کے پس پشت روایت تھی اور انھیں ملازمت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ویش تاجر اور ساہوکار تھے۔ کشتری جو کبھی ملک کے حکمران تھے ان میں سے ہر ایک نے چھوٹا سا قطعہ آراضی سنبھال لیا۔ وہ کسی قدر حکومت کی خو بو بھی رکھتے تھے۔ ہندوؤں میں صرف ایک طبقہ تھا یعنی کایستھ جو سرکاری ملازمت سے اپنی روزی کماتے تھے۔۹۸

اس کے برعکس مسلمانوں کا انحصار زیادہ تر سرکاری ملازمت پر تھا۔ کمپنی کی حکومت سے پہلے مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں وہ ممتاز ترین عہدوں پر فائز تھے اور اب بھی وہ اسی قسم کی اسامیوں کی توقع رکھتے تھے لیکن کمپنی کی حکومت کے تحت اُنھیں اُن عہدوں سے محروم رکھا گیا جن اسامیوں تک ان کی رسائی تھی مثلاً کمپنی کی فوج میں سپاہی کی حیثیت، ان کو وہ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس حقارت کا سبب سادہ سا تھا۔ اپنی قومی حکومت کے تحت وہ اعلیٰ شہری اور فوجی عہدوں پر مامور رہ چکے تھے اور ان کے مشاہرات کمپنی کے فرنگی ملازموں سے کسی طور کم نہ تھے۔ اُن میں سے بعضوں نے رسالدار کی حیثیت سے ہزار روپیہ ماہوار مشاہرہ پایا تھا۔ اب اُن کے بیٹے صرف اسّی روپے ماہوار تنخواہ پا سکتے تھے اور وہ بھی اگر خوش قسمتی سے رسالدار بن جائیں۔۹۹ دیسی ریاستوں کے خاتمے سے صورتِ حالات بگڑ گئی۔ غالباً یہی بات ڈیوک آف ولنگٹن کے ذہن میں بھی تھی جب اس نے یہ کہا کہ کسی ریاست کے الحاق کا مطلب ہندوستانیوں کو ذلیل کرنا اور انھیں بھکاری بنا کر سراسر دشمن بنانا ہے۔"۱۰۰ سر تھامس منرو نے بھی کہا کہ اس پالیسی نے "تمام قوم کو ذلّت اور پستی کے گڑھے میں گرا دیا ہے۔"۱۰۱

ان عہدوں پر مامور ہونے کے بعد فرنگیوں نے خدّام کا کوئی لاؤ لشکر نہ رکھا اور نہ ہی اُن سے ایسی توقع تھی جیسا کہ سابقہ حکومتوں کے عہد میں ہندوستانیوں نے کیا تھا اور غالباً اب بھی کریں گے اگر ان کو ان اسامیوں پر فائز کر دیا جائے۔ چنانچہ غریب طبقے کے ہندوستانی کسی بھی حالت میں پہلے جیسی ملازمتیں حاصل نہ کر سکتے تھے خواہ کوئی بھی سرکار اُن پر حکمران ہوتی اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنی حالت کو بہتر بنانے کی غرض سے کسی بھی ہنگامے میں شامل ہونے پر آمادہ

کیا تاکہ دوسرے میں کافی کپڑے زیب تن کر سکیں۔[113]

ان حالات میں جب ہندوستانی سپاہیوں کو یہ بتایا گیا کہ سندھ یا پنجاب میں فوجی خدمت بجا لانے کے لیے آئندہ انھیں بیرون ملکی خدمت سے متعلق خاص حقوق (بھتہ) نہیں حاصل ہوں گے تو ان کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اُن کا کہنا تھا کہ سابقہ حقوق سے صرف اس لیے کیوں محروم کردیا جائے کہ برطانوی قلمرو کی سرحد اس علاقے تک بڑھ گئی ہے جو کچھ پہلے غیر ملکی تھا۔ اس فیصلے سے کس طرح مطمئن ہو سکتے تھے جب کہ وہ جانتے تھے کہ وہ علاقے ان کی امداد کے بغیر فتح نہیں کیے جا سکتے تھے۔ وہ آزردہ خاطر تھے کیوں کہ ان کی مالک کمپنی نے ان کی نیک خدمات کا یہ صلہ دیا کہ انھیں اُن کی تنخواہ کے ایک حصے سے محروم کردیا جس کے وہ مستحق تھے۔[114]

ایک اور معاملہ جس سے ہندوستانی سپاہی آگ بگولا ہوئے وہ اُن کے مذہبی عقاید میں کمپنی کی مبینہ مداخلت تھی۔ مثلاً ستی کی رسم کا انسداد، ہندو بیواؤں کی دوسری شادی کی قانونی منظوری اور دختر کشی کی ممانعت۔ یہ اقدام بذات خود اچھے تھے یا برے، ہندوستانی رسوم و روایات کے منافی تھے۔ اس سے ہندوستانیوں کے شبہات میں اضافہ ہوا۔[115] ۱۸۵۰ء میں ایک قانون، پاس کیا گیا جس کی رو سے نو عیسائیوں کو اپنی آبائی میراث پر قابض رہنے کی اجازت دی گئی۔ اس سے ہندوستانیوں میں بڑا خلفشار پیدا ہوا۔ اسی دوران کلکتے سے کمپنی کی حکومت کے تمام بڑے بڑے افسروں کے نام سر ایڈمنڈ کی طرف سے ایک خط نشر کیا گیا۔ خط کا مضمون یہ تھا کہ چونکہ سارا برصغیر ایک عیسائی طاقت کے تحت ہے اس لیے ہندوستانیوں کو عیسائی مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنا جائز ہے۔[116] سر سید احمد خاں لکھتے ہیں: "یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ جب ہندوستانیوں کو اس گشتی چٹھی کا علم ہوا تو خوف سے اُن کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔"[117] یہ افواہ پھیل گئی کہ کمپنی کے ہندوستانی ملازموں کو سب سے پہلے عیسائی بنایا جائے گا اور اس کے بعد عوام کو۔ قیاس یہ تھا کہ خط متعلقہ سرکار کے حکم سے لکھا گیا۔ جب بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے ایڈمنڈ کے خط کے بارے میں سنا تو اس نے ان افواہوں کی تردید جاری کی لیکن اس تردید سے صرف عارضی تسکین ہوئی۔ عام خیال یہ تھا کہ سرکار نے اس منصوبے کو صرف ملتوی کیا ہے اور جوں ہی وہ اپنے آپ کو کافی طاقتور سمجھے گی، اس کی تکمیل پر توجہ دے گی۔[118]

اس میں کوئی شک نہیں کہ کمپنی کی حکومت سرسری طور پر بے اطمینانی کی اس فضا سے باخبر تھی جو اُس وقت طاری تھی۔ حاکم اور محکوم کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا اور نہ باہمی میل جول یا

مطلق توجہ نہیں دی جب کہ ہم نے اس ملک کے گوشے گوشے میں اپنے صنعتی شہروں کی لغویات کے انبار لگا دیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہم نے مشرق کی مفید تجارتی مصنوعات کو تباہ کرنے کی عمداً کوشش کی ہے۔"[106] تو پوچھتا ہے: "اگر ایسی غلط حکمتِ عملی جاری رہی تو اس کوتاہ اندیشی کا کیا انجام ہوگا؟"[107]

ان شدید مصائب کے دور میں طویل کساد بازاری (۱۸۲۵-۵۴ء) نے (جب قیمتیں خاص طور پر تیزی سے گریں) افسوس ناک معاشی، سیاسی اور سماجی حالات پر اور بھی ستم ڈھایا۔[108] ۱۸۵۰ء میں چاندی کی پیداوار دنیا کی مانگ سے بہت کم نکلی۔ اس سے صورتِ حال اور بھی بگڑ گئی۔ ایک تو اس لیے کہ ۱۸۳۵ء کے قانون کی رو سے ہندوستان کے رائج سکے کی بنیاد خالص چاندی پر رکھی گئی تھی، دوسرے اس لیے کہ ہندوستان ابھی تبادلۂ جنس کے رواج سے نقد معاشی نظام کے عبوری دور سے گزر رہا تھا۔[109]

اثر و رسوخ اور اقتدار کی توسیع کے اس نازک مرحلے پر انگریزوں نے افغانستان کی پہلی جنگ (۱۸۳۸-۴۲ء)، جنگ کریمیا (۱۸۵۴-۵۶ء) اور سکھوں کے خلاف دو جنگوں (۱۸۴۵-۴۹ء) میں کئی شکستیں کھائیں۔ اس سے ان کی یہ ساکھ کہ وہ ناقابلِ تسخیر ہیں قریب قریب ختم ہو گئی حالانکہ وہ ان تمام جنگوں میں فتح یاب ہوئے۔ لوگوں پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی کہ انگریز فوق البشر نہیں ہیں اور ان سے مہلک خطائیں سرزد ہو سکتی ہیں ___ ایسی غلطیاں جن سے چالاک حریف فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔[110]

چونکہ یہ اعتقاد لگ بھگ زائل ہو چکا تھا کہ برطانوی فوج ناقابلِ تسخیر ہے اس لیے سپاہیوں کو زعم ہو گیا کہ انگریزوں نے جو بہت سی فتوحات حاصل کی تھیں وہ محض ہندوستانیوں کی شجاعت کا نتیجہ تھیں۔ ان کا یہ اعتقاد تھا اور اُنھوں نے اس اعتقاد کا غیر مبہم الفاظ میں اظہار کیا کہ انگریزوں نے انھیں کے بل بوتے پر ہندوستان کو برما سے کابل تک فتح کیا تھا۔[111] کمپنی کی فوج کی ساخت بھی اس یقین کو تقویت پہنچاتی تھی۔ چالیس ہزار برطانوی فوجیوں کے مقابلے میں ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد تین لاکھ ساٹھ ہزار تھی اور چھ ہزار پانچ سو فرنگی توپچیوں کے مقابلے میں بارہ ہزار ہندوستانی توپچی تھے۔[112]

برطانوی وسائل کے بے انتہا ہونے کا یقین بھی تقریباً زائل ہو چکا تھا۔ کے نے اسے تاکیداً بیان کیا ہے: "جنگ کریمیا کے لیے ہندوستان سے فوجیں منگوانے کی جو تجویز پارلیمنٹ میں پیش کی گئی اس سے ہندوستان کے روشن خیال لوگ حیرت زدہ ہوئے .... اس سے بلند تر آواز میں ہم اپنے وسائل کی کمی کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ سکتے تھے۔ ہم نے اپنے آپ کو دنیا کے ایک گوشے میں ننگا

"ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اگرچہ ہندوستان کا مطلع صاف ہے پھر بھی ایک چھوٹا سا بادل نمودار ہو سکتا ہے جو پہلے بہت حقیر ہو لیکن بڑھتے بڑھتے اتنا بڑھ سکتا ہے کہ ہمیں تباہی کے سیلاب میں غرق کر دے۔"[۱۲۴] لیکن کمپنی کی حکومت نے ان تنبیہوں پر کان نہ دھرا۔

یہ انتہائی بحران کا وقت تھا[۱۲۵] ایک عام معصومانہ حرکت بھی بے خبری کے عالم میں بارود پر چنگاری کا کام کر سکتی تھی۔ عین اسی وقت سرکار نے نئے کارتوس رائج کرنے کا فیصلہ کیا جن پر سپاہیوں کے خیال میں واقعی گائے اور سؤر کی چربی لگی ہوئی تھی[۱۲۶] اور جن کے استعمال سے وہ اپنی ذات اور اپنے دین سے محروم ہو جائیں گے۔ "بس ایک اتفاقیہ چنگاری، مگر آگ لگانے والی آتش گیر مادے پر گر پڑی اور آگ بھڑک اٹھی۔"[۱۲۷] نفرت کی آگ جو پلاسی کے بعد دب گئی تھی اور اس وقت سے سلگ رہی تھی یکبارگی تیزی سے بھڑک اٹھی۔ معزول شدہ بے اطمینان راجاؤں اور رانیوں، زمینداروں اور مزارعوں، صنعت کاروں اور مزدوروں، مسلمان ملاؤں اور عالموں اور ہندو پنڈتوں نے اپنے ارمان نکالنے کے لیے اس موقعے کو غنیمت جانا۔ انگریزوں کو پہلی بار، جب سے وہ ہندوستان میں وارد ہوئے تھے متضاد عناصر کے ایسے زبردست اتحاد کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

۳۔ تنظیم

اب سوال یہ ہے کہ وہ کس قسم کی تنظیم تھی جس نے بغاوت کا اہتمام کیا، اس کے لیے مختلف راہیں نکالیں اور بعد میں اس کی رہنمائی کی۔

ہم باغیوں کی تنظیم کے بارے میں، خاص طور پر بغاوت سے پہلے کے دور سے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ اس کا سبب ظاہر ہے۔ باغی خلاف قانون کام کرتے تھے اس لیے وہ اپنی خفیہ تنظیم کی ساخت، سرگرمیوں اور ماہیت کے بارے میں کوئی دستاویز نہیں رکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بغاوت سے متعلق کتابیں دورہ کرنے والے مولویوں اور فقیروں، پنڈتوں اور سنیاسیوں، رضاکار گداگروں اور مداریوں کی داستانوں سے بھری پڑی ہیں جو جابجا پھرتے تھے اور بغاوت کا پیغام نشر کرتے تھے۔ ایسی کتابوں میں ان سرخ کنول کے پھولوں اور چپاتیوں کی کہانیاں بھی کثرت سے موجود ہیں جو ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں کو پہنچائی جاتی تھیں۔ "A Narrative of the Indian Revolt" (ہندوستانی بغاوت کی داستان) کے مصنف نے کنول کے ایک گشت کو یوں بیان کیا ہے: "ایک آدمی کنول کے پھول کے ساتھ نمودار ہوتا اور اسے رجمنٹ کے افسر کے سپرد کر دیتا۔

ایک دوسرے کی قربت تھی جیسا کہ ان فاتحین کا دستور تھا جو شمال مغرب سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے۔ انگریز حکمرانوں کی نگاہ ہمیشہ ملازمت سے سبکدوش ہونے اور وطن کو لوٹنے پر رہتی۔ وہ شاذونادر ہی ہندوستان میں آباد ہونے کے ارادے سے آتے تھے۔[119]

ہندوستانیوں کو ملک کی حکومت میں کوئی دخل حاصل نہیں تھا۔ اس لیے سرکار نہیں جانتی تھی کہ جو قانون اور ضابطے اس نے پاس کیے ہیں وہ مصلحت پر مبنی ہیں یا نہیں۔ سرکار کو یہ معلوم ہونا چاہیے تھا لیکن کبھی نہ معلوم ہو پاتا کہ ان مسائل سے متعلق لوگوں کی کیا رائے تھی۔ لوگوں کو کسی ناانصافی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے یا اپنی خواہشات کو ظاہر کرنے کا وسیلہ حاصل نہ تھا" لیکن سب سے بڑا فتنہ یہ تھا کہ لوگ سرکار کے خیالات اور مقاصد سے متعلق غلط فہمی کا شکار تھے۔ وہ ہر فعل کو غلط سمجھتے اور جو بھی قانون پاس کیا جاتا لوگوں کی طرف سے اس کی غلط تاویل کی جاتی کیوں کہ اس کی ترتیب میں ان کا ہاتھ نہ ہوتا تھا اور اس کے مفہوم کو سمجھنے سے قاصر تھے۔ آخر کار ہندوستانیوں کو یہ سوچنے کی عادت پڑ گئی کہ تمام قانون اُن کی تذلیل اور تباہی اور انھیں اور ان کے ہموطنوں کو ان کے دین ایمان سے محروم کرنے کی غرض سے پاس کیے جاتے ہیں۔ بالآخر وہ وقت آگیا جب تمام لوگ انگریزی سرکار کو ایک دیر اثر زہر، ریت کی دیوار (جھوٹا سہارا) اور شعلۂ فریب تصور کرنے لگے۔ وہ یہ خیال کرنے لگے کہ اگر آج ہم سرکار کے پنجے سے نجات حاصل کرلیں تو کل پھر اسی میں گرفتار ہو جائیں گے، اور اگر کل بھی بچ جائیں گے تو پرسوں کامل تباہی کا سامنا ہوگا۔ جب حاکم اور محکوم کے باہمی تعلق کا یہ حال ہو تو وفاداری اور خیرسگالی کی کیا امید ہوسکتی ہے؟"[120]

یہ بات نہیں تھی کہ تمام انگریز ہندوستانی رعایا کے جذبات سے بے خبر تھے۔ ان میں سے بعضوں نے فی الواقع کمپنی کی سرکار کو اس کے ملاتے میں خطرناک صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ مٹکاف کو یہ توقع تھی کہ "ایک دن سہانی صبح کو جب جاگوں گا تو مجھے معلوم ہوگا کہ برطانوی تاج ہندوستان سے محروم ہو چکا ہے۔"[121] کرنل سلیمن نے ماہ اپریل ۱۸۵۲ء میں ڈلہوزی کو لکھا تھا کہ ممکن ہے کہ دیسی ریاستیں کسی "جان جوکھم کے کام میں متحد ہو جائیں"[122] ڈائرکٹر ٹکر نے حکومت کو متنبہ کیا کہ ادھر کے تعلقہ دار خاموش ہیں کیوں کہ "ہندوستان کے باشندے سختیاں سہنے اور اپنے حاکموں کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے عادی ہیں لیکن اگر ہماری مغربی سرحد پر کوئی دشمن نمودار ہو جائے یا بدقسمتی سے کوئی بغاوت بپا ہو جائے تو ہم ان تعلقداروں کو مخالف صفوں میں پائیں گے اور ان کی رعایا اور نوکر چاکر اسی جھنڈے کے نیچے ہوں گے۔"[123] لارڈ کیننگ نے لندن سے روانگی سے پہلے فرمایا۔

یہ انسان کی ہتھیلی کے برابر ہوتی تھی اور اس کا وزن دو تولے تھا۔[۱۳۴]

چپاتیوں کی یہ تقسیم بالکل اس واقعہ کا اعادہ تھا جو ۱۸۰۲ء میں شمالی ہندوستان پر مرہٹوں کے حملے سے پہلے رونما ہوا۔ فرق صرف یہ تھا کہ چپاتی کے ساتھ گوشت کے بجائے باجرے کے پودے کی ڈالی ہوتی تھی۔[۱۳۵] اسی طرح سنتھل بغاوت سے پہلے سال کے درخت کی ٹہنی گاؤں گاؤں میں تقسیم کی گئی تھی۔[۱۳۶] سرجان ملکم کے قول کے مطابق "۱۸۰۶ء میں ساحلی فوج (COAST ARMY) کے غدر سے پہلے مٹھی بھر کھانڈ پُراسرار طریقہ سے تقسیم کی گئی تھی"۔[۱۳۷] ان چپاتیوں کی تقسیم کے بعد مبہم پیشین گوئیاں اور افواہیں اڑنے لگیں جو قتلِ عام کا پیش خیمہ خیال کی جاتی تھیں۔ ان سے عوام کے دلوں میں دہشت پیدا ہوگئی۔

اس وقت برطانوی حکام کا عام خیال یہ تھا کہ بغاوت کی تنظیم میں مسلمانوں کا زیادہ ہاتھ ہے ریورنڈ جے۔ کیو۔ براؤن کا بیان ہے کہ پنجاب سرکار نے شروع ہی سے یہ اعلان کردیا تھا کہ بغاوت کا آغاز دراصل ہندوستانیوں اور مسلمانوں کی طرف سے ہوا۔ مسلمانوں کو بغاوت کا محرک سمجھا جاتا تھا اور ہندوؤں کو ان کا آلۂ کار۔[۱۳۸] گبنس، براؤن کی رائے سے اتفاق رکھتا ہے۔ اس کا بیان ہے کہ مسلمانوں نے "بڑی احتیاط کے ساتھ ہندوؤں کو خوف زدہ کرکے اپنا اُلو سیدھا کیا"۔[۱۳۹] جس فوجی کمیشن نے بہادر شاہ ظفر کے مقدمے کی سماعت کی اس کے ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل میجر ایف۔ جے۔ ہیرئٹ کا بیان ہے کہ: "ان مقدمات کی انتہائی معنی خیز حقیقت یہ ہے کہ جہاں کہیں ہم نے تفتیش کی ہے مسلمانوں کی سازش کے آثار پائے ہیں لیکن ایک بھی ایسی دستاویز ہاتھ نہیں لگی جس سے ظاہر ہو کہ ہندو بحیثیت فرقے کے ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں یا برہمنوں اور پجاریوں نے عیسائیوں کے خلاف جہاد کا پرچار کیا ہو.... مسلمان ملّا نظر باطن کے اور فرضی قوتِ معجزہ کے جھوٹے دعویدار، مسلمان بادشاہ، ان کے فریب میں پھنسے ہوئے لوگ اور شریک جرم.... ترکی اور ایران کی مسلمان حکومتوں میں مسلمان خفیہ سفارت خانے.... مسلمانوں کی طرف سے ہمارے اقتدار کے زوال کی پیشگوئیاں... ہماری حکومت کی وارث مسلم سرکار؛ مسلمان قاتلوں کے ہاتھوں سفاکانہ قتل... اسلامی غلبہ کے لیے جہاد... اور بغاوت کے بانی مسلمان سپاہی۔ غرضیکہ ہندوؤں کا کہیں بھی دخل ظاہر نہیں ہوتا اور اگر کہیں شاذو نادر ہوتا بھی ہے تو اپنے جنگ جو ہمسایہ کی زیرِ ہدایت محض ثانوی حیثیت سے۔"[۱۴۰] اسی لیے سب آلٹرن رابرٹس (جو بعد میں فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس ہوگئے) ان بدسیرت مسلمانوں کو دکھانا چاہتا تھا کہ "خدا نے چاہا تو انگریز اب بھی ہندوستان

وہ اسے دوسرے کے حوالے کر دیتا۔ اس طرح ہر آدمی اسے لے کر آگے بڑھا دیتا اور جب یہ آخری آدمی کے ہاتھ میں آتا تو وہ اچانک غائب ہو کر اگلی چھاؤنی میں پہنچ جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنگال میں کوئی ایسا الگ فوجی دستہ یا چھاؤنی نہ تھی جس میں کنول کے پھول نے گشت نہ کیا ہو۔[128] سر جارج آٹو ٹریویلین کی رائے ہے کہ سرخ پھول نے تمام سپاہیوں کو متحد کر دیا۔[129] ہر آدمی سرخ کنول کی قسم کھا کر عہد کرتا کہ جب بھی دعوتِ عمل آئے گی وہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرے گا۔

اس رسم کے بعد ہر رجمنٹ تنظیم کی اپنی خفیہ شاخ قائم کرتی۔ ولسن اپنی تصنیف "DEFENCE OF LUCKNOW" (لکھنؤ کی مدافعت) میں یوں لکھتا ہے: "جو شہادت دستیاب ہے اس سے ظاہر ہے کہ ہر رجمنٹ میں تین افراد کی ایک انجمن تھی جو غدر سے متعلق ہر ضروری کارروائی کرتی تھی۔ یہ انجمن تمام اہم تجاویز کے بارے میں فیصلہ کرتی۔ خط و کتابت بھی اسی کے ذمے تھی اور کئی دوسرے کام انجام دیتی۔"[130] ساورکر[131] کے مطابق سپاہی رات کو خفیہ طور پر ملا کرتے تھے۔ تمام قراردادیں عام مجلس میں منظور کی جاتیں اور اندرونی حلقوں میں جو فیصلے کیے جاتے اُن تمام کی تعمیل سختی کے ساتھ کی جاتی۔

جب سپاہی خفیہ اجلاس میں شامل ہوتے تو وہ سوائے آنکھوں کے اپنے تمام چہرے کو ڈھانپ کر اپنی شخصیت کو چھپا لیتے۔ اجلاس میں وہ اُن بے انتہا مظالم کو تفصیلاً بیان کرتے جو انگریز ملک میں ڈھاتے تھے۔[132] اگر کسی پر مخبر ہونے کا شک گزرتا تو اُسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا۔ جب ایک رجمنٹ کی تنظیم پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتی تو اس کی بڑی انجمن دوسری رجمنٹ کی بڑی انجمن کے ساتھ نامہ و پیام کرتی تاکہ مل کر کام کر سکیں۔ رجمنٹوں کے حلف سپاہیوں کی سوگند کی طرح واضح اور معین ہوتے تھے۔ ہر رجمنٹ بڑی تنظیم کا جز ہوتی تھی۔ مختلف رجمنٹوں کے درمیان بحث و مباحثہ کی سہولت کے لیے ایسا انتظام کیا گیا کہ تیوہاروں کی تقاریب مل کر منانے کے لیے رجمنٹیں ایک دوسرے کو دعوت دیں۔ اس سے متحدہ خفیہ اجلاس منعقد کرنے کا بہانہ مل جاتا۔ منتخب سپاہی صوبیداروں کے گھروں میں ملتے۔ اہم معاملات کا فیصلہ افسروں پر چھوڑ دیا جاتا۔[133]

شورش سے عین پہلے چپاتیوں کی تقسیم غالباً لوگوں کو آنے والے انقلاب کے لیے تیار کرنے کا اشارہ تھا۔ نواب معین الدین کے بیان سے ظاہر ہے کہ کس طرح ماہ فروری میں ایک دن علی الصباح سرائے فرخ خاں کا پاسبان ایک چپاتی لایا اور اسے اسی قسم کی پانچ چپاتیاں پکانے اور پانچ نزدیک ترین دیہات میں بھیجنے کو کہا اور ساتھ ہی یہ ہدایت کی کہ ہر گاؤں کا چوکیدار اسی قسم کی پانچ چپاتیاں اسی طریقے سے تقسیم کرنے کے لیے تیار کرے۔ ہر چپاتی جو اور گندم کے آٹے کی بنی ہوتی تھی۔

بغاوت کے دوران دہلی کے کوتوال نواب معین الدین نے اپنی کتاب "TWO NARRATIVES OF THE MUTINY IN DELHI" (دہلی میں غدر کے دو بیانات) میں باغیوں کے طریق کار پر قیاس آرائی کی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ کسی فرنگی کے مکان یا تار گھر کو نذر آتش کرنا ایک قسم کا اشارہ تھا۔ کسی تار گھر کی آتش زنی کی خبر فوراً بذریعہ تار کلکتہ سے پنجاب تک پہنچا دی جاتی تھی۔ اور یہ قیاس کیا جاتا تھا کہ جو لوگ اس اشارے سے آشنا ہیں وہ یہ خبر سن کر سمجھ جائیں گے کہ انھیں بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔[۵۰] اس آتش زنی کی اطلاع ملک میں دور دور تک نشر کی جاتی تھی۔ کہتے ہیں کہ ایک رجمنٹ سے دوسری کو مسلسل خطوط بھیجے جاتے تھے جن میں سپاہیوں کو اسی قسم کی تخریب کاری پر اکسایا جاتا تھا اور اس کی تعمیل نہ کرنے پر ذات برادری سے اخراج کی دھمکی دی جاتی تھی۔[۵۱] تمام خط و کتابت میں باغی نکتوں اور اعداد پر مشتمل ایک قسم کی خفیہ تحریر استعمال کرتے تھے۔ احتیاط کے ساتھ ناموں کے ذکر سے احتراز کیا جاتا تھا۔[۵۲] فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس کے بیان کے مطابق عظیم اللہ قسطنطنیہ کے عمر پاشا کے ساتھ باغیانہ مراسلہ نگاری بھی کرتا رہا جس میں اس نے سپاہیوں کی بے اطمینانی اور ہندوستان کی عام بدامنی کی حالت کا ذکر کیا اور برطانوی غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لیے ترکوں سے امداد کی التجا کی۔ لارڈ رابرٹس کا یہ بھی بیان ہے کہ عظیم اللہ نے چندر نگر میں مقیم فرانسیسی آباد کاروں کی وساطت سے فرانسیسی سرکار کے ساتھ بھی اسی قسم کی خط و کتابت جاری رکھی۔[۵۳]

زبانی خبروں اور رونما ہونے والے واقعات کا احتیاط کے ساتھ مقابلہ کرنے کے بعد کریک فورڈ ولسن کو یقین ہو گیا کہ ۳۱ مئی ۱۸۵۷ء کا اتوار وہ دن تھا جو بنگال کی ساری فوج میں بغاوت کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔[۵۴] لیکن دوسرے ہم پایہ معتقد مشاہدین نے ولسن کے انکشافات کو قبول نہ کیا۔ مثال کے طور پر سر جان لارنس کا یہ کہنا کہ "متعدد خطوط جو سپاہیوں نے لکھے اور جنھیں راستے میں روک لیا گیا، اُن میں ایک بھی خط ایسا نہ تھا جس میں ایسی سازش کا اشارہ تک ہو۔ سازش کا علم نہ تو وفادار سپاہیوں کو تھا اور نہ موت کی سزا پانے والے باغیوں کو جو اس سازش کا (اگر کوئی تھی) انکشاف کر کے اپنی جان بچا سکتے تھے۔"[۵۵] لارنس نے سوال کیا کہ "کیا سبب ہے کہ عوام اور فوجیوں نے ایک ہی وقت پر بغاوت نہیں کی؟ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ اس سازش کے متعینہ وقت کا پتہ چل جانے سے میرٹھ کا ہنگامہ پہلے ہی بپا ہو گیا تو بھی سوال اٹھتا ہے کہ اس شورش کی خبر پانے کے بعد فوراً بغاوت کیوں نہیں شروع ہوئی؟"[۵۶]

بے شک یہ معقول دلائل ہیں۔ لیکن واقعات سے ان کی تردید ہوتی ہے۔ حقیقت حال یہ

کے آقا ہوں گے۔"[141]

اس بیان کی تائید کہ بغاوت کی شہ مسلمانوں کی طرف سے تھی، اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ چپاتیوں کے ساتھ "کچے گوشت کا ایک ٹکڑا بھی تھا۔"[142] چونکہ ہندو عام طور پر سبزی خور تھے اس لیے یہ خیال کیا گیا کہ وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ البتہ اس استدلال میں کچھ نقائص تھے جن کی بنا پر یہ تاویل قابلِ قبول نہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلمان اچھے سازشی نہیں ہیں۔ ان کے طریقے بہت بھدے ہیں۔ وہ فوراً تشدد پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس ہندو سازش کے لیے فطری استعداد رکھتے ہیں۔ وہ صبر، نتائج سے متعلق دور اندیشی، امکانات پر بااحتیاط غور و خوض، صحیح وقت اور حربے کے انتخاب، حالات سے استفادہ، نصب العین کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے، قسمت کے ہر جھٹکے سے فائدہ اٹھانے کی قوت رکھتے ہیں۔ یہ تمام ایسے اوصاف ہیں جو سازش میں کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہیں۔"[143] سر چارلس تھیوفلس مٹکاف کی یہ رائے ہے کہ "کچے گوشت کے ٹکڑے کا مطلب دشمن کی بیخ کنی ہو سکتا ہے۔"[144] اس نقطۂ نظر کی تائید کے لیے اس بیان سے ہوتی ہے کہ "مسلمان اور ہندو ہمارے خلاف متحد تھے۔"[145] جہاں کہیں باغی غلبہ حاصل کر لیتے وہاں فوراً گاؤکشی ممنوع قرار دے دی جاتی۔ اس سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ بغاوت ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک مہم تھی۔[146] اس کے علاوہ دہلی میں باغیوں نے جو مجلسِ انتظامیہ قائم کی تھی اس کے دس ارکین میں سے پانچ ہندو تھے۔ جنرل گوری شنکر، صوبیدار میجر بہادر جیوا رام، صوبیدار میجر بہادر شو رام مشر، صوبیدار میجر بہادر ہیرا لال اور صوبیدار میجر بہادر بینی رام۔[147]

کرنل جی۔ بی۔ مالیسن کے مطابق فیض آباد کا مولوی احمد اللہ شاہ "یقیناً سازش کا ایک لیڈر تھا۔"[148] اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس بات سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نانا صاحب اور دوسرے بہت سے اشخاص بھی لیڈر تھے۔ نانا صاحب کے بارے میں کے کا بیان ہے کہ "میرے ذہن میں اس سے زیادہ مسلمہ حقیقت کوئی نہیں کہ ہنگامۂ غدر شروع ہونے سے پہلے دور دور تک جو سازشیں کی گئیں اُن میں نانا صاحب شریک تھے۔ ملک کے مختلف حصوں میں، جو ایک دوسرے سے بہت دور تھے، گواہوں کی یکساں شہادت کی بنا پر اس حال کی داستان کی سچائی میں کوئی شبہ نہیں رہتا۔"[149] اس کے علاوہ بہار کا کنور سنگھ، عظیم اللہ، بخت خاں، علی نقی خاں، رنگو باپو جی، تانتیا ٹوپے اور جھانسی کی رانی لکشمی بائی باغیوں کے مسلمہ راہنما تھے (اگرچہ بغاوت کے دوران دونوں فرقوں میں اختلافات ضرور پیدا ہو گئے جن کا ذکر بعد کے کسی باب میں کیا جائے گا۔)

میں مبتلا تھا۔[166] میکلوڈ انس کا بیان ہے کہ "بالائی صوبوں میں یعنی گنگا اور جمنا سے سیراب ہونے والے میدانوں سے لے کر خاص بنگال تک برطانوی امن معطل اور شہری نظام حکومت کلیۃً درہم برہم تھا۔"[167] وسطی ہندوستان کے بارے میں کیننگ نے لکھا: "میں وسطی ہندوستان کو ہاتھ سے گیا سمجھتا ہوں جسے ازسرِ نو فتح کرنا ہوگا۔"

کانپور میں نانا صاحب نے باغیوں کی "راہنمائی کی۔"[168] گرد و نواح کے دیہاتی مرہٹہ پنڈتوں کی اشتعال انگیزی پر جو نانا صاحب کی طرف سے جہاد کی تلقین کر رہے تھے، باغیوں کے ساتھ صف آرا ہو گئے۔[169] اس علاقے کے ہر فرد کے سر میں ایک ہی دُھن سمائی ہوئی تھی کہ "غیر کے جبر کا جوا اتار پھینکنے کا بس یہی موقع ہے۔"[170] جھانسی میں لکشمی بائی نے "بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔"[171] پٹنہ میں وہابیوں اور بنارس میں برہمنوں کا مذہبی اثر اتنا زیادہ تھا کہ یہ دو شہر مزاحمت کے گڑھ بن گئے۔[172] غلہ اور دوسری اشیائے خورد و نوش کی گرانی جسے ہمیشہ برطانوی حکومت سے منسوب کیا جاتا تھا الہ آباد کے باغیوں کے ہاتھ میں حکومت کو بدنام کرنے کا ایک سہل اور جائز حربہ بن گئی۔[173] بہار میں بندوبست دوامی اس طرح نیست و نابود ہوا گویا ایک خواب تھا۔[174]

جہاں کہیں فوجی شورش بپا ہوتی عموماً اس کے بعد یا اس کے ساتھ ہی شہر اور دیہات میں بغاوت پھوٹ پڑتی لیکن کئی مقامات میں لوگوں نے سپاہیوں سے پہلے ہی علم بغاوت بلند کر دیا۔[175] جہاں کہیں بغاوت شروع ہوتی سرکاری خزانہ، گودام اور اسلحہ خانہ لوٹ لیا جاتا۔ بیرکوں اور سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش کر دیا جاتا اور جیل خانوں کے پھاٹک کھول دیے جاتے۔[176] ہر جگہ سرکاری دستاویزات کی طرف باغیوں کا وہی رویہ ہوتا جو بنیوں کے بہی کھاتوں کی طرف تھا اور دونوں صورتوں میں وجہ ایک ہی تھی۔ ان کی نگاہ میں یہ دستاویزات جابرانہ ٹیکسوں کی وصولی اور ضبط و امن کے قیام کے وسائل تھے جو انھیں ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔"[177] اس لیے وہ سرکار کی دستاویزات کو تباہ کر دیتے اور ان کے ہاتھوں بنیوں کے بہی کھاتوں کا بھی یہی حشر ہوتا۔ "بے دخل کیے گئے زمینداروں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا جس کے وہ مدت سے منتظر تھے۔ انھوں نے اپنی رعایا کو اکٹھا کیا اور مغرورِ دولت نو دولتوں کو مار بھگایا جنھوں نے ان کی جائدادیں خرید لی تھیں اور اس طرح فاتحانہ انداز سے اپنے آبائی گھروں میں آباد ہو گئے۔ گستاخ قرض داروں کے ہجوم بنیوں پر ٹوٹ پڑے اور انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اگر قانون کے مضبوط ڈنڈے کا خوف نہ ہوتا تو وہ انھیں پہلے ہی جبراً روپیہ اینٹھنے کی سزا دے چکے ہوتے۔"[178] تاجروں کو مجبور کیا جاتا کہ وہ ۱۲۱

متعلق بعض سوالات کا جواب اُن سے نہیں ملتا۔ ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کے دن دہلی کے سپاہیوں نے بکھر کر اس کا موقع کھو دیا کہ ان کے افسر میرٹھ کے باغیوں کی گولیوں کا نشانہ بنیں ؟[۱۵۶] لگ بھگ ایک ہی مہینے کے اندر اتنے بڑے پیمانے پر سپاہی کیوں باغی ہو گئے ؟ یہ حقیقت کہ باغی ایسی بغاوت کی تنظیم کر سکے جو دریائے گنگا اور دریائے جمنا کے تمام درمیانی علاقے میں پھیلی ہوئی تھی سازش کے وسیع انتظامات کو بھی ظاہر کرتی ہے اور بغاوت کے راہنماؤں کی تنظیمی قابلیت کو بھی البتہ جدوجہد کے کسی متحدہ منصوبے اور مرکزی کمان کے نہ ہونے سے ظاہر ہے کہ تنظیم ابھی مکمل نہیں ہو پائی تھی۔

چنانچہ ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ باغیوں نے بغاوت سے پہلے کے ایام میں ہی ایک تنظیم قائم کر لی تھی لیکن یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ بغاوت شروع ہونے کے وقت یہ تنظیم ابتدائی حالت میں تھی۔

۴۔ وسعت

جو بغاوت میرٹھ میں ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو شروع ہوئی بڑی تیزی کے ساتھ پھیل گئی۔ بغاوت برپا ہونے کے ایک ہفتے کے اندر ہی شمالی ہندوستان میں انگریزی سلطنت کے مٹنے میں تھوڑی ہی سی کسر باقی تھی۔[۱۵۷] بنگال اور پنجاب کی حدود کے درمیان صرف آگرہ کے گرد ونواح میں چند میل تک ہی انگریزی حکومت[۱۵۸] کا سکہ چلتا تھا یا کچھ دوسرے الگ تھلگ مقامات میں جہاں انگریزی فوج کے دستے موجود ہوتے تھے۔ لو لکھتا ہے: "اب ہندوستان میں رہنا گویا اس آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر کھڑا ہونا ہے جس کے کنارے ٹوٹ پھوٹ کر ہمارے پیروں کے نیچے سے رِس رہے ہیں اور جل اور کھولتا ہوا لاوا پھوٹنے اور ہمیں بھسم کر دینے والا ہی ہو۔"[۱۵۹] شمالی ہندوستان میں ہر ہل کے پھل کو تلوار میں تبدیل کیا جا رہا تھا۔

میرٹھ کے باغیوں نے ہندوستان کے صدیوں پرانے پایۂ تخت دہلی کی طرف تیزی کے ساتھ یلغار کی۔ وہ بلا کسی بڑی مزاحمت کے دہلی دروازہ سے داخل ہوئے۔ آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا محاصرہ کیا اور اس کے شہنشاہِ ہندوستان ہونے کا اعلان کیا۔[۱۶۰] اودھ کا انتظام حکومت ریت کے گھروندے کی طرح تخس نخس ہو گیا۔[۱۶۱] گبنس لکھتا ہے: "برطانوی حکومت صرف صوبائی دارالخلافہ اور اس کے گرد ونواح تک محدود ہو گئی۔"[۱۶۲] روہیلکھنڈ میں سارا دیہاتی علاقہ بغاوت کی لپیٹ میں تھا۔[۱۶۳] خان بہادر خاں نے شہنشاہِ ہند کے نائب ہونے کا اعلان کیا۔[۱۶۴] قریباً تمام بندھیلکھنڈ نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔[۱۶۵] سارا دوآب انقلاب کی کشمکش

اس بات کا اعتراف کیا کہ ہندوستانی ریاستوں نے "اس سیلاب کو روکا جس کے ایک ہی ریلے سے ہم ڈگمگا جاتے۔"[185]

باغیوں کو پنجاب سے عملی امداد کی توقع تھی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ چوں کہ انگریزوں نے اسے صرف آٹھ سال ہی پہلے فتح کیا تھا اس لیے وہ لوگوں کے دلوں کو نہ جیت سکے ہوں گے اور نہ ہی ان کی وفاداری انھیں حاصل ہوئی ہوگی۔ انگریزوں کی قسمت کا مدار صرف پنجاب کی حمایت یا مخالفت پر تھا۔ تھارن ہل تسلیم کرتا ہے کہ "اگر پنجاب نے بغاوت کر دی تو ہماری حالت خطرناک ہو جائے گی۔ ہم مقابلے کی تاب نہ لا سکیں گے۔ جب تک انگلستان سے کمک نہ پہنچے۔"[186] لیکن پنجاب "مجموعی طور پر وفادار"[187] رہا بلکہ اس صوبے سے انگریز تمام فرقوں، مذہبوں اور بولیوں کے انتالیس ہزار جوان فوج میں بھرتی کرنے کے قابل ہو گئے۔[188]

بغاوت کی طرف پنجاب کی بے رخی کے کئی اور اسباب تھے۔ سکھ سردار مغل غلبے اور مغل اقتدار کی بحالی سے خائف تھے کیوں کہ اس کا مطلب ان کا یقینی طور پر مغلوب ہو جانا تھا۔[189] اس کے علاوہ سر ہنری لارنس نے ان کے ساتھ نرمی کا سلوک روا رکھا تھا۔ ان کے برگشتہ مقدر کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور ان کی جاگیروں پر اس قدر سختی کے ساتھ ہاتھ نہیں ڈالا تھا جیسا دوسرے صوبوں میں کیا گیا تھا۔[190] جی۔ ڈبلیو۔ فارسٹ لکھتا ہے: "بغاوت کے دوران سر جان لارنس کی حکومت کی شاندار کامیابی اس اقدام کی رہین منت ہے جو سر ہنری لارنس نے جاگیرداروں[191] کے موروثی حقوق کی حمایت میں کیا۔"[192] جن سرداروں پر شبہ تھا انھیں جلاوطن کر دیا گیا۔ وہ سردار جنھیں اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا خالصہ فوج کے جبر و ستم کو یاد کر کے ایسی بغاوت کی کامیابی کے تصور سے سہم گئے جو غالباً انھیں اسی قبیل کی ستم شعار فوج کے رحم و کرم پر ڈال دے گی۔[193] بے دخل کیے گئے سکھ جاگیردار جو سکھوں کی جنگوں میں راہنما تھے اور جن کے دلوں میں ابھی کمپنی کے افسروں کے زیر کمان پوربیے سپاہیوں کے ہاتھوں شکست کی یاد تازہ تھی بے تابی کے ساتھ انگریزوں کے آڑے آئے۔ اس طرح انھیں اس شکست کا انتقام لینے کی بھی امید تھی اور اپنے سابقہ حقوق اور مقام کو از سر نو حاصل کرنے کی بھی۔[194] اس کے علاوہ وہ یہ نہ بھولے تھے کہ پوربیے سپاہیوں نے انھیں "نیچ ذات"[195] ہونے کا طعنہ دیا تھا۔

سکھ لوگوں نے باغیوں کے ساتھ شامل ہونے کا خیال اس لیے بھی ترک کر دیا کیوں کہ وہ بغاوت کی کامیابی کا لازمی نتیجہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ان پر مذہبی جور و ستم ہوگا۔ ان

جان بچانے کے لیے باغیوں کی مدد کریں۔[179]

فوجی مراکز میں غیر ملکی حکومت کے ظاہری نشانات مٹانے کے بعد سپاہیوں نے دہلی پر اپنی توجہ مبذول کی۔ دہلی کی فتح سے اس تحریک کو ایک سیاسی وقعت حاصل ہو گئی ورنہ اس کی حیثیت ایک مقامی شورش کی سی ہوتی۔ تو کو بھی جو ہندوستانیوں اور ہندوستانی چیزوں کا کسی صورت مداح نہ تھا، یہ تسلیم کرنا پڑا کہ باغیوں نے "اپنی سرگرمیوں کے لیے ایک شاندار مرکز کا انتخاب کر لیا تھا جہاں ہر قسم کے سامانِ جنگ کا ذخیرہ تھا جیسا کہ ایک اوّل درجے کے اسلحہ خانے میں ہونا چاہیے۔ یہ ایک ملکی دولت اور شان و شوکت سے مالا مال قلعہ بند شہر تھا جہاں انگریزوں کا ایک بہت بڑا خزانہ اور کثیر المقدار بارود کا گودام موجود تھے اور جہاں مسلمانوں کی آبادی انگریزوں کی مخالف تھی۔"[180] جنگی مصلحت کے لحاظ سے بھی دہلی پر قبضہ ایک کاری ضرب تھی۔ یہاں کمک پہنچانے والی انگریزی فوجوں کے گھر جانے، اپنے اڈے سے جدا ہو جانے اور بالآخر نیست و نابود ہو جانے کا خدشہ تھا کیوں کہ یہاں نقصانات کی تلافی کے وسائل مفقود تھے۔ فیصلہ کن جد و جہد کا محاذ ایسی جگہ منتخب کیا گیا جہاں ہندوستان میں مقیم انگریزی فوجوں کی اکثریت کے ساتھ آسانی سے نپٹا جا سکتا تھا۔

لیکن آخری مغل بادشاہ اور نانا صاحب کی بحالی نے راجپوت ریاستوں، پنجاب کے سکھوں اور نظام حیدرآباد کے دل میں شبہات پیدا کر دیے۔ راجپوت ریاستوں کی فوجی اہمیت کے بارے میں لارڈ کیننگ نے کورٹ آف ڈائرکٹرس کے نام ایک سرکاری مراسلہ میں اس بات کا اعتراف کیا کہ "اگر مہاراجہ سندھیا بغاوت میں شامل ہو جائے تو مجھے کل ہی بوریا بستر گول کرنا ہوگا۔"[182] راجپوت ریاستوں کے حکمران اور دوسرے لوگ ڈرتے تھے کہ باغیوں کی کامیابی کا مطلب یہ ہوگا کہ مغل اور مرہٹے ڈاکو اپنی غارت گری پھر شروع کر دیں گے۔ انھیں وہ وقت یاد تھا جب کمپنی کی حفاظت انھیں نہیں حاصل تھی اس لیے وہ امن و امان اور استحکام حکومت کھونے سے ڈرتے تھے جو اس حفاظت کے معاہدے کا نتیجہ تھے جس کی تائید جارج لارنس کے قول و فعل سے ہو چکی تھی۔[183] اس لیے انھوں نے اپنی بقا کی خاطر اس طاقت کی مدد کی جس نے انھیں مغلوں اور مرہٹوں کی رہزنی سے بچایا تھا۔ نظام نے بھی باغیوں کے ساتھ کسی ہمدردی کا اظہار نہ کیا۔ اس کے آبا و اجداد مغل اقتدار کے زوال کے باعث ہی ایک ریاست قائم کرنے کے قابل ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اس اقتدار کی بحالی کا خواہاں نہ تھا۔[184] کیننگ نے ہندوستانی ریاستوں کو خراجِ تحسین ادا کیا جس کی وہ مستحق تھیں۔ اس نے

پشاور اور چھاؤنی کی منڈیوں کے دروازے بند کر دیے جائیں۔"[۲۰۳] کے طنزاً بیان کرتا ہے کہ "اگرچہ گنوار مسلمان حضرت محمد سے بہت عقیدت رکھتے تھے لیکن دولت کے ساتھ انھیں زیادہ محبت تھی۔ ہر شخص جس کے پاس کوئی توڑے دار بندوق یا تلوار اور گھوڑا پیش کرنے کو تھا وہ اپنے نذرانے کے ساتھ پشاور میں برطانوی افسروں کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔"[۲۰۴]

پنجابیوں کے مبہم رویے کا سمجھنا دشوار نہیں۔ پنجاب کی فتح کو اتنی تھوڑی مدت ہوئی تھی کہ پنجابیوں کو نہ تو ان مصائب کو بھولنے کا وقت ملا جس سے اس فتح نے انھیں نجات[۲۰۵] دلائی تھی اور نہ ہی ان مصیبتوں کو جھیلنے کی نوبت آئی جو دوسرے صوبوں میں برطانوی سرکار کے ساتھ نازل ہوئیں۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد بدامنی کے دور میں ٹیکسوں اور محصولوں کا جو بوجھ حد درجہ بڑھ گیا تھا وہ نئی حکومت کے تحت ہلکا ہو گیا تھا۔ راہزنی کا قریب قریب قلع قمع ہو گیا تھا۔[۲۰۶] لگان کی فوری اور منصفانہ تشخیص سے رعایا کی خوشحالی میں اضافہ ہوا اور وہ قناعت پسند ہو گئی۔[۲۰۷] "نئے حکمرانوں نے لگان آراضی کی تشخیص بہت کم کی اور زمین پر قابض کاشتکاروں کے لیے جائز اور وافر آمدنی کی گنجایش چھوڑ دی۔"[۲۰۸] چوں کہ پنجاب سرحد کے قریب تھا اس لیے انھوں نے یہاں حقوق ملکیت آراضی میں کوئی مداخلت نہ کی۔ نئی سڑکوں، نہروں اور پلوں کی تعمیر اور جنگلوں اور چراگاہوں کی حفاظت کا کام زور شور سے شروع کر دیا گیا۔[۲۰۹] قصہ کوتاہ، سالوں کی بے چینی اور لاقانونی کے بعد پنجابی ایک مستحکم حکومت کی برکتوں سے آشنا ہوئے۔[۲۱۰]

پنجاب کو یکے بعد دیگرے ایسی بھرپور فصلیں نصیب ہوئیں کہ سالوں دیکھنے میں نہ آئی تھیں۔[۲۱۱] کوپر اپنی تصنیف THE CRISIS IN THE PUNJAB (پنجاب میں بحران) میں لکھتا ہے: ملک اتنا فارغ البال اور خوشحال تھا کہ محض دوستی کی خاطر کسی شورش میں شریک نہ ہو سکتا تھا،[۲۱۲] اور نہ غیر یقینی مستقبل کا خطرہ مول لے سکتا تھا۔[۲۱۳]

اس کے علاوہ بقول سر سید احمد خاں اس کے کچھ دوسرے "معقول اسباب"[۲۱۴] بھی تھے۔ ایک تو مفلسی جو سارے ہندوستان میں ڈیرہ ڈالے ہوئے تھی، ابھی اسے پنجاب میں پہنچنے اور اثر ڈالنے کا وقت نہیں ملا تھا۔" دوسرے ایک طاقتور یورپی فوج موقع پر موجود تھی۔ تیسرے افسروں نے سپاہیوں کو فوراً نہتا کرنے میں دانشمندی کا ثبوت دیا۔ چوتھے الحاق کے بعد تمام پنجاب کو بے ہتھیار کر دیا گیا تھا۔ پانچویں، پنجابیوں اور پٹھانوں نے پہلے ہی ملازمت اختیار کر لی تھی اور کوئی بے کار لوگ نہیں تھے جنھیں کوئی نتنہ سوجھتا۔ چھٹے، ہندوستان (یعنی دہلی، لکھنؤ

کے نویں گرد، تیغ بہادر کی چاندنی چوک دہلی میں شہادت اور دوبارہ قتل عام کی یاد ابھی تازہ تھی۔ جان لارنس نے اُن کے جذبات کا صحیح جائزہ لیا اور یہ افواہ پھیلا دی کہ بادشاہ دہلی اس شخص کو انعام و اکرام سے نوازے گا جو کسی سکھ کو ہلاک کرے گا اور ثبوت کے لیے اس کا سر لائے گا۔[۱۹۶]

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اہل پنجاب میں سے صرف سکھوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ بغاوت کے دوران پنجابیوں نے مجموعی طور پر ان کی امداد کی۔ تینوں فرقوں ـــ سکھ، ہندو، اور مسلم ـــ کے دیہاتیوں نے مختلف مقامات پر باغیوں کو گرفتار کرنے میں برطانوی حکام کی مدد کی۔[۱۹۷] لگان آراضی ایک ایک پائی تک باقاعدہ ادا کیا جاتا تھا۔[۱۹۸] ہومز نے لکھا ہے کہ "محصول آب کاری کی آمدنی یقیناً بڑھ گئی اور سرکاری اسکولوں کی حاضری میں چنداں کمی واقع نہ ہوئی"۔[۱۹۹] پادری گیوبراؤن لکھتا ہے: "پنجاب کے کچھ ضلعوں میں لگان آراضی اور دوسرے محصولات کی ادائیگی بلاشبہ ان کے واجب الادا ہونے کی تاریخ سے پہلے ہی کر دی جاتی۔ یہ حقیقت اس حوصلہ افزا یقین کی دلیل تھی کہ عوام واقعی چاہتے ہیں کہ انگریزی راج جاری رہے۔ وہ آقا کی تبدیلی کے خواہاں نہ تھے خاص طور پر اس لیے کہ عبوری دور میں لاقانونیت کا خطرہ تھا۔"[۲۰۰]

پشاور میں سرکار نے تاجروں سے بڑے بڑے قرض لیے۔ اس طرح تاجروں کے مفاد خصوصی کمپنی کی حکومت کی بقا کے ساتھ وابستہ ہو گئے۔ "جہاں پہلے وہ بغاوت کے صرف تماشائی تھے اب اپنی غرض سے قانون کے حامی ہو گئے۔"[۲۰۱]

پنجاب کے مسلمان بھی باغیوں کی طرف داری سے ڈرتے تھے۔ انگریزوں نے انھیں سکھوں کے جور و ستم سے بچایا تھا۔ اگر انگریز ہندوستان کے دوسرے حصوں میں مسلمانوں کی تباہی اور پستی کا موجب تھے تو پنجاب میں وہ ان کے نجات دلانے والے تھے۔[۲۰۲]

فریڈرک کوپر کا بیان ہے کہ "سواتیوں، پشاوریوں اور کابلیوں پر اچھا اثر ڈالنے میں کئی ایک اسباب کارفرما تھے۔ وادی کی تشخیص مالیہ اتنی ہلکی ہے کہ ان کے علم میں پہلے کبھی نہ ہوئی تھی درّانی لوگوں کا کچومر نکال لیتے ہیں۔ کابل میں آج تک ان کا وطیرہ یہی ہے۔ وادی سے سکھ بارہ لاکھ روپیہ سالانہ بطور ٹیکس اور اتنا ہی اور لوٹ کھسوٹ کے ذریعے وصول کرتے تھے۔ برطانوی سرکار صرف چھ لاکھ پر قناعت کرتی ہے جس سے لوگ خوش ہیں اور اتنا ہی ہر ماہ اُن پر خرچ کر دیتی ہے۔ کثیر مصارف اور فوجیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی وجہ سے پہاڑی میوے، لکڑی اور غلے کی ایک منڈی قائم ہو گئی ہے۔ یہاں تک کہ کسی سرکش قبیلہ کے لیے سب سے کڑی سزا یہ ہے کہ اُن پر

کو سونپی گئی۔۲۲۲ مجلس کا کام حکومت کا انتظام کرنا، امن وامان قائم رکھنا، تحصیلوں سے لگان آراضی وصول کرنا، مہاجنوں سے قرضے لینا، سلطنت کی حفاظت کرنا اور جنگ کا اہتمام کرنا تھا۔۲۲۴ شہنشاہ نے مجلس سے یہ وعدہ کیا کہ "مجلس سے متعلق کسی بھی جماعت کی یادداشت پر غور نہیں کیا جائے گا اور اُن تمام احکام میں جو تمہاری مجلس سے صادر ہوں گے حکومت کا کوئی ملازم یا شہزادہ کسی طور مداخلت نہ کرے گا۔"۲۲۵

مجلس انتظامیہ دس اراکین پر مشتمل ہوتی تھی۔ چھ فوج سے اور چار دیوانی محکموں سے۔۲۲۶ فوج کی نمائندگی کو تینوں شعبوں یعنی پیادہ، رسالہ اور توپ خانہ میں یکساں تقسیم کیا گیا۔۲۲۷ اراکین کا انتخاب کثرت رائے سے "ان سمجھدار، دانش مند، قابل اور تجربہ کار آدمیوں میں سے کرنا ہوگا جو ملکی یا فوجی وفادارانہ خدمات انجام دے کر نام پا چکے ہوں۔"۲۲۸ اس حقیقت کے پیش نظر کہ صرف چند باغی ہی سابقہ خدمات کا دعویٰ کر سکتے تھے آخری شرط بالکل قابل فہم نہیں ہے۔ وثوق کے ساتھ تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن شاید اسی وجہ سے اس شرط کو لازمی قرار نہیں دیا گیا اور خاص طور سے اس کی گنجائش رکھی گئی کہ نہایت قابل اور سمجھدار اشخاص کے لیے یہ شرط ضروری نہیں تھی۔۲۲۹ مجلس کے شہری اراکین اسی طرح اپنے اپنے محکموں کی طرف سے چنے جاتے تھے۔۲۳۰

مجلس کے دس اراکین میں سے ایک کو بطور صدر جلسہ۲۳۱ اور دوسرے کو نائب صدر جلسہ۲۳۲ کثرت رائے سے چننا تھا۔ مجلس کے صدر کو دو رائے دینے کا اختیار تھا۔ مجلس کا ہر رکن اس محکمے کا مہتمم اعلیٰ ہوتا تھا جس کی طرف سے وہ منتخب کیا جاتا تھا۔۲۳۳ اس کی مدد کے لیے مجلس کے چار اراکین پر مشتمل ایک کمیٹی تھی۔ ہر کمیٹی اتنے سکتی تھی جتنے ضروری ہوتے۔ جو تجاویز کمیٹی میں کثرت رائے سے منظور ہوتیں تصدیق کے لیے رکن متعلقہ کی وساطت سے مجلس میں پیش کی جاتیں۔۲۳۴ جن محکموں کے نمائندے مجلس میں صدر اور نائب صدر چنے جاتے تھے ان محکموں کا مہتمم کون ہوگا، اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ غالباً انہیں صدر اور نائب صدر کے علاوہ اپنے اپنے محکمے کے مہتمم کے فرائض بھی انجام دینے تھے۔ سر جارج کیمپبل نے لکھا ہے: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دہلی کی سرکار ایک قسم کی آئینی فوجی حکومت تھی۔ بادشاہ بادشاہ تھا اور اس حیثیت سے ایک آئینی بادشاہ کی طرح اس کی عزت بھی کی جاتی تھی لیکن پارلیمنٹ کی بجائے اس کی ایک فوجیوں کی کونسل تھی جو مختار کل تھی اور جس کا نہ کسی درجہ فوج کا کمانڈر تھا کوئی عربی یا فارسی نام قسم کے دلفریب نام اصطلاحات رائج کی گئیں بلکہ اس کے برعکس انگریزی اصطلاحات اور دستور العمل اختیار کیے

اور آگرہ وغیرہ) میں لوٹ مار کی دُھن اُن کے سر پر سوار تھی۔ سر جان ولیم کے لکھتا ہے: "پلیس زیادہ خطرناک طبقہ کی اگر رضامندی نہیں تو اطاعت ضرور حاصل تھی۔"[215]
البتہ بغاوت کے اولین ایام میں انگریزوں کے تئیں پنجاب کی حمایت "ولے علی"[216] کی تھی۔ سر چارلس ایچیسن اپنی تصنیف : LIFE OF LORD LAWRENCE (لارڈ لارنس کی سوانح حیات) میں لکھتا ہے کہ "وہ بھرتی تو ہوئے مگر زیادہ تعداد میں نہیں۔ وہ پیچھے پیچھے رہے یہاں تک کہ دہلی فتح ہو گئی۔ اس کے بعد تو رنگروٹ ہزاروں کی تعداد میں آ گئے۔"[217]

۵۔ سیاسی تنظیم

باغیوں کی ابتدائی کامیابی کے فوراً بعد انگریزوں کے خلاف مستحکم اور متحدہ محاذ میں کمزوری اور انتشار پیدا ہو گیا۔ غیر ملکی حکومت سے نفرت نے باغیوں کو متحد کر دیا لیکن آزاد ہندوستان کے مختلف تصورات سے ان میں پھوٹ پڑ گئی۔ مغلوں اور مرہٹوں کے درمیان جاگیردارانہ رقابت پیدا ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ آخری پیشوا کے متبنیٰ بیٹے نانا صاحب نے دہلی جانے سے انکار کر دیا۔ اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ "مغل دربار میں وہ کسی گنتی میں نہ ہوگا" اور والیانِ ریاست کے انبوہ میں اس کا شخصی اقتدار اور اثر و رسوخ مٹ جائے گا۔[218]
جن جاگیرداروں نے "زمینداری میں عنایت"[219] دوبارہ حاصل کرنے کی غرض سے بغاوت کو مشتعل کیا یا اس پر رضامندی کا اظہار کیا یا بعد میں شامل ہو گئے انھیں یہ دیکھ کر بڑا صدمہ پہنچا کہ تحریک آہستہ آہستہ اُن کے اختیار سے نکل رہی ہے۔ ایک ہمعصر صحافی نے ۱۸۵۸ء کے CALCUTTA REVIEW (کلکتہ ریویو) میں لکھا کہ "بہت سے راجہ دانشمندی سے بھانپ گئے کہ غلاموں کی جنگ یعنی ادنیٰ طبقات کی اعلیٰ طبقات کے خلاف بغاوت سے ان کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔"[220] ملک کی سیاسی اور معاشی تعمیرِ نو کے لیے جو منصوبے باغیوں نے باندھے اُن سے ظاہر ہے کہ راجاؤں کا جائزہ صحیح تھا۔
۱۱ مئی ۱۸۵۷ء کو بہادر شاہ کے شہنشاہِ ہند ہونے کا اعلان کر دیا گیا تھا لیکن درحقیقت جولائی کے پہلے ہفتے میں ہی اس کی حیثیت برائے نام رہ گئی۔ جنرل بخت خاں کے پہنچنے کے بعد دہلی کے باغیوں نے ایک پروانہ[221] جاری کیا جس میں نئی حکومت کی ترکیب کا خاکہ دیا گیا تھا۔ بہادر شاہ کے ہندوستان کے شہنشاہ ہونے کا دوبارہ رسمی طور پر اعلان کیا گیا لیکن اصلی قوتِ عاملہ مجلسِ انتظامیہ

مجلس دو قسم کے اجلاس منعقد کرتی تھی۔[۲۴۲] عام اجلاس ہر روز پانچ گھنٹے کے لیے لال قلعہ میں منعقد کیا جاتا۔ خاص اجلاس کوئی ضروری معاملہ انجام دینے کے لیے دن یا رات کو کسی بھی وقت منعقد کیا جاتا۔[۲۴۳] باغی اتفاقِ رائے اور سرعتِ عمل کی ضرورت کو ضرور سمجھتے ہوں گے۔ کیوں کہ انھوں نے بیکار تجاویز پیش کرنے پر پابندی عائد کرنے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کسی تجویز میں ترمیم پیش نہ کی جا سکتی تھی جب تک دس اراکین میں سے چار اس کی تائید نہ کریں۔ شدید ضرورت کے پیشِ نظر تین تقریریں ہو چکنے کے بعد مجلس مزید تقریروں کی ممانعت کر سکتی تھی۔[۲۴۴] تمام معاملات میں اتفاقِ رائے ضروری تھا۔ اگر کوئی فیصلہ کسی رکن کی غیر حاضری میں کیا جاتا تو اس کا اطلاق اس کے محکمے پر بھی ہوتا تھا۔[۲۴۵] جس کا مطلب یہ ہے کہ ذمہ داری مشترک تھی۔

راز داری قائم رکھنے کے لیے پروانے[۲۴۶] میں یہ تاکید ہوتی تھی کہ مجلس کے اجلاس خفیہ ہوں گے۔ اگر کوئی رکن کھلم کھلا یا اشارتاً کارروائی کو فاش کرتا تو اسے مجلس سے اخراج کا سزاوار سمجھا جاتا۔ حکومت سے کسی قسم کے دغا کرنے یا کسی شخص یا اشخاص کی جماعت کے ساتھ رورعایت کرنے کی بھی یہی سزا مقرر تھی۔[۲۴۷]

باغیوں نے جو دستور العمل وضع کیا تھا وہ نہ تو جامع تھا اور نہ کسی جدید حکومت کے اصولوں کے مطابق۔ دستور العمل کی ترتیب تو درکنار، باغیوں کو جمہوری حکومت کا کوئی تجربہ ہی نہیں تھا۔ تاہم بظاہر کارروائی کی بنیاد پنچایتی طریقے پر تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مجلس خاص طور پر ان کے اپنے طبقے کے جمہوری [illegible] کی تسکین کے [illegible] قائم کی گئی تھی۔ اس طبقے کی سماجی، سیاسی تنظیم ہمیشہ روایتی پنچایت تھی۔ ایک [illegible] سم کا [illegible] یاب پروانہ[۲۴۸] مورخہ ۸ راگست ۱۸۵۷ء ان معاملات کی نوعیت کا پتہ دیتا ہے جو مجلس انجام دیتی تھی۔ یہ پروانہ مجلس کے اراکین کے لیے ایک قسم کا اطلاع نامہ تھا کہ وہ مجلس کے خاص اجلاس میں شریک ہوں۔ اس کے ایجنڈے میں شہر دہلی کے مناسب انتظام کا معاملہ، رسد رسانی کا بہتر اہتمام، فوج کی زیادہ مؤثر نگہداشت، ڈاک کی بہتر تقسیم اور مہاجنوں سے قرضے لینے کے معاملات شامل تھے۔ فوج میں ضبط اور قانون کی پابندی، بدعنوانیوں کا انسداد؛ اختیارِ منصبی کا ناجائز استعمال اور جبر ستانی سے متعلق بھی مجلس اکثر احکام اور گشتی چٹھیاں جاری کرتی تھی۔[۲۴۹]

نہ صرف مجلس کے اختیارات کی نوعیت اور حدود وسیع اور جامع تھیں بلکہ مجلس اپنے اختیارات میں کسی قسم کے خارجی اثرات کی مداخلت کبھی گوارا کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ مثلاً فوجی معاملات

گئے۔ بظاہر تمام درخواستیں بادشاہ کو پیش کی جاتی تھیں لیکن تمام معاملات سے متعلق اُن عرضیوں کو دعرائض پر صادر کیے گئے دحکم کے مطابق (مجلس کے سپرد کیا جاتا جو مختارِ کل تھی۔ یہ ایک جماعت تھی جو چند کرنیلوں، ایک برگیڈیر میجر اور ایک سکریٹری پر مشتمل تھی۔ یہ تمام کرنیل وغیرہ ایسے سپاہی تھے جنھوں نے امتیاز حاصل کیا تھا۔[۲۳۵]

شہنشاہ بہادر شاہ کو مجلس کی نشست میں شرکت کا حق حاصل تھا۔[۲۳۶] مجلس کا کوئی فیصلہ شہنشاہ کے دستخط کے بغیر سلطنت میں نافذ نہ ہو سکتا تھا۔ اگر شہنشاہ مجلس کی کوئی قرارداد نامنظور کر دیتا تو مجلس اس پر از سرِ نو غور و خوض کرتی۔[۲۳۷] عملی طور پر البتہ مجلس اپنی مرضی کے مطابق[۲۳۸] فیصلے کرتی اور بادشاہ کو اس پر مہرِ تصدیق ثبت کرنے پر مجبور کرتی۔ جو فوجی کمیشن بہادر شاہ کے مقدمہ کی سماعت کے لیے ۱۸۵۸ء میں خاص طور پر مقرر کیا گیا اس کے سامنے صفائی کا بیان دیتے ہوئے بادشاہ نے کہا: "باغی فوجیوں نے ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جس میں تمام معاملات پر غور و خوض ہوتا تھا اور فیصلے کیے جاتے تھے لیکن میں نے کبھی ان کے اجلاس میں شرکت نہیں کی۔ جہاں تک اُن احکام کا تعلق ہے جو میری مہر اور میرے دستخط کے تحت صادر ہوتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ جس دن سے باغی فوجیں وارد ہوئے اور یورپی افسروں کو ہلاک کر دیا اور مجھے قیدی بنا لیا، اس کے بعد میری حیثیت یہی رہی۔ جو کاغذات وہ مناسب خیال کرتے تیار کر لیتے، میرے پاس لاتے اور ان پر مہر ثبت کرنے کے لیے مجھے مجبور کرتے۔ بعض اوقات وہ احکام کا ناتمام مسودہ لاتے اور میرے سکریٹری سے ان کی نقول تیار کروا لیتے۔ کبھی اصل خطوط بھیجنے کے لیے لاتے اور اُن کی نقول میرے دفتر میں چھوڑ جاتے اس لیے بہت سے مختلف ہاتھوں کے لکھے ہوئے مسودے مسل مقدمہ میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ بسا اوقات وہ کورے لفافوں پر میری مہر لگوا لیتے۔ نہ تو مجھے خطوط کے مضامین کا علم ہوتا اور نہ ہی یہ کہ وہ خطوط کس کس کو بھیجے جا رہے ہیں۔ چونکہ میری زندگی خطرے میں تھی اس لیے میں اس معاملے میں کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔ انھوں نے میرے ملازموں اور بیگم زینت محل پر یہ الزام لگایا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ سازش میں شریک ہیں۔ انھوں نے ملازموں کو قتل کرنے کی بھی دھمکی دی اور مجھ سے تقاضہ کیا کہ بیگم کو بطور یرغمال ان کے حوالے کر دوں۔[۲۳۹]

ایک موقع پر بہادر شاہ اتنے بیزار اور بے بس ہو گئے کہ انھوں نے شہنشاہیت کے لقب کو ترک کرنے کا ارادہ کیا جو انکار و آلام سے معمور ہے تاکہ وہ باقی ایام عبادت میں بسر کر سکیں۔[۲۴۰] ایک بار اس نے ہیرا نگل کر خودکشی کرنے کی دھمکی دی۔[۲۴۱]

گفت وشنید کرنے کی کوشش کی۔۲۵۴

مجلس انتظامیہ اعلیٰ عدالت بھی تھی۔ یہ عدالتیں قائم کرتی، ججوں کا تقرر عمل میں لاتی اور دیوانی اور فوجداری مقدمات کے لیے عدالتی ضابطے وضع کرتی۔ پولیس افسروں اور دیوانی ملازموں کی تقرری بھی مجلس ہی کرتی۔ یہ ملازم مجلس کے سامنے جوابدہ ہوتے تھے اور مجلس ان کو موقوف بھی کرسکتی تھی۔۲۵۵ اس نے رشوت خوری اور بد دیانتی ختم کرنے کی کوشش کی اور اس نے یہ کام بڑی سختی کے ساتھ انجام دیا۔ عوام اختیارات کے ناجائز استعمال اور جبر وستم کے تمام واقعات کے خلاف مجلس سے دادخواہی کرسکتے تھے۔۲۵۶

مالیات کے معاملے میں بھی مجلس مختارِ کل تھی۔ افسرانِ مال کو بھی صرف مجلس ہی متعین اور موقوف کرسکتی تھی۔۲۵۷ لگان آراضی، دوسرے ٹیکس اور محصول وصول کرنے کا اختیار بھی اسے حاصل تھا۔۲۵۸ مجلس کے سوا کسی کو قرض لینے کا اختیار نہیں تھا۔ افسروں کو اگر کہیں سے رقم فراہم کرنے کا کوئی پروانہ ملے تو اُسے فوراً مجلس کے پاس بھیج دیں۔ ان کو یہ بھی ہدایت کی گئی تھی کہ مجلس کے حکم کے بغیر کسی اُس شخص کو گرفتار نہ کریں جو قرض دینے سے انکار کرے۔۲۵۹ ایک بار جب مرزا سلطان خضر نے اپنے طور پر روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کی تو مجلس نے سختی کے ساتھ احتجاج کیا اور شہنشاہ سے کہا کہ وہ شہزادوں کو اس سے باز رکھنے کی تنبیہ کریں۔۲۶۰ شہنشاہ نے مرزا مغل کی اس تجویز کو منظور کرنے سے انکار کردیا کہ مجلس کے ایجنٹوں کی بجائے شاہی خاندان کے افسروں کو روپیہ وصول کرنا چاہیے۔ حالانکہ مرزا مغل نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ اس سے زیادہ روپیہ وصول کرنے میں مدد ملے گی۔۲۶۱ شہنشاہ نے مرزا کو یاد دلایا کہ مجلس ہی اس معاملے میں مختارِ کل ہے۔۲۶۲

اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرض حاصل کرنے کے معاملے میں مجلس بری طرح ناکام ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ جائداد طبقے باغیوں کے قرض مانگنے اور جاگیرداری کو ختم کرنے کی بدعت سے بہت خوفزدہ تھے۔۲۶۳ کسان فوجی اپنی طبقاتی خصوصیت کے سبب زمین کو قومی ملکیت قرار دینے کے تصور کو گوارا نہ کرسکتے تھے۔ مہاجنوں نے سوائے مجبوری کی حالت کے روپیہ دینے سے انکار کردیا۔ تھوک فروشوں اور خوردہ فروشوں نے بھی نئی حکومت کو اپنا مال ادھار دینے سے انکار کردیا کیونکہ انھیں حکومت کے دیوالیہ اور ناپائیدار ہونے کا یقین تھا۔ یہ لوگ کسی قدر حق بجانب بھی تھے کیوں کہ مجلس شہر میں امن امان بحال کرنے میں ناکام ہوچکی تھی۔۲۶۵ ذخیرہ اندوزی، نفع خوری اور سیاہ بازاری نے لوگوں کا ناک میں دم کردیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مجلس نے ...

میں نہ شہنشاہ کو کوئی موثر دخل حاصل تھا اور نہ شہزادوں کو۔ شہنشاہ نے ایک خط مورخہ ۲۶ جون ۱۸۵۷ء میں اپنے بیٹے مرزا مغل سے شکایت کی ہے: "پہلے کچھ فوجیوں نے حیات بخش اور مہتاب باغات میں ڈیرہ ڈال لیا تھا۔ ان کے قیام کے دوران ان باغات کو نقصان پہنچا۔ ہمارے حکم کی تعمیل میں وہ فوجی رخصت ہوئے لیکن اب پھر لگ بھگ دو سو فوجی وہاں قیام پذیر ہیں۔ اس لیے ہم تمہیں ہدایت کرتا ہوں کہ مجلس کے اراکین سے بات چیت کر کے ان کو وہاں سے نکلوا دو۔" ایک اور موقع پر بہادر شاہ نے اس بات پر تاسف کا اظہار کیا کہ فوجی افسر بدتمیزی سے پیش ہو کر اور آداب شاہی کی پروا نہ کرتے ہوئے دربار میں آ دھمکتے ہیں۔ وہ گھوڑوں کو سرپٹ دوڑاتے ایسے مقامات میں داخل ہو جاتے ہیں جہاں نہ نادر شاہ، نہ احمد شاہ ابدالی اور نہ کوئی برطانوی گورنر جنرل گھوڑے پر سوار ہو کر کبھی وارد ہوا تھا۔ "کیا فوج ملک کی بہبودی کی خواہاں ہے؟"[۲۵۱] آخری مغل تاجدار نے یہ کلمات مایوسی کے عالم میں بے ساختہ کہہ گئے۔

شہزادوں کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ ان کا مطلق کوئی اثر و رسوخ نہ تھا۔ درحقیقت خودسر اور گستاخ فوج کے ہاتھوں ان کی امیدیں قدم قدم پر خاک میں مل رہی تھیں۔ مرزا مغل نے جو ولی عہد سلطنت اور جنرل بخت خاں کی آمد تک باغی فوج کا سپہ سالار اعظم تھا، ۱۴ جولائی ۱۸۵۷ء کے دن بہادر شاہ کو لکھا: "بادشاہ سلامت اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ محمد بخت خاں کی آمد سے پہلے جنگ کے عملی اقدامات میرے ہاتھوں اور میری ہدایت پر انجام دیے جاتے تھے۔ آج جب میں دشمن پر حملہ کرنے کے لیے اپنے فوجی دستوں کے ساتھ شہر سے باہر گیا تو وہ مرزا احمد ہوا اور سپاہیوں نے فوج کو بے حرکت کھڑا کیے رکھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ حکم کس نے دیا۔ پھر اس نے حکم دیا کہ سالار کی اجازت کے بغیر فوج آگے نہ بڑھے۔ بالآخر اس نے ہمیں لوٹنے پر مجبور کر دیا۔"[۲۵۲]

جو کشمکش مرزا مغل اور جنرل بخت خاں کے درمیان پیدا ہوئی اور سالاروں کے جھگڑے ہوتے ہوئے ایک حد تک پہنچ گئی محض ذاتی خصوصیت نہ تھی۔[۲۵۳] درحقیقت اب شہزادوں کو بہادر شاہ کی تائید مطلق [illegible] جو قدرت، تنازع اور مخالفت ولی عہد سلطنت اور انقلاب پسند جنرل کے درمیان [illegible] [illegible] ہو [illegible] اور [illegible] کی [illegible] سے [illegible] [illegible] کو [illegible] [illegible] اور اس [illegible] کے دوران [illegible] ہو گیا [illegible] شہزادوں کو اپنی خطرناک صورت حالات کا احساس ہونے لگا اور افسوس [illegible]

خطرات سے پُر تھے۔[273] باغی فوجی اپنے کمانڈروں کی پروا نہ کرتے اور اپنی من مانی کرتے تھے۔[274]

۶۔ طبقات کا رول

اعلیٰ طبقوں کے لوگ فوجیوں میں جمہوری سپرٹ کی ترقی سے دہشت زدہ تھے۔ بغاوت کے نتائج پر انھیں شک ہونے لگا اور بغاوت کا پہلا ریلا ختم ہونے کے بعد ان کا جوش جاتا رہا۔ بغاوت کے دوران اعلیٰ طبقات بالخصوص تعلقداروں، زمینداروں اور ساہوکاروں کے بدلتے رویے سے یہ چیز ظاہر ہے۔ بغاوت کے پہلے دور میں (جو لگ بھگ جولائی ۱۸۵۷ء کی پہلی تاریخ کو ختم ہوا یعنی جس دن دہلی میں مجلسِ انتظامیہ قائم کی گئی) "تمام تعلقدار اپنے نوکروں کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی مدد سے انھوں نے ان لوگوں کو جبراً بے دخل کر دیا جنھیں ان کی جائدادیں بخش دی گئی تھیں۔"[275] ہنری سینٹ جارج ٹکر نے گورنر جنرل کے نام ایک خط میں صورتِ حال کو یوں بیان کیا: "تمام زمیندار اور نیلام شدہ زمینوں کے خریدار شل ہو چکے ہیں اور جائدادوں سے محروم کر دیے گئے ہیں ان کے ایجنٹوں کو اکثر قتل کر دیا جاتا ہے اور ان کی جائدادوں کو تباہ کر دیا جاتا ہے۔"[276]

لیکن برطانوی حکومت کے ختم ہونے کے ساتھ آزادی کے تصور کی شکل ظاہر ہونا شروع ہوئی۔ سپاہیوں اور عوام نے بھی زمینوں پر قبضہ کرنا، شہروں کو لوٹنا اور سرکاری دستاویزات اور ملکیت کی دستاویزیں تباہ کرنا شروع کر دیں۔[277] ایسے ہی ایک موقع پر بہار کے باغیوں کے راہنما کنور سنگھ نے جو خود ایک بڑا زمیندار تھا، اپنے پیروؤں کو ان بدعنوانیوں سے باز رکھنے کے لیے یہ دلیل دی کہ "ملک سے انگریزوں کے نکالے جانے کے بعد لوگوں کے حقوق کا کوئی ثبوت نہ رہے گا اور واجب الادا رقموں کی مقدار معلوم کرنے کے لیے کوئی دستاویزی شہادت نہ ملے گی۔"[278]

بہر حال مسلح عوام اکثر اپنے علاقوں کے آقا بنے ہوئے تھے اور جب چاہتے امیروں کی دولت چھین لیتے۔[279] مارک تھارن ہل لکھتا ہے کہ "ہر دکان نہ صرف لوٹ لی جاتی بلکہ تباہ بھی کر دی جاتی۔ دروازے اکھیڑ دیے جاتے، برآمدوں کو مسمار کر دیا جاتا، فرش کھود دیے جاتے اور دیواروں میں بڑے بڑے شگاف پیدا کر دیے جاتے۔ جو کچھ اٹھائے جانے کے قابل تھا دیہات میں پہنچ گیا، باقی گلیوں میں بکھرا پڑا رہا۔ سڑکیں، فرش اور برآمدوں کے ملبے کے علاوہ پھٹے ہوئے بہی کھاتوں، ٹوٹی بوتلوں اور مرتبانوں اور صندوقوں کے ٹکڑوں سے اٹی پڑی تھیں۔"[280] وہ تمام لوگ جنھیں نقصان اٹھانا پڑا، سپاہیوں کو کوستے تھے۔[281] بقول سرسید

معاشی تباہی سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس نے قیمتوں کو مقرر کرنے اور ان پر قابو پانے کی کوشش کی۔[۲۶۶] لیکن راشن سسٹم، اشیائے خورونوش کی یقینی رسد اور پائدار نظم ونسق کے نہ ہونے کی وجہ سے قیمتوں پر قابو پانے میں کامیابی نہ ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔

ضرورت نے مجلس کو بھاری اور من مانے ٹیکس لگانے پر مجبور کر دیا لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ٹیکسوں کا بوجھ اُن طبقات پر پڑا جو ادا کر سکتے تھے۔[۲۶۷] ٹیکس کے اقدامات کا عام آدمی پر کوئی اثر نہ پڑا بلکہ مجلس نے اُسے امداد دینے کی کوشش کی۔ اس نے زمینداری نظام کو ختم کرنے اور اصلی کاشتکار کو حقِ ملکیت دینے کے احکام صادر کیے۔[۲۶۸] مجلس کے ان احکام سے ظاہر ہے کہ اس نے تشخیصِ لگان کے طریقے میں مکمل اصلاح کا ارادہ کیا تھا لیکن اس کی حکومت تھوڑی دیر رہی اور یہ کام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔

ایسی ہی مجلسِ انتظامیہ لکھنؤ میں بھی قائم کی گئی تھی۔ دہلی کی طرح لکھنؤ کے باغیوں نے بھی اودھ کے سابق بادشاہ کے حقیقی بیٹے برجیس قدر کو تاج پہنایا۔ اس کے تخت نشین ہونے اور نواب وزیر اودھ بننے کے بعد۔ کیوں کہ اس کی حکومت شہنشاہ دہلی کے تحت تھی۔ اختیارات کی باگ ڈور اس کی ماں اور ممّوں خاں کے ہاتھ میں تھی اور یہ دونوں فوجیوں کے رحم و کرم پر تھے انھیں کی وجہ سے یہ برسرِ اقتدار تھے۔[۲۶۹]

درحقیقت اصلی طاقت ایک وزیر اور مجلسِ انتظامیہ کے ہاتھ میں تھی۔[۲۷۰] مجلس بادشاہ کے مقتدر خدام، اس علاقے کے راجاؤں اور بڑے زمینداروں اور فوج کے خود ساختہ اعلےٰ عہدیداروں پر مشتمل تھی۔ مجلس اس بات پر غور وخوض کرتی تھی کہ انگریزوں کے خلاف کس طرح اقدامات کیے جائیں۔ اس کا اپنا سپہ سالارِ اعظم تھا۔ پہلے سابق بادشاہ کا سالار حشمت الدولہ سپہ سالار اعظم کے عہدے پر فائز تھا۔ مجلس نے مختلف ڈیوژنوں کے جنرل، بریگیڈیر اور کرنل مقرر کیے تھے۔ بظاہر یہ ایک ایسی فوج تھی جس کی اچھی طرح تنظیم کی گئی تھی۔[۲۷۱] درحقیقت سپاہی خود اپنے افسروں کا اور افسر اپنے کمانڈروں کا بادشاہ کے نام پر انتخاب کرتے تھے۔ اور اگر جیسا کہ اکثر ہوتا تھا، وہ بہادر سپاہیوں کو ناراض کر بیٹھتے تو بحث و مباحثہ کے لیے سپاہی فوراً ایک جلسہ منعقد کرتے۔ اس جلسے کے اختتام پر انھیں عام طور پر عہدے سے معزول یا قتل کر دیا جاتا۔[۲۷۲] غرضیکہ نئے عہدیداروں کے ساتھ عزت کا سلوک نہیں تھا اور افسروں کو سپاہیوں کی وہ تابعداری حاصل نہیں تھی جو ایک منضبط فوج کے افسر کو حاصل ہوتی ہے۔ چند اعلیٰ عہدوں کو چھوڑ کر باقی عہدے،

وقت تک دہلی، لکھنؤ، کانپور، بنارس اور الہ آباد میں باغیوں کو شکست ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ وہ اندرونی اختلافات اور اقتصادی بحران کی وجہ سے بھی کمزور ہو چکے تھے اس لیے تعلقہ داروں کے دلوں سے یہ خوف جاتا رہا کہ اگر وہ انگریزوں کے خلاف غاصب عوام کا دل و جان سے ساتھ دیں گے تو ان کا روایتی معاشی اور سماجی ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔

اعلان کے خطرناک نتائج کو بھانپتے ہوئے سر جارج کیمپ بیل نے جو ایک ممتاز سیویلین تھے سرکار کو اس اعلان کی تعمیل نہ کرنے کا مشورہ دیا بلکہ اس کے برعکس اس نے اس بات پر زور دیا کہ "گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط" کے مصداق تعلقہ داروں کی دلجوئی کی جائے کیونکہ سرہنری لارنس کی نرم پالیسی سے متاثر ہو کر ان میں سے بعضوں نے لکھنؤ کی ریذیڈنسی کو اشیائے خورد و نوش بہم پہنچائی تھیں اور اودھ میں بغاوت پھوٹنے کے بعد انگریز بھگوڑوں کی مدد کی تھی۔[۲۹۷] جنرل اوٹرام نے گورنر جنرل سے کہا کہ وہ تعلقہ داروں کو "باعزت دشمن" سمجھیں اور انھیں زمین کی بحالی کا یقین دلائیں۔ اس نے لارڈ کیننگ کو تنبیہ کی کہ اگر تعلقہ داروں کو صرف جان بخشی اور قید سے آزادی کی پیشکش کی گئی تو وہ مایوسی کے عالم میں گوریلا جنگ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جس سے ہزاروں فرنگیوں کو جنگ، بیماری اور خطروں کا شکار ہونا پڑے گا لیکن اگر انھیں زمین کی بحالی کا یقین دلا دیا جائے تو وہ امن و امان کے کام میں اپنے اثر و رسوخ سے کام لے کر سرکار کی مدد کریں گے۔[۲۹۸] صورتِ حال کافی نازک تھی اس لیے جاگیردار سرداروں کے دل جیتنے کے لیے لارڈ کیننگ جنرل اوٹرام کی تجویز کو قبول کرنے پر مائل ہو گئے۔ اس نے تعلقہ داروں کو مناسب سلوک کا یقین دلایا۔ اس کا فوراً خاطر خواہ نتیجہ نکلا۔ ۲۲ اکتوبر ۱۸۵۸ء کو جب اودھ میں ابھی بغاوت زوروں پر تھی، بیگم اودھ کا وکیل برطانوی کمانڈر انچیف کے ڈیرے میں یہ پوچھنے گیا کہ صلح کی کیا شرائط ہو سکتی ہیں۔ تمام راجے اور تعلقہ دار جو ابھی بھاگے ہوئے تھے اسی قسم کے پیغامات کے ساتھ اپنے اپنے نمائندے پہلے ہی بھیج چکے تھے۔

اس لیے بغاوت کے بعد "نہ صرف تعلقہ داروں کی جائدادیں بحال ہو گئیں بلکہ بہتوں کو حکومت کی طرف سے اتنے زیادہ حقوق حاصل ہو گئے جن کو انھوں نے خود کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی وعدہ کیا گیا کہ ان حقوق کو برقرار رکھا جائے گا۔"[۳۰۰] بغاوت کے بعد الحاقِ اودھ[۳۰۱] کے وقت رائج حقِ ملکیت کے مطابق زمین کا لگ بھگ دو تہائی حصہ بڑے زمینداروں کے قبضے میں چلا گیا۔[۳۰۲] یہ بغاوت کے ساتھ غداری کرنے کا صلہ تھا جو تعلقہ داروں کو دیا گیا۔ کہاں تو ان کی جائداد

باغی اکثر وہ لوگ تھے جو قلاش اور محکوم تھے، حکمران طبقے سے ان کا تعلق نہیں تھا اس لیے اعلیٰ طبقوں کے لوگ بغاوت کی ناکامی سے زیادہ بغاوت کی کامیابی سے خوفزدہ تھے اُن کا خیال یہ تھا کہ اگر بغاوت کامیاب ہوئی تو ان کی تباہی کا زیادہ امکان تھا۔" ان میں سے اکثر کافی سوجھ بوجھ رکھتے تھے اور وہ بھانپ گئے کہ باغیوں کا ساتھ دینے سے ان کا مقصد حاصل نہ ہوگا۔"[283] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کے محاصرے کے دوسرے ہفتے کے بعد باغیوں کو اودھ کے تعلقداروں سے مزید کمک نہیں ملی۔[284]

جب عام لوگ بغاوت کے لیڈر بن کر سامنے آئے تب ۱۷ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جنرل اوٹرام کو علم ہوا کہ "نہایت طاقت ور اور اکثر متوسط درجے کے لوگوں میں اودھ کا ایک بڑا اور بارسوخ طبقہ رئیسوں اور زمینداروں کا ہے جو واقعی ہماری حکومت کے قیام کا خواہاں ہے۔"[285] لفٹنٹ جنرل میکلوڈانس کو اس بات کا یقین تھا کہ "غدر میں ان میں سے بیشتر کی شرکت محض برائے نام تھی۔"[286] بعضوں نے اپنی "مسلح غیر جانبداری"[287] کو قائم رکھا جب کہ کئی دوسروں نے "باغیوں کے مطالبے پر کمک بھیج دی اور خود شریک نہیں ہوئے۔"[288] پھر کچھ اور بھی تھے جنھوں نے برطانوی حکام کو باغیوں کی نقل وحرکت اور ان کی بارود گولے کی کمی سے آگاہ کیے رکھا۔[289] بعض تعلقداروں اور بنیوں نے برطانوی فوج کو ضروریاتِ زندگی بھی بہم پہنچائیں۔[290] اور بھاگے ہوئے برطانوی سپاہیوں کو پناہ بھی دی۔[291] کے لکھتا ہے۔ "جب شورش عروج پر تھی بعض طاقتور راجاؤں نے یا تو انگریزوں کا ساتھ دیا یا مصلحتاً غیر جانبدار رہے کیوں کہ ان کا مفاد امن وامان کے قیام میں تھا۔"[292] ہومز لکھتا ہے: "اگرچہ بارسوخ زمینداروں کے تمام طبقے میں سے بعضوں نے بلاشبہ ہماری عملی مخالفت کی لیکن ان کی ایک اچھی خاصی تعداد خاموش اور وفادار رہی اور چند ایک جوانمردی کے ساتھ میدان میں کود پڑے اور بغاوت کے سیلاب کو روکنے میں انھوں نے اپنے اثر ورسوخ سے کام لیا۔"[293] جنرل اوٹرام کو اس امر کی کوئی قطعی شہادت نہ مل سکی کہ کیننگ کے ۲۰ مارچ ۱۸۵۸ء کے اعلان کے اجراء سے پہلے کسی تعلقہ دار نے بذاتِ خود باغیوں کی طرف سے معرکہ آرائی کی ہو۔[294]

البتہ کیننگ کے اعلان کی اشاعت کے بعد اس کے بالکل برعکس "تعلقہ داروں کے گروہ کے گروہ باغی ہو گئے۔"[295] اعلان کے مطابق صوبے کی تمام زمینیں ضبط کر لی گئی تھیں سوائے چھ خاص اشخاص کی زمینوں کے یا اُن لوگوں کی زمینوں کے جو ثبوت کے ساتھ سرکار کی تسلی کر سکتے تھے کہ بغاوت کے دوران وہ وفادار رہے ہیں۔[296] بغاوت کے اس جبری فیصلے کا ایک سازگار پہلو یہ تھا کہ اس

۲۰ اگست کے دن شہر کے ساہوکاروں نے فیصلہ کیا کہ سپاہیوں کی مزید جبری وصولیوں کی مشترکہ طور پر مزاحمت کی جائے۔[214] جب عدم ادائیگی[215] کے سبب دکانداروں نے اشیائے خوردونوش بیچنے سے انکار کر دیا اور سپاہی فاقہ کشی پر مجبور ہو گئے تو انھوں نے اندھا دھند لوٹ مار شروع کر دی[216] بلکہ سارے شہر کو تباہ و برباد کرنے کی دھمکی دی۔ سپاہی بیسیوں ساہوکاروں، تاجروں، سابق درباریوں اور شہزادوں کو ان سے روپیہ اینٹھنے کی روزانہ کوشش میں دھمکی دینے لگے۔[217]

صاحبِ جائداد طبقوں نے سپاہیوں کے ساتھ برضا و رغبت تعاون کرنا ترک کر دیا اور وہ صرف ناچار ہو کر مدد کرتے تھے اور وہ بھی صرف جان و مال بچانے کی حد تک۔ انھوں نے اپنی دولت زمین کے نیچے گاڑ دی اور عدم ادائیگی کے سبب اشیائے خوردونوش بہم پہنچانے سے انکار کر دیا۔[219] ۳۰ اگست کے دن محکمہ رسد کے افسرِ اعلیٰ دولالی مل نے رپورٹ کی کہ آیندہ وہ فوجیوں کو راتب مہیا کرنے سے قاصر ہے۔[220] اگلے دن ملاہی لال متھریدی نام کے ایک ٹھیکیدار نے درخواست پیش کی کہ اب مزید گندھک خریدنا ممکن نہیں اور بارود کی تیاری کو موقوف کرنا ہوگا۔[221] اعلیٰ طبقوں کو یقین ہو گیا کہ جن باغیوں نے لوٹ کے مال سے گھر بھر لیے ہیں وہ نہ تو شہر کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی حفاظت کر سکتے ہیں۔"[222] وہ صرف امیر بننے کے لیے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔[223] شہری آبادی یعنی دکاندار، خوردہ فروش اور دوسرے دولت مند طبقے جنگ کے ہولناک مصائب اور لاقانونی کے سبب بھیانک قلت اور تنگ دستی کو بُری طرح محسوس کرنے لگے۔"[224] فریڈرک کوپر نے لکھا: "ایک مسلمان نامہ نگار سے اس عظیم کوشش کا پتہ چلتا ہے جو مفتی صدرالدین، حکیم احسن اللہ خاں، مرزا الٰہی بخش اور بیگم زینت محل انگریزی سرکار کے ساتھ صلح کی خاطر کرنے پر آمادہ ہیں۔ بادشاہ، امراء اور بیگناہ اور بے بس اہالیانِ دہلی کے لیے خاص طور پر رحم کی درخواست کی گئی ہے۔"[225]

بنگال میں بھی یہی داستان دہرائی گئی۔ زمیندار عملاً انگریزوں کے وفادار رہے۔ ان کی وفاداری کا سبب سمجھنا دشوار نہیں۔ بغاوت کے دوران بہار (جو اس وقت صوبہ بنگال کا حصہ تھا) کے کسان نہ صرف انگریزوں کی بلکہ زمینداروں اور ان کے ایجنٹوں کی کھلم کھلا مخالفت پر اُتر آئے۔ جو عرضداشت بنگالی زمینداروں نے دسمبر ۱۸۵۷ء میں گورنر جنرل کے نام بھیجی اس میں بیان کیا گیا ہے کہ "ہم نے اپنے مفاد کو اس قدر حکمرانوں کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے کہ بغاوت کے ہر محاذ پر ہمیں انھیں مظالم کا نشانہ بنایا جاتا ہے جو باغیوں اور ان کے گمراہ ہموطنوں نے ان انگریزوں پر روا رکھے ہیں جو ان کے ہاتھ لگے ہیں۔[226]

ضبط کی جارہی تھی اور کہاں اب انھیں اس سے بھی زیادہ ملا جس کا انھوں نے مطالبہ کیا تھا چنانچہ یہ کوئی حیرت کی بات نہیں کہ "بڑے بڑے زمینداروں اور دیہات کے معزز لوگوں نے برطانوی فوجوں کا پُرتپاک خیر مقدم کیا۔"[۲۰۲]

دہلی میں بھی ویسی ہی حالت تھی۔ مغلیہ دارالسلطنت میں داخل ہونے اور بہادر شاہ کے رسمی طور پر شہنشاہِ ہند ہونے کا اعلان کرنے کے بعد باغیوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ ایک برطانوی جاسوس[۲۰۴] رجب علی کی مختصر رپورٹ یہ تھی: "کامل افراتفری اور فتنہ و فساد کا دور دورہ ہے۔" نواب معین الدین اس کی تصویر یوں کھینچتا ہے:[۲۰۵] "وہ شہنشاہ کو توہین آمیز کلمات کے ساتھ مخاطب کرتے جیسے: 'ارے بادشاہ! ارے بڈھے!' ایک اسے ہاتھ سے پکڑ کر چیختے ہوئے کہتا: "سنو!" دوسرا اس کی داڑھی کو چھو کر کہتا: 'میری بات سنو' ان کے اس وطیرے پر بادشاہ کے تن بدن میں آگ لگ جاتی لیکن ان کی بدتمیزی کو روکنے میں بے بس تھا اس لیے وہ اپنے نوکروں چاکروں کے سامنے اپنے مصائب اور بدبختی کا رونا رو کر اپنے دل کا غبار ہلکا کر لیتا۔ وہ لوگ جو پہلے انکساری کے ساتھ اس کے احکام بجا لا کر خوش ہوتے تھے، اب انھیں بادشاہ کی توہین کرنے اور ہنسی اڑانے میں عار نہ تھی۔"[۲۰۶] اس کی بیگم کو کئی بار گرفتاری کی دھمکی دی گئی۔ اس کے بیٹوں کو باغیوں کی ہاں میں ہاں ملانی پڑتی اور شاہی طبیب کو باغیوں نے سچ مچ قید کر دیا۔[۲۰۷] اس سے تنگ آ کر اس نے سپاہیوں کو شہر سے نکل جانے کا حکم دیا۔[۲۰۸] جب اس کی التجائیں کسی نے نہ سنیں تو اس نے انگریزوں کے ساتھ گفت و شنید کرنے کا فیصلہ کیا لیکن ایسا کرنے میں اپنے آپ کو بے [illegible] پایا۔ یہ ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کا واقعہ ہے۔[۲۰۹] وہ عجیب شش و پنج میں تھا۔ کبھی وہ فقیری اختیار کرنے کی سوچتا اور کبھی یہ کہ جے پور، جودھ پور، بیکانیر اور الور کے راجاؤں کے حق میں شہنشاہی اقتدار سے دست بردار ہو جائے۔ "سلطنت کے اہم معاملات کی تنظیم اور انجام دہی کے لیے وہ کسی پر بھروسہ نہ رکھ سکتا تھا۔"[۲۱۰] جب چاروں حکمرانوں سے مناسب جواب حاصل کرنے میں ناکام رہا تو شہنشاہِ ہند بہادر شاہ نے شرائط صلح پر گفت و شنید کے لیے برطانوی کیمپ میں اپنے نمائندے بھیجے۔[۲۱۱]

جب شہنشاہِ ہند کی یہ حالت تھی تو جاگیرداروں اور سود خور طبقوں کی حالت بخوبی تصور کی جا سکتی ہے۔ اپنی جائداد کو لٹنے اور بربادی سے بچانے کے لیے انھوں نے "ماہانہ رقم کی ادائگی سے ایک رجمنٹ کی مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔"[۲۱۲] بعد میں انھوں نے لوٹ مار اور تشدد سے حفاظت کے لیے ایک پرائیویٹ پولیس دستہ تیار کیا۔[۲۱۳] لیکن جلد ہی یہ انتظامات بھی ناکام ہو گئے۔

میں کئی بار شکار ہوئے ہیں۔ گذشتہ غدر میں انھوں نے باغیوں کے ہاتھوں فرنگیوں کے ساتھ برابر بلکہ کئی حالتوں میں ان سے زیادہ مصائب جھیلے۔ ان تاجروں کے ذریعے ہم نے سب کچھ حاصل کیا جس کی ہمیں فوجی کوچ کے وقت ضرورت تھی۔[۲۳۵]

انگریزی کی تعلیم پانے والے ہندوستانیوں اور مقامی حکام نے عام طور پر بغاوت میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ اول الذکر "ہر موقعہ پر انگریزوں کے وفادار" رہے[۲۳۶] جب کہ موخر الذکر ہنگامے کی ساری مدت کے دوران "مردانہ وار اپنے منصب پر ڈٹے رہے"[۲۳۷] بغاوت سے ان کی مخالفت ذاتی غرض پر مبنی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ اگر بادشاہی حکومت[۲۳۸] از سر نو قائم ہو گئی تو انھیں موقوف کر دیا جائے گا۔ فارسی زبان سے ناواقفیت، مشرقی رسوم و آداب سے ناآشنائی اور پھر اعلیٰ طبقے سے متعلق نہ ہونے کی وجہ سے انھیں اس سماجی اور سیاسی نظام میں کوئی مقام حاصل نہ ہوگا۔

بغاوت کو دو سال کی قلیل مدت میں کچل دیا گیا۔ صاحبِ جائداد طبقوں کی غداری کے سبب اسے دبانا آسان ہو گیا۔ اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر انھوں نے آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے کو قربان کر دیا۔ والیانِ ریاست میں سے کسی نے بھی بغاوت میں شرکت نہ کی کیوں کہ لارڈ کیننگ نے صدقِ دل کے ساتھ انھیں متبنّیٰ بنانے کے دائمی حق کی ضمانت دی۔[۲۳۹] راجاؤں اور رانیوں میں سے صرف جھانسی کی لکشمی بائی نے انگریزوں کے خلاف لڑ کر اپنی جان قربان کی۔ اگرچہ وہ مارچ ۱۸۵۸ء میں انگریزوں کے خلاف میدانِ جنگ میں کود دی ــــ یہ بھی صرف اس وقت جب وہ انھیں اس بات کا یقین دلانے میں ناکام رہی کہ بغاوت یا جھانسی کے قتلِ عام کے ساتھ کسی طرح بھی اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔[۲۴۰] بہادر شاہ بھی مجبوری میں لڑا۔ ناناصاحب نے انگریزوں کے خلاف اس لیے معرکہ آرائی کی کہ وہ فوجیوں کے ہاتھوں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا تھا۔[۲۴۱] عہدِ برطانیہ اور اس سے پہلے کے زمیندار، تاجر، ساہوکار، پڑھا لکھا متوسط طبقہ اور دیسی حکام، سبھی نے انگریزوں کا ساتھ دیا یا حالات سے مجبور ہو کر بادلِ ناخواستہ غیر جانبدار رہے۔ ان کی نگاہ میں اس وقت انگریز ان کے نجات دہندہ تھے جب کہ ہندوستانی کسان غیر ملکیوں اور جاگیرداروں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا کر لڑ رہے تھے۔ غرضیکہ شروع میں بغاوت کی تنظیم اس لیے کی گئی تھی تاکہ انگریزوں سے پہلے کی قدیم معیشت کو بحال کیا جائے جو "مشرقی ممالک میں شخصی حکومت کی مستحکم بنیاد رہی تھی۔"[۲۴۲] لیکن آخر میں بغاوت ملکی زمینداری اور غیر ملکی سامراج کے خلاف کسانوں کی جنگ بن گئی۔

فسادزدہ علاقوں کے دیہات اور قصبات میں چالاک تاجروں اور حریص ساہوکاروں نے کمپنی کی حکومت کی حتی الامکان امداد کی کیوں کہ انھوں نے برطانوی ضابطہ قانون اور زمینداری نظام کے تحت خوب دولت کمائی تھی۔ وہ باغیوں کی مدد صرف اس وقت کرتے تھے جب ہاتھ کھینچنا ناممکن ہوتا۔[۲۲۷] ان کا خیال تھا کہ باغیوں کی فتح کا مطلب قدیم دیہاتی معاشرت کی بحالی تھا۔ جس میں ان کے لیے کوئی جگہ نہ ہوگی۔[۲۲۸] اس لیے وہ قانون اور امن کی بحالی اور روز مرہ تجارت کے سابقہ طریقوں کے خواہاں تھے اور یہ صرف برطانوی حکومت کے تحت ہی ممکن تھا۔ تھارن ہل کا یہ قول کہ "سوائے بنیوں کے جنھوں نے افراتفری سے نقصان اٹھایا، سبھی طبقے اس اُتھل پُتھل سے خوش تھے"[۲۲۹] صورتِ حال کا اجمالی بیان ہے۔ "کے نے ان تجارت پیشہ طبقات کے اظہارِ مسرت میں حد درجہ خلوص پایا جنھیں عام طور پر ان ہنگاموں میں فائدے سے زیادہ نقصان ہوا تھا۔"[۲۳۰]

ساحلی اور غیر متاثرہ علاقوں میں تاجروں اور ساہوکاروں نے عملی طور پر انگریزوں کی امداد کی۔ وہ سُن چکے تھے کہ "آزاد شدہ" علاقوں میں تھوڑی ہی مدت میں کئی بار ان کے طبقے کے لوگوں کی جائدادیں چھن چکی ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ خواہ جاگیردار سرداروں کے جھنڈے تلے بغاوت کامیاب ہو یا باغی فوجیوں اور کنگال کسانوں کی قیادت میں، ہر حالت میں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اقتصادی اعتبار سے مٹ جائیں گے۔ "بنیوں اور دیسی ٹھیکیداروں نے کبھی بھی کمپنی کی حکومت کی قوت میں اعتماد نہ کھویا بلکہ ہمیشہ یہ کہتے کہ "صاحب! تھوڑی دیر کی بات ہے۔ یہ باغی منہ کی کھائیں گے کیونکہ کمپنی کی طاقت زبردست ہے۔"[۲۳۱] ہومز کے بیان کے مطابق: "تجارت پیشہ اور دکاندار طبقات جانتے تھے کہ ان کی عزت اور خوشحالی کا مدار پُرامن حکومت کے قیام پر ہے اور اگر حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی گئی تو لاقانونیت پھیل جائے گی جس میں انھیں تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے وہ سرکار کے اگر وفادار نہیں تو کم از کم مستقل حامی ضرور تھے۔"[۲۳۲] وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کے زوال کی افواہوں پر مطلق کان نہ دھرتے۔[۲۳۳] اور قدم بوسی اور خدمت کی پیش کش میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر وفاداری کا اظہار کرتے۔[۲۳۴]

پارسیوں نے جو اکثر تاجر تھے، انگریزوں کی ایک اور سبب سے بھی امداد کی۔ ٹیماس لکھتا ہے کہ "اگر وہ دولت مند ہیں تو کسی ہندو یا مسلمان کے طفیل نہیں، اگر وہ ملک میں کسی دوسری قوم کی نسبت انگریزوں کی طرف زیادہ مائل ہیں تو اس وجہ سے کہ برطانوی انصاف پروری اور قانون نوازی انھیں غارت گری اور جور و ستم سے بچاتی ہے جس کے وہ دوسری حکومتوں کے دور

انفیلڈ رائفل کے علاوہ ٹیلی گراف زمانہ حال کی ایک اور ایجاد تھی جسے باغیوں کے خلاف کام میں لایا گیا۔ بقول رسل: "جب سے برقی تار ایجاد ہوا اس نے کبھی اتنا اہم اور دلیرانہ کام انجام نہیں دیا جیسا کہ اب ہندوستان میں دے رہا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو کمانڈر ان چیف کی نصف فوج ناکارہ ہو جاتی۔ یہ اس کے دست راست سے زیادہ کام کا ہے۔"[۲۴۹]

اس کے علاوہ ایک منظم جمعیت کے بغیر بغاوت کامیاب نہ ہو سکتی تھی۔ بغاوت کے راہنما بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والوں کا ایک انبوہ تھا: زمینوں سے بے دخل کیے گئے زمیندار، اجڑے ہوئے صنعت کار، کنگال کاشتکار، غیر مطمئن سپاہی، متعصب ملا اور برہمن جن کے ذہنوں میں آزاد ہندوستان کے جدا جدا تصور تھے۔ مجلس انتظامیہ اور نظام حکومت جس کی حیثیت ایک بڑی گرام پنچایت سے زیادہ نہ تھی، راہنماؤں کے ادھورے ارمانوں کے ترجمان تھے (آخر یہی ان کی سیاسی میراث تھی)۔ یہ سچ ہے کہ نئی حکومت کا سماجی اور معاشی نصب العین کاشتکاروں کو زمینوں کے مالک قرار دینا تھا۔[۲۵۰] لیکن اگر باغی کامیاب بھی ہو جاتے تو باوجود منتخب مجلس انتظامیہ کے نئی حکومت کچھ وقت کے بعد اسی قدیم شاہی نظام حکومت میں بدل جاتی۔ اس میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا جب ہم دہلی کے باغی لیڈر جنرل بخت خاں کا ذکر چھیڑتے ہیں جس نے "لاٹ صاحب گورنر بہادر، ناظم امور دیوانی و فوجداری" کا لقب اختیار کیا تھا۔[۲۵۱] اس نظریے کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ یہ بغاوت ذرائع پیداوار میں کسی انقلابی فنی تبدیلی کے سبب نہیں ہوئی جس سے سماجی ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت پڑتی جو ایک نئے نظام حکومت کی متقاضی ہوتی بلکہ یہ بغاوت نئے سماج کو جنم دیے بغیر پرانے سماجی شیرازے کے بکھرنے کے باعث تھی۔

۸۔ بعض اثرات

اگرچہ بغاوت دو سال کے اندر فرو ہو گئی لیکن اس کے اثرات دیرپا اور دوررس تھے۔ سر جان اسٹریچی کا بیان ہے کہ "برطانوی سرکار اور اس کے افسروں پر رجعت پسندانہ خیالات طاری تھے۔"[۲۵۲] چونکہ والیان ریاست نے بغاوت کے سیلاب کو روک کر نمایاں خدمات انجام دی تھیں اس لیے انھیں سلطنت کی فصیل کے طور پر قائم رکھنا اس وقت سے برطانوی سیاست کا اصول رہا ہے۔" یہ ایک انگریز مورخ پی۔ ای۔ رابرٹس کا خیال ہے۔[۲۵۳] جب ملکہ وکٹوریہ ہندوستان کی ملکہ معظمہ بنی تو اس نے یہ اعلان کیا: "ہم ہندوستان کے والیان

۷۔ ناکامی کے اسباب

صاحبِ جائداد طبقوں کی غداری کے علاوہ کچھ اور اسباب بھی تھے جو ہندوستان کی سیاسی اور معاشی آزادی کی جنگ میں باغیوں کی شکست کا موجب ہوئے۔ تعجب کا مقام ہے کہ بغاوت ایک بھی قابل جنگی رہنما پیدا نہ کر سکی۔ یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ دہلی، جھانسی اور گوالیار میں باغی کس طرح لڑے اور لکھنؤ میں کس طرح ڈٹ کر انگریزوں سے جنگ کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستانیوں نے بھی کچھ قابلِ قدر فتوحات حاصل کیں لیکن یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ فتوحات فوجیوں کی کثیر تعداد کے طفیل تھیں نہ کہ فوجی حکمتِ عملی یا تدبیرِ جنگ کے سبب۔ سر جان لارنس نے بجا طور پر کہا ہے کہ "اگر باغیوں میں ایک بھی قابل راہنما ہوتا تو ہماری نجات کی کوئی امید نہ تھی"۔ ۲۴۳ اس کے علاوہ جب بغاوت شروع ہوئی تو جنگِ کریمیا اور جنگِ ایران ختم ہو چکی تھیں اور برطانوی فوج چاق و چوبند تھی۔ افغانستان کے ساتھ دوستی کا معاہدہ ہو چکا تھا۔ اس لیے درۂ خیبر کے اُس پار سے کوئی فوری روسی خطرہ درپیش نہ تھا۔ ہندوستان کی بغاوت کے ساتھ نپٹنے کے لیے انگریزوں کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

ایک سبب اور بھی تھا جس سے باغی نہ نپٹ سکے۔ وہ یہ کہ اسی زمانے میں [illegible] چین کے خلاف اعلانِ جنگ کرے گا۔ چین سے لڑنے کے لیے فرنگی فوجوں کی کثیر تعداد بحرِ ہند میں اس قدر قریب سے گزری کہ انھیں آواز دے کر پکارا جا سکتا تھا۔" خدا کی قدرت سے اس اتفاقی واقعہ کے طفیل ہی شمال مغربی ہندوستان میں دوبارہ اور جلد برطانوی حکومت قائم ہوئی۔ ۲۴۴

باغیوں کو نہ صرف روپے کی مستقل قلت کا سامنا ۲۴۵ تھا بلکہ سامانِ جنگ کی کمی کا بھی۔ ۲۴۶ میجر جنرل سر اوٹون ٹوڈر برن نے دیکھا کہ اودھ کے باغیوں کے پاس کافی ہتھیار نہ تھے۔ ان کے پاس ۶۸۴ توپیں، ۱۸۶۱۷۷ بندوقیں، ۵۶۱۳۲۱ تلواریں، ۵۰۳۱۱ برچھیاں اور ۶۳۸۶۸۳ چھوٹے ہتھیار تھے۔ درحقیقت باغیوں کے لگائے ہوئے زخم زیادہ تر تلوار کے تھے۔ ۲۴۷ انفیلڈ رائفل کے ساتھ بھلا تلوار کا کیا مقابلہ! چارلس بال کا دعویٰ ہے کہ اگر بنگال کی باغی فوج کے قبضے میں مینی رائفل ہوتی تو دہلی اب بھی مغلوں کی ملکیت ہوتا اور تیمور کا وارث قید کی کوٹھری میں ایک بوسیدہ چارپائی کے بجائے اپنے آبائی محل میں اب بھی آب دار موتیوں سے مرصع تخت پر بیٹھا ہوتا۔ ۲۴۸

چھوت چھات سے متعلق قانون، ہندوؤں میں طلاق اور ہندو عورتوں کے حق وراثت کے بارے میں ترقی پسند ابھرتے ہوئے متوسط طبقے کے مطالبات کے برعکس ہندوستان میں انگریز سماجی اور مذہبی روایات کو محفوظ اور برقرار رکھنے کے حامی ہو گئے۔

انگریز ہندوستانی فوج اور مسلمانوں کو بغاوت کے بڑے محرک سمجھتے تھے۔ اس لیے ان پر خاص توجہ دی گئی۔ پیل کمیشن (۱۸۵۹ء) نے دیسی فوج میں کمی کی سفارش کی۔ تقریباً دو لاکھ جوان جن میں کچھ فوجی پولیس کے آدمی بھی شامل تھے برطرف کر دیے گئے۔ ایک اور فوجی کمیشن نے جو اکیس سال بعد مقرر کیا گیا بغاوت سے دو سبق اخذ کیے۔ پہلا، ملک میں ایک ناقابلِ مزاحمت برطانوی فوج کا قیام۔ دوسرا، توپ خانے کو فرنگیوں کے قبضے میں رکھنا۔ لارڈ کیننگ نے جسے انگلستان میں ہندوستان نواز سمجھا جاتا تھا اور جس کی "رحمدلی"[۲۶۲] کا مذاق اڑایا جاتا تھا، سفارش کی کہ کسی فرنگی فوجی کو ہندوستان میں اتنی دیر ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ یہ بھول جائے کہ میں قابض فوج کا سپاہی ہوں۔ اس کی تجویز کو ۱۸۶۱ء کی آرمی ایملگیشن سکیم (امتزاجِ فوج کا منصوبہ) میں شامل کر لیا گیا۔[۲۶۳] اسی طرح بڑے بڑے خزانوں، اسلحہ خانوں، تدبیر جنگ کے لحاظ سے اہم مقامات، اہم قلعوں اور فوجی ٹھکانوں کی حفاظت اب فرنگی فوجیں کرنے لگیں جن کی تعداد "اتنی کافی تھی کہ غدر کی صورت میں ڈٹ کر مقابلہ کر سکے"۔[۲۶۴] مسلمان بھی انگریزوں کے قہر و عتاب کا شکار ہوئے۔ ان پر بغاوت میں نمایاں حصہ لینے کا الزام دھرا گیا۔[۲۶۵] ان بدذات مسلمانوں کو عبرت دلانے کے لیے جھجر، بلب گڑھ، فرخ نگر کے نوابوں اور چوبیس شہزادوں کو پھانسی پر لٹکایا گیا[۲۶۶] مسلمانوں کی جائدادوں کو ضبط کر لیا گیا یا تباہ کر دیا گیا۔ مسلمانوں سے ان کی غیر منقولہ جائداد کا پینتیس فی صدی بطور تعزیری جرمانہ وصول کیا گیا جب کہ ہندوؤں کو دس فی صدی کے [illegible] چھوڑ دیا گیا۔ جب دہلی کو دوبارہ فتح کر لیا گیا تو ہندوؤں کو چند ہی مہینوں کے اندر واپس آنے کی اجازت مل گئی لیکن مسلمان ۱۸۵۹ء سے پہلے نہ لوٹ سکے۔ سی۔ ایف۔ اینڈریوز اپنی تصنیف Zakaullah of Delhi (دہلی کا ذکاءاللہ) میں بیان کرتا ہے کہ "دہلی میں تحریک احیائے علوم کو ایسی زک پہنچی کہ پھر نہ سنبھلی"۔[۲۶۷]

دوسرے مقامات اور صوبوں میں بھی یہی حال تھا۔ مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد اگر کھلم کھلا نہیں تو روزمرہ کی منافرت کے اظہار سے جاری رکھی۔ اسی منافرت نے مجموعی طور پر برطانوی تمدن، تہذیب، فلسفہ اور تعلیم بلکہ ہر انگریزی چیز کی مخالفت کی شکل اختیار کی۔ پس بغاوت کے بعد کے دور میں بقول سر تھیوڈور ماریسن "ہندو و [illegible] علوم و فنون کی تحریک سے علمی

ریاست کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم ان تمام معاہدوں اور اقرار ناموں کو قبول کرتے ہیں اور خلوصِ نیت کے ساتھ ان کے پابند ہوں گے جو ان کے ساتھ خود ایسٹ انڈیا کمپنی نے کیے یا اس کے حکم سے کیے گئے اور ہم ان کی طرف سے بھی اسی طرح عمل پیرا ہونے کی توقع رکھتے ہیں۔ ہم دیسی حکمرانوں کے حقوق وقار اور عزت کا اسی طرح پاس رکھیں گے جیسے یہ ہمارے اپنے ہیں۔"٢٥٤

بغاوت کے نتیجے کے طور پر ہندوستانی زمینداروں اور ساہوکاروں اور انگریزوں کے مابین ایک اتحاد وجود میں آیا۔ انگریزوں نے سوچا کہ اگر ہم ایسی پالیسیاں اختیار کریں گے" جن کے سبب ہندوستانیوں کے اعلیٰ طبقے ہم سے منھ موڑ لیں تو ہمارے لیے مستقل طور پر حکومت کرنا مشکل ہو جائے گا۔"٢٥٥ اس لیے ملکہ کے اعلان میں یہ کہا گیا: "جو زمینیں ہندوستانیوں کو اپنے آباواجداد سے ورثہ میں ملی ہیں ان کے ساتھ ان کی وابستگی کے جذبہ سے ہم آگاہ ہیں اور اس کا پاس رکھتے ہیں اور ہم زمینوں سے متعلق ان کے تمام حقوق کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔ قانون وضع کرنے اور نافذ کرنے میں ہندوستان کے قدیم حقوق اور رسم و رواج کا مناسب احترام کیا جائے گا۔"٢٥٦ حکومت ہند نے نومبر ١٨٥٩ء میں لندن کو یہ مشورہ دیا کہ "ہندوستان میں زمیندار امرار کے طبقہ کا قیام اس قدر اہمیت رکھتا ہے کہ اس کی خاطر ہم اس نظام کو قربان کر سکتے ہیں جس نے کاشتکاروں کی آزادی میں اضافہ کیا ہے اور ان کے حقوق کو محفوظ کیا ہے لیکن قدیم طبقہ امرار کے زوال یا خاتمے کا موجب ہوا ہے۔"٢٥٧ اسی حکمتِ عملی کا نتیجہ تھا کہ اودھ کے ان دو تہائی تعلقہ داروں کو صوبجات کے سماجی ڈھانچے میں لازمی عنصر کے طور پر بحال کر دیا گیا جنھیں پہلے کیننگ نے حقارت کے ساتھ ایسے آدمی کہا تھا جن میں کوئی امتیازی خصوصیت نہ تھی مثلاً اعلیٰ خاندان، اعلیٰ خدمت، یا زمین سے وابستگی۔"٢٥٨ نیز ١٨٥٨ء اور ١٨٦٢ء کے درمیان زمینداری نظام کی توسیع کی تجویز پر برطانیہ میں گرما گرم بحث ہوئی۔ بالآخر اس تجویز کو ترک کر دیا گیا کیوں کہ بغاوت نے مالی مشکلات پیدا کر دی تھیں۔٢٥٩ لیکن ہندوستانی زمینداروں اور برطانوی شہنشاہیت پرستوں کے درمیان اس اتحاد نے ہندوستان کو ایک زرعی بحران میں مبتلا کر دیا تھا جس کے اثرات ابھی تک کامل طور سے نہیں مٹے تھے۔

اقتصادی اور سیاسی سطح سے اس اتحاد کا اثر سماجی اور تمدنی سطح تک جا پہنچا۔ "فرسودہ روایات کو بدلنے اور ان کی جگہ تہذیب کی نئی روشنی پھیلانے کی پالیسی ترک کر دی گئی۔"٢٦٠ سر ہنری مین لکھتا ہے: "١٨٥٧ء کے خوفناک واقعات کے بعد ہندوستانی حکام ملکی رسوم کو بدلنے سے اس طرح خوف کھانے لگے گویا ان کی رگ رگ میں دہشت سمائی ہوئی ہے۔"٢٦١ شادی کی عمر،

بیجوں کا پھل ہندوستانی اس وقت تک نہ پائیں گے جب تک وہ خود اتنے طاقتور نہیں ہو جاتے کہ برطانوی غلامی کا جوا اتار پھینکیں۔"[٢٧] اسی حقیقت کے احساس کا نتیجہ تھا کہ ہندوستانیوں نے ١٨٨٦ء میں آزادی کے لیے منظم جدوجہد کا آغاز کیا اور آٹھ سال بعد ١٥ اگست ١٩٤٧ء کو انھوں نے آزادی حاصل کر لی۔

حواشی

١. لفظ "غدر" اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ یہ کثرت کے ساتھ مستعمل ہے۔ میں اس واقعے کو "غدر" تصور نہیں کرتا۔ ن۔ ک۔

٢. سرجان ولیم کے، کرنل جی۔ بی۔ مالیسن اور بہت سے دوسرے برطانوی مصنفین نے اس عنوان کے تحت ١٨٥٧ء کی بغاوت کے بارے میں کتابیں لکھی ہیں۔

٣. سرجان سیلے، اشوک مہتہ کے حوالے سے The Great Rebellion "دی گریٹ ربیلین"، ١٩٤٦ء، صفحہ ٢٩

٤. وی۔ ڈی۔ ساورکر : India's war of Independence "انڈیاس وار آف انڈیپنڈنس" مطبوعہ ١٩٤٦ء

انگریز لوگ

جی۔ ڈبلیو۔ فارسٹ : History of the Indian Mutiny "ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی" مطبوعہ ١٩٠٤ء، جلد اول صفحہ ٢١

"ہسٹری آف انڈیا" Oxford History of India صفحہ ٧٢٢

سر ڈبلیو۔ ایچ۔ رسل : My Diary in India in the year 1858-59 "مائی ڈائری اِن انڈیا ان دی ایر ١٨٥٨-٥٩ء"، مطبوعہ ١٨٦٠ء جلد دوم، صفحہ ٢٥٩۔

سر جارج کیمپ بیل : Memoirs of my Indian Career (میمائرز آف مائی انڈین کیریر) ١٨٩٣ء، جلد اول۔ صفحہ ٢٨٢

لارڈ ایلن برا نے ١٦ فروری ١٨٥٨ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں مندرجہ ذیل بیان دیا:

"اگرچہ ہمارے مورخ یہ دعویٰ کرنے کے دلدادہ ہیں کہ غدر محض ایک فوجی بغاوت تھی لیکن ہزاروں شہریوں کو مقدمے کا ڈھونگ رچا کر یا اس کے بغیر ہی پھانسی دینے اور سوائے ہندوستانی نسل کے آباد کیے

اور اخلاقی نشاۃِ ثانیہ کی منزلیں طے کر رہے تھے جب کہ سارے ہندوستان میں مسلمان مادی ناداری اور علمی انحطاط کے شکار تھے۔"[۲۶۸]

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کے تمام انتظامیہ اداروں میں مسلمانوں کا تناسب گھٹ کر چار پانچ فی صدی رہ گیا جب کہ سو سال پہلے انھیں حکومت کی اجارہ داری حاصل تھی۔ یہی حال ان اعلیٰ اسامیوں کا ہے جہاں سرکار کے لطف و کرم کی تقسیم پر ہر وقت کڑی نگاہ رکھی جاتی ہے۔ کم حیثیت کے عہدوں سے مسلمانوں کا اخراج اور بھی زیادہ ہے۔"[۲۶۹] قبل اس کے کہ ان کی آنکھیں کھلیں اور وہ اس رویہ سے پہنچنے والے نقصان کو محسوس کریں (جیسا کہ سرسید احمد خاں کی قسم کے آدمیوں کی تصنیفات سے ظاہر ہے) ہندو تعلیم کے میدان میں بہت آگے بڑھ چکے تھے اور سرکاری ملازمتوں اور تجارت میں اپنے قدم جما چکے تھے ـــ پڑھے لکھے طبقے کے لیے صرف یہی راہیں کھلی تھیں۔ دونوں فرقوں کی غیر مساوی ترقی سے ہندو مسلم مسئلہ پیدا ہو گیا۔ اسی مسئلہ نے بعد میں ہندوستان کی قومی آزادی کی جدوجہد میں رخنہ ڈالا۔ انگریزوں نے اس مسئلے کو ہوا دی اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بالآخر یہ پاکستان کے قیام کا موجب ہوا۔

ـــ

ہندوستان میں بغاوت کے بعد برطانیہ کی علاقائی توسیع عملی طور پر رک گئی اور شہنشاہیت کی استواری کا دور شروع ہوا۔ سرجان سیلے کا بیان ہے کہ "غدر کے بعد الحاقِ علاقہ کا سلسلہ ختم ہو گیا تاہم صدی کے وہ پچیس سال جن میں کوئی فتوحات عمل میں نہ آئیں تجارت میں تیز رفتار ترقی کا دور تھے۔"[۲۷۰] بقول اشوک مہتہ تجارت میں لگ بھگ ۳۶۰ فی صدی کی توسیع ہوئی۔[۲۷۱]

اس توسیع کی وجہ یہ تھی کہ ریلوں اور سڑکوں کے جال بچھ جانے سے ملک کے اندرونی حصوں کی منڈیوں میں سرمایہ لگانے کی راہیں کھل گئیں لیکن مارکس نے لکھا کہ: "تم ایک وسیع ملک میں ریلوں کا جال قائم نہیں رکھ سکتے جب تک وہ تمام صنعتی کام شروع نہ کیے جائیں جو ریلوں کی نقل و حرکت کی فوری اور مستقل ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اسی لیے ایسی ضمنی صنعتیں وجود میں آجاتی ہیں جن کا ریلوے کے ساتھ قریبی واسطہ نہیں ہوتا اس سے موروثی پیشہ ورانہ گروہ بندیاں مٹ جائیں گی جن پر ہندوستانی ذات پات کا مدار ہے ـــ جو ہندوستان کی ترقی اور اقتدار کی راہ میں حائل ہیں۔"[۲۷۲] پس اگرچہ انگلستان کی یہ پالیسی ذلیل ترین مقاصد پر مبنی تھی لیکن وہ دیدہ و دانستہ ایشیا کے تاریخ کے سب سے بڑے بلکہ سچ پوچھو تو بے نظیر انقلاب کا آلۂ کار بنی جو پہلے کبھی سننے میں نہ آیا تھا۔"[۲۷۳] لیکن بقول مارکس "سماج میں انگریزوں کے بوئے ہوئے

مطبوعہ ۱۸۵۸ء باب دوم اور بحوالۂ تصنیف ٹریولیین، صفحہ ۷۶ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۷۔ بحوالۂ تصنیف کیو۔ براؤن۔ جلد اوّل، صفحہ ۱۹۲

۱۸۔ بحوالۂ تصنیف لو، صفحہ ۳۲۶

۱۹۔ آر۔سی۔ دت: The Economic History of India (دی اکنامک ہسٹری آف انڈیا) مطبوعہ ۱۹۵۰ء طبع ہفتم، جلد دوم، صفحہ ۲۲۳ ڈسرائیلی کا خیال تھا کہ "بنگالی فوج کے باغی اپنی پیشہ ورانہ شکایات کے سبب اس قدر انتقام لینے والے نہیں تھے جس قدر وہ عوامی بے اطمینانی کے ترجمان تھے"۔ بحوالہ ایڈورڈ تھامسن منقول از تصنیف صفحہ ۳۲

۲۰۔ مارک تھارن ہل: The personal adventures and experiences of a magistrate during the rise, progress and suppression of the Indian mutiny (1884) P. 178
مطبوعہ ۱۸۸۴ء، صفحہ ۱۷۸

۲۱۔ سر سید احمد خاں سے کے تک Kaye's mutiny papers (کے'س میوٹنی پیپرس)، جلد ۷۲۵ صفحات ۱۶-۱۰۱۱

۲۲۔ مقالہ کے مذکورہ ذیل ابواب چہارم، پنجم اور ششم ملاحظہ فرمائیں۔

۲۳۔ اشوک مہتا بحوالۂ تصنیف صفحہ ۶۰

۲۴۔ ریورنڈ ڈاکٹر فرینک برائٹ اپنی تصنیف History of England (ہسٹری آف انگلینڈ) دور چہارم، مطبوعہ ۱۸۹۳ء میں ان مظالم کا ذکر کرتا ہے جو ہندوستانی باغیوں پر برطانوی فوجوں نے ڈھائے: "ایسا دکھائی دیتا تھا گویا دو وحشی قوموں میں مقابلہ ہے جنھیں انصاف یا رحم سے آنکھیں مونده صرف یہ ایک ہی خیال سوجھتا تھا کہ اپنے دشمنوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے۔" صفحہ ۳۲۸ البتہ مارکس نے ہندوستانی باغیوں کے وحشتناک مظالم کو جائز ٹھہرایا۔ اس کا بیان تھا: "سپاہیوں کی کرتوت خواہ کتنی ہی مذموم ہو آخر یہ مجموعی صورت میں انگلینڈ کے ہندوستان میں اپنے ہی اس وطیرے کا ردعمل ہے جو انھوں نے نہ صرف مشرق میں سلطنت کے قیام کے دوران میں بلکہ مستحکم اور مدت سے جمی ہوئی حکومت کے آخری دس سالوں میں بھی اپنایا۔" (مارکس اور اینجل برطانیہ پر) صفحہ ۴۴۹

ہوئے دوستوں دشمنوں کے دیہات کو جلا دینے کے عمل نے غدر کو ایک عوامی بغاوت میں بدل
دیا ہوتا۔ ایڈورڈ تھامپسن کے حوالے سے، The other side of the Medal
(دی اور سائڈ آف دی میڈل) ۱۹۳۰ء، صفحہ ۱۰۷

۱۰. تھامپسن ٹو : Central India during the Rebellion of 1857 — 58 (سینٹرل انڈیا ڈیورنگ دی ریبلین آف ۵۸-۱۸۵۷ء) مطبوعہ ۱۸۶۰ء
صفحہ ۲۴

۱۱. سر جی۔ او۔ ٹریویلین، The Competition Wallah (دی کمپی ٹیشن والا)
مطبوعہ ۱۸۶۰ء صفحہ ۴۵

۱۲. ریورنڈ ڈاکٹر الیگزینڈر ڈف : The Indian Rebellion : Its causes and results in a series of letters (دی انڈین ریبلین: اِٹس کاذز اینڈ ریزلٹس ان اے سیریز آف لیٹرز) مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحہ ۲۲۳.

۱۳. چارلس بال: History of the Indian Mutiny (ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی)، جلد دوم، صفحہ ۵۷۲

۱۴. کے: A History of the Sepoy war in India (اے ہسٹری آف سپاہی واران انڈیا)، مطبوعہ ۱۸۷۰ء، طبع چہارم، جلد دوم، صفحہ ۱۹۵

۱۵. مالیسن: History of the Indian Mutiny (ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی)
مطبوعہ ۱۸۸۰ء، جلد سوم، صفحہ ۴۸۷

۱۶. ریورنڈ جے۔ کیو براؤن: The Punjab and Delhi in 1857 (دی پنجاب اینڈ دہلی ان ۱۸۵۷ء) مطبوعہ ۱۸۶۱ء جلد اوّل، صفحہ ۲۹-۲۸

The lost dominion کے مصنف کو ریورنڈ کے ساتھ اتفاق رائے ہے ا...
کا بیان ہے: "صرف یہی کہنا ضروری ہے۔ سوائے اودھ کے غدر کسی بھی معنی میں قومی بغاوت
نہیں ہے" منقول از تصنیف ایڈورڈ تھامپسن۔ صفحہ ۲۰۷.

لفٹننٹ جنرل میکلوڈ انس کے بیان کے مطابق: "کم از کم اہلِ اودھ کی جدوجہد کو
جنگِ آزادی قرار دینا چاہیے"۔ منقول از تصنیف ساورکر، صفحہ ۳۵۷ جان بروس نارٹن
تصنیف: Topics for Indian Statesmen (ٹاپکس فار انڈین اسٹیٹسمین)

(ہسٹری آف برٹش انڈیا) جلد اول، باب ہشتم وغیرہ

۳۶۔ مارکس : Capital (کیپٹیل) جلد اول، پندرھواں باب فصل پنجم

۳۷۔ مارکس : Articles on India (آرٹیکلز آن انڈیا) صفحہ ۲۲۔

۳۸۔ پروفیسر ڈی۔آر۔گیڈگل اپنی مشہور تصنیف Industrial Evolution of India (انڈسٹریل ایولیوشن آف انڈیا) میں بیان کرتا ہے کہ "شہری صنعت وحرفت سے یقیناً زمین پر دباؤ بڑھ گیا لیکن شہروں سے نقل مکان کے سبب اس قدر نہیں (یہ بات نہیں کہ بالکل ہی نہ ہوا) بلکہ زمین پر ان لوگوں کے نہ جانے سے جو وقت پاکر شہری صنعتوں میں کھپ جاتے۔ صفحہ ۴۵

۳۹۔ وادیہ و مرچنٹ بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۹

۴۰۔ رادھا کمل مکرجی : Land problems of India مطبوعہ ۱۹۳۳ء صفحات ۴۱۱۶ نیز ملاحظہ فرمائیں : India : Its administration and progress مطبوعہ ۱۹۱۱ء طبع چہارم صفحات ۱۳۷، ۳۶۵

۴۱۔ آر۔سی۔دت۔ بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحہ ۸۵

۴۲۔ اسٹریچے : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۱۳۷

۴۳۔ ایضاً، صفحہ ۴۲۷

سرسید احمد خاں بھی عام طور پر سرجان کا ہم خیال ہیں۔ وہ فرماتے ہیں : "پرانے زمانے میں سابقہ حکمرانوں کے تحت بلاشبہ جائدادِ اراضی کے حقوق خریدنے، بیچنے، رہن رکھنے اور بذریعہ ہبہ انتقال کرنے کا طریقہ رائج تھا لیکن بہت کم تھا اور جو بھی تھوڑا بہت تھا وہ فریقین متعلقہ کی رضامندی اور خواہش سے تھا۔ لگان کے بقایا یا قرض کی وصولی کے لیے ان حقوق کے مطلق العنانانہ طور سے بیع کرنے پر کسی کو مجبور کرنے کا ان دنوں دستور نہ تھا۔" رسالہ اسباب بغاوتِ ہند (طبع اردو) مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحات ۲۸-۲۷

۴۴۔ تھارن ہل بحوالہ تصنیف صفحات ۳۴-۳۳

۴۵۔ ایضاً، صفحہ ۳۴۔ اس نکتہ کی صراحت کے لیے ملاحظہ فرمائیں : اسٹریچے بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۲۷، نیز خان؛ بحوالہ تصنیف، صفحات ۳۰-۲۷

۴۶۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۳

۴۷۔ کے : بحوالہ تصنیف۔ جلد دوم۔ صفحہ ۲۶۰

۲۵۔ جون بوشیمپ : British Imperialism in India (برٹش امپیریلزم ان انڈیا) مطبوعہ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۷۔ نیز ملاحظہ فرمائیں : آر۔ پام دت کی تصنیف : Modern India (ماڈرن انڈیا) مطبوعہ ۱۹۲۷ء، صفحہ ۳۱

۲۶ ولیم بولٹس نے صورت حال کو یوں بیان کیا : "سلطنت روما کے دور زوال میں اس کے دور دراز صوبوں کی طرح ایشیا میں برطانوی نو آبادیوں کو ہر قسم کے نفع بازوں کے رحم پر قانوناً جائز شکار کی حیثیت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ کمپنی کے بیشتر ملازم جور و ستم کے ایسے ہولناک مناظر دکھانے کے بعد جن کی نظیر کسی ملک کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی، دولت سے مالا مال ہو کر انگلستان کو لوٹے ہیں۔" کنسڈریشنز : Consideration on Indian Affairs آن انڈین افیئرز) مطبوعہ ۱۷۷۲ء دیباچہ

موضوع کے دل چسپ مطالعہ کے لیے ملاحظہ فرمائیں جیمز ایچ ہالزمین The Nabobs in England (دی نوابس ان انگلینڈ) مطبوعہ ۱۹۲۶ء جا بہ جا

۲۷۔ ایڈم سمتھ : The wealth of nations (دی ویلتھ آف نیشنز) مطبوعہ ۱۹۳۰ء جلد چہارم، باب ہفتم

۲۸۔ بولٹس بحوالۂ تصنیف دیباچہ میں۔

۲۹۔ ٹی۔ رائس ہومز : A History of the Indian Rebellion (اے ہسٹری آف دی انڈین ریبلین) طبع پنجم، مطبوعہ ۱۸۹۸ء صفحہ ۶

۳۰۔ مارکس Capital (کیپٹل) جلد اوّل، صفحات ۳۶-۸۳۵

۳۱۔ بروکس ایڈمس : The Laws of Civilsation and Decay (دی لاز آف سولزیشن اینڈ ڈیکے) صفحہ ۲۶۰

۳۲۔ Queen Elizabeth I'S charter to the East India Company منقول بتصنیف وادیہ و مرچنٹ، Our economic problem مطبوعہ ۱۹۴۵ء، صفحہ ۲۷۹

۳۳۔ مارکس Articles on India (آرٹیکلز آن انڈیا) طبع دوم، ہندوستانی مطبوعہ ۱۹۴۵ء، صفحات ۴۴-۴۳

۳۴۔ ایضاً صفحات ۴۴-۴۳

۳۵۔ جیمز مل : History of British India (H. H. Wilson's continuation)

۶۳۔ انس : ایضاً صفحہ ۲۷ ٹومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۱

۶۴۔ ایم۔ آر۔ گبنس : An account of the mutinies in Oudh : And of the siege of Lucknow residency. مطبوعہ ۱۸۵۸ء طبع دوم صفحہ ۷۰

۶۵۔ ایضاً صفحہ ۷۰۔ ایل۔ سی۔ روڈز ریز : A personal narrative of the siege of Lucknow مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحات ۳۳-۳۴

۶۶۔ ایضاً۔ صفحہ ۷۰

۶۷۔ ایضاً۔ صفحہ ۷۰

۶۸۔ ریز : بحوالہ تصنیف صفحات ۳۴-۳۳

۶۹۔ گبنس : بحوالہ تصنیف۔ صفحہ ۶۷

۷۰۔ ایضاً : صفحہ ۶۷

۷۱۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد اوّل، صفحہ ۱۱۴۔ انس : بحوالہ تصنیف۔ صفحہ ۲۸

۷۲۔ ایضاً : جلد اوّل صفحات ۸-۱۲۷

۷۳۔ Col. Sleeman's Diary منقول از تصنیف کے، صفحہ ۱۳۵

۷۴۔ کے : ایضاً، جلد اوّل صفحات ۱۱۵-۱۱۴۔ انس بحوالہ تصنیف صفحات ۲۹-۲۸

۷۵۔ گبنس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۱

۷۶۔ ایضاً۔ صفحہ ۶۱

۷۷۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد اوّل۔ صفحہ ۱۱۴

۷۸۔ ایضاً صفحہ ۱۵۴

۷۹۔ G. B. Seton Karr's memorial to the Governor General. منقول از تصنیف کے جلد اوّل صفحہ ۱۰۰۔ ٹومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۱

۸۰۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد اوّل۔ صفحات ۹

۸۱۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۲

۸۲۔ کے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۹۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۳

۸۳۔ فارسٹ : بحوالہ تصنیف جلد اوّل، صفحہ ۱۶۲

۸۴۔ ریز : بحوالہ تصنیف۔ صفحات ۳۵-۳۶

۴۸۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۴۔ ولیم ایڈورڈس کی تصنیف: Personal adventures in the Indian rebellion مطبوعہ ۱۸۵۸ء طبع دوم صفحات ۲

۴۹۔ آرتھر تز: India مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحہ ۱۰۸

۵۰۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اول، صفحہ ۱۵۷

۵۱۔ Cornwallis correspondence: Lord Cornwallis to the court of directors P 533 بورڈ آف کنٹرول نے بجا طور پر سے "تجی جائداد اراضی کا خلاق اعظم" کے لقب سے ملقب کیا۔ منقول از تصنیف رمیزے میور ۹ ... of British India مطبوعہ ۱۹۲۳ء صفحہ ۲۵۳

۵۲۔ سر رچرڈ ٹیمپل Men and events of my times in India مطبوعہ ۱۸۸۲ء صفحہ ۳۰

۵۳۔ Selections from the papers of Lord Metcalfe P. 253

۵۴۔ آرتھر بلز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۲

۵۵۔ بحوالہ تصنیف، صفحہ ۱۲

۵۶۔ رپورٹ کلکٹر مدناپور ۱۸۰۲ء۔ منقول از تصنیف پام دت India today طبع اول ترمیم مطبوعہ ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۹۱

۵۷۔ وادیہ و مرچنٹ: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۳۶

۵۸۔ تھارن ہل، بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۴

۵۹۔ Minutes of the Madras Board of Revenue مورخہ ۵ جنوری ۱۸۱۸ء منقول از تصنیف آر۔ پی۔ دت صفحہ ۱۹۲

۶۰۔ منقول از تصنیف آر۔ پی۔ دت۔ صفحات ۸۶-۱۸۵

۶۱۔ بشپ ہیبر: Memoirs and correspondence مطبوعہ ... ہیبر نے ایک سمجھدار ہندوستانی سے پوچھا کہ کیا تم برطانوی رعیت بننا چاہتے ہو۔ اس نے جواب دیا "تمام مصیبتوں میں سے یہ بھی ایک ہے جس سے خدا بچائے"۔

۶۲۔ لفٹیننٹ جنرل میکلوڈ انس: The sepoy revolt مطبوعہ ... تصنیف گیو بروُن صفحہ ۲۰

۱۰۴۔ کے : صفحہ ۱۹۶

۱۰۵۔ ایضاً صفحہ ۱۹۶

۱۰۶۔ نو : بحوالہ تصنیف، صفحات ۵۸-۳۵۷

۱۰۷۔ ایضاً صفحہ ۳۵۸

۱۰۸۔ پروفیسر تھامس : Economic History Rewiew. مطبوعہ ۱۹۲۳ء

۱۰۹۔ ایضاً۔ اشوک مہتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷

۱۱۰۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد اول صفحہ ۲۷۴۔ نیز ملاحظہ فرمائیں
A. L Morton's A peoples History of England
مطبوعہ ۱۹۴۵ء صفحہ ۱۰۵
ذاتی طور پر میں ان شکستوں کو اتنا ہی اہم خیال کرتا ہوں جتنا کہ جاپانیوں کے ہاتھوں ۱۹۰۵ء میں روس کی شکست کو۔ ن۔ کے۔

۱۱۱۔ خان : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۱

۱۱۲۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحہ ۲۴۱

۱۱۳۔ ایضاً صفحہ ۲۴۳

۱۱۴۔ ایضاً صفحات ۲۱۰ - ۲۷۷
جامع مسجد (دہلی) کی دیواروں پر کسی نظم گو نے چند اشعار لکھے جن کا ناپختہ ترجمہ حسب ذیل ہے :-

جب جنگ سر پر ہوتی ہے اور معرکہ آرائی کا نظارہ درپیش ہوتا ہے
خدا اور سپاہی کے حق ہی میں نعرے بلند ہوتے ہیں
جب جنگ فتح میں اختتام پاتی ہے
خدا بھول جاتا ہے اور سپاہی کی مٹی پلید ہوتی ہے

سر۔ ٹی۔ مٹکاف : Two native narratives of the mutiny at Delhi
مطبوعہ ۱۸۹۸ء صفحہ ۲۳

۱۱۵۔ بنڈل ۱۹۴، فولیو نمبر ۳۰۔ پروانہ باغیان جس میں انگریزوں کے خلاف ان کی شکایات کی تفصیل اور ہموطنوں سے بغاوت کی اپیل تھی : (ملاحظہ فرمائیں Press list of

۸۴۔ گبنس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۷

۸۵۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۳۲

۸۶۔ خاں : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۰-۲۷

۸۷۔ ایضاً : صفحہ ۲۷

مارکس لکھتا ہے: "زمینداروں کا اصلی طبقہ کمپنی کے دباؤ تلے جلد پس کر مٹ گیا۔ ان کی جگہ نفع خور تاجروں نے لے لی جو اب بنگال کی تمام زمین پر قابض ہیں، سوائے چند جاگیروں کے جو سرکار کے بلاواسطہ اہتمام کے سبب واپس کر دی گئیں۔" (Articles on India) طبع ہندی، مطبوعہ ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۸

۸۸۔ خاں : بحوالہ تصنیف صفحات ۲۱-۳۰، کے : بحوالہ تصنیف، جلد اوّل، صفحات ۷۸-۱۷۷

۸۹۔ گبنس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۱

۹۰۔ ریز : بحوالہ تصنیف صفحات ۳۵-۳۴

۹۱۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد اوّل، صفحات ۲۷-۱۲۶

۹۲۔ انس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۷

۹۳۔ گبنس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۹

Michael Joyce : Ordeal at Lucknow، مطبوعہ ۱۹۳۸ء صفحہ ۸۷

۹۴۔ کیو۔ براؤن : بحوالہ تصنیف جلد اوّل، صفحہ ۲۷

۹۵۔ مہتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۶

۹۶۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد اوّل صفحہ ۱۸۰

۹۷۔ مالیسن : بحوالہ تصنیف جلد اوّل، صفحات ۴۹-۳۴۸

۹۸۔ خاں : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۳۵

۹۹۔ ایضاً : صفحہ ۳۶، گبنس : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۹۸

۱۰۰۔ خاں : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۲۶

۱۰۱۔ ایضاً صفحہ ۲۶

۱۰۲۔ ایضاً صفحہ ۳۶

۱۰۳۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد اوّل، صفحہ ۱۹۷

۱۳۳۔ Narratives of the Indian Mutiny صفحہ ۵۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اوّل، صفحہ ۳۶۵

۱۳۴۔ مشکاف: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۹

۱۳۵۔ ایضاً صفحہ ۴۱

۱۳۶۔ ایضاً صفحہ ۴۱

۱۳۷۔ کے: بحوالہ تصنیف، جلد اول، صفحہ ۶۳۸ این

۱۳۸۔ کیو براؤن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۷۳

۱۴۰۔ گبنس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۹

۱۴۰۔ Trial of Bahadur Shah مطبوعہ ۱۸۹۵ء صفحہ ۱۶۰

۱۴۱۔ لارڈ رابرٹس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۱

۱۴۲۔ مشکاف: بحوالہ تصنیف صفحات ۹-۴۰

۱۴۳۔ ایضاً صفحہ ۹

۱۴۴۔ ایضاً صفحہ ۹

۱۴۵۔ کے، بحوالہ تصنیف، جلد دوم، صفحہ ۵۶۵

سرسی۔ ایچیسن اپنی تصنیف: "Lord Lawrence" (۱۸۹۲ء) میں بیان کرتا ہے کہ "اس موقع پر ہم مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف آلۂ کار نہ بنا سکے" (صفحہ ۷۷) نیز ملاحظہ فرمائیں کیو براؤن: بحوالہ تصنیف، جلد دوم، صفحہ ۲۷۳

۱۴۶۔ مشکاف: بحوالہ تصنیف صفحہ ۹

۱۴۷۔ بنڈل ۱۹۹، فولیو ۱۳۷ (اُردو) مورخہ ۱۰ جولائی ۱۸۵۷ء

۱۴۸۔ مالیسن: بحوالہ تصنیف جلد پنجم، صفحہ ۲۹۲

۱۴۹۔ کے: بحوالہ تصنیف، جلد اوّل، صفحہ ۵۷۹ این

۱۵۰۔ مشکاف: بحوالہ تصنیف، صفحہ ۳۹

۱۵۱۔ کے، بحوالہ تصنیف جلد اوّل، صفحہ ۶۵۳

۱۵۲۔ انس: بحوالہ تصنیف، صفحہ ۵۵

۱۵۳۔ لارڈ رابرٹس: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۹-۴۲۸

Mutiny Papers امپیریل ریکارڈ آفس، کلکتہ، ۱۹۲۱ء)

۱۱۶۔ خان: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۲-۲۱

۱۱۷۔ ایضاً صفحہ ۲۲

۱۱۸۔ ایضاً صفحہ ۲۳

۱۱۹۔ ایضاً صفحہ ۲۴

۱۲۰۔ ایضاً صفحہ ۱۴

۱۲۱۔ منقول از تصنیف فارسٹ، جلد اول صفحہ ۱۰

۱۲۲۔ منقول از تصنیف کے، جلد اول صفحہ ۱۲۶

۱۲۳۔ ایضاً صفحہ ۱۶۵

۱۲۴۔ ہنری۔ ایس۔ کننگھم: Earl Canning مطبوعہ ۱۸۹۹ء طبع چہارم، صفحات ۲۷-۲۶

۱۲۵۔ جان بروس مارٹن لکھتا ہے: "ملک میں اس قدر سیاسی بے چینی پھیلی ہوئی تھی کہ جو نصف درجن بغاوتیں برپا کرنے کو کافی تھی۔" (The Rebellion in India: How to Prevent another مطبوعہ ۱۸۵۷ء صفحات ۷-۶)

۱۲۶۔ فیلڈ مارشل لارڈ رابرٹس تسلیم کرتا ہے کہ "حکومتِ ہند کے سرکاری دفاتر میں مسٹر فارسٹ کی حالیہ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ کارتوسوں کی تیاری میں جو روغنی محلول استعمال کیا گیا واقعی وہ قابلِ اعتراض اجزا یعنی گائے اور خنزیر کی چربی سے مرکب تھا، اور ان کارتوسوں کی ساخت میں فوجیوں کے مذہبی تعصبات اور جذبات کی مطلق پروا نہیں کی گئی۔" (Forty one years in India یک جلد طبع، مطبوعہ ۱۹۰۸ء، صفحہ ۴۲۱)

۱۲۷۔ انس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۲

۱۲۸۔ گمنام: مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحہ ۴

۱۲۹۔ ٹریویلین Cawn Pore مطبوعہ ۱۸۹۹ء،

۱۳۰۔ لفٹیننٹ جنرل ٹی۔ ایف۔ ولسن Defence of Lucknow مطبوعہ ۱۸۵۹ء، کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحہ ۱۰۶

۱۳۱۔ ساورکر: بحوالہ تصنیف صفحات ۹۱-۹۰

۱۳۲۔ ایضاً صفحات ۹۱-۹۰۔ سرٹی۔ مشکات بحوالہ تصنیف۔

۱۷۱۔ Political Proceedings نمبر ۲۸۰ مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۸۵۹ء پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی تاریخ کے ایک غیر جانبدار متعلم کو یقین آجائے گا کہ رانی انگریزوں کے خلاف مارچ ۱۸۵۸ء میں میدانِ جنگ میں کودی اور وہ بھی اس وقت جب انگریزوں نے بالآخر اس کے وفاداری کے وعدوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

نیز ملاحظہ فرمائیں کے: بحوالہ تصنیف جلد سوم صفحہ ۳۷۰

۱۷۲۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰۹۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۰۰

۱۷۳۔ ایضاً جلد دوم صفحہ ۲۴۴

۱۷۴۔ ایضاً جلد سوم صفحہ ۹۸۔ ایف ایف وہ بھی بحالت مجبوری لڑا۔ ملاحظہ فرمائیں Patna University journal viii مطبوعہ ۱۹۶۴ء

۱۷۵۔ آکسفورڈ ہسٹری آف انڈیا۔

۱۷۶۔ تھارن ہل: بحوالہ کتاب صفحات ۳۵، ۸۶

۱۷۷۔ ایضاً صفحہ ۸۷

۱۷۸۔ ہومز، بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۲

۱۷۹۔ ایضاً صفحات ۲۴۰، ۳۵۲ نیز ملاحظہ فرمائیں فریڈرک کوپر: The crisis in the Punjab مطبوعہ ۱۸۵۸ء صفحات ۲۰۸، ۲۱۲

۱۸۰۔ نو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۱

۱۸۱۔ انس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۲

۱۸۲۔ منقول از تصنیف مہتہ صفحہ ۶۲

۱۸۳۔ انس: بحوالہ کتاب صفحہ ۲۸۔ ہومز۔ بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۹۵

۱۸۴۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۰۰

۱۸۵۔ منقول از تصنیف 'INDIA' جلد دوم صفحہ ۳۳۸ مؤلف پی۔ ای۔ رابرٹس۔

۱۸۶۔ تھارن ہل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۱

۱۸۷۔ کوپر: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۱

۱۸۸۔ ایچیسن: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۰

۱۸۹۔ خوشونت سنگھ: The Sikhs مطبوعہ ۱۹۵۳ء صفحہ ۸۲

۱۵۴۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد دوم، صفحہ ۱۰۹

۱۵۵۔ ہومز : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۵۴۶

۱۵۶۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد دوم صفحہ ۱۱۳۔ اینڈرسن اینڈ صوبیدار "The last day of the Company" مطبوعہ ۱۹۱۸ء، جلد اول، صفحہ ۱۱۲

۱۵۷۔ جان بروس نارٹن Topics for Indian Statesmen مطبوعہ ۱۸۵۸ء، باب دوم، جابجا

۱۵۸۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۸۔ نیز ملاحظہ فرمائیں کیو براؤن : بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۹۲

۱۵۹۔ لو : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۹

۱۶۰۔ مشکاف : بحوالہ تصنیف، جابجا

۱۶۱۔ فارسٹ : بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۱۷

۱۶۲۔ گبنس : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۱۴۳۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف : صفحہ ۱۲۳

۱۶۳۔ ہومز : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۱۳۷

۱۶۴۔ ایضاً صفحات ۱۳۸، ۱۲ — ۴۱۱

۱۶۵۔ کے : بحوالہ تصنیف، جلد دوم، صفحہ ۱۱۴

۱۶۶۔ انس : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۶۱

۱۶۷۔ انس The Sepoy report مطبوعہ ۱۸۹۶ء، صفحہ ۶۱

۱۶۸۔ فوجی عدالت کے روبرو تانتیا ٹوپے نے اپنی شہادت میں کہا : "نانا نے جو کچھ کیا، مجبور ہو کر کیا۔ وہ باغیوں کے قبضے میں ایک قیدی کی حیثیت رکھتا تھا۔" ملاحظہ فرمائیں فارسٹ : بحوالہ تصنیف جلد اول، صفحہ ۴۲۰ — کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحہ ۳۱۰۔ مالیسن : بحوالہ تصنیف، جلد سوم، صفحہ ۵۱۵۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۵

جب تانتیا ٹوپے نے یہ بیان دیا تو اس کے لیے بغاوت میں اپنے یا اپنے آقا کے کارناموں کی وقعت کو گھٹانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے برعکس ان کارناموں کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی بڑی ترغیب تھی تاکہ وہ قومی سورماؤں کی حیثیت میں زندہ جاوید ہو جائیں۔

۱۶۹۔ ہومز : بحوالہ تصنیف، صفحہ ۵۱۸

۱۷۰۔ ٹریویلین : بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۶

۲۱۰۔ ... تصنیف صفحہ ۲

۲۱۱۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۳۶

۲۱۲۔ گوپر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰

۲۱۳۔ کیوبراؤن : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۸۲

۲۱۴۔ فالن : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۴

۲۱۵۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۵۹

۲۱۶۔ آر سی۔ دت بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۹۰

۲۱۷۔ ایچیسن : بحوالہ تصنیف صفحہ ۸۱

۲۱۸۔ اگرچہ سکھوں کا جذبۂ جہاد دبا ہوا تھا لیکن ختم نہیں ہوا تھا۔ دہلی میں باغیوں کی طرف سے سکھ دستے بھی لڑ رہے تھے۔ ملاحظہ فرمائیں مٹکاف بحوالہ تصنیف صفحات ۱۰۳، ۱۹۱

۲۱۸۔ ... تسٹ : بحوالہ تصنیف جلد اوّل صفحہ ۴۲۰ ۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۸

۲۱۹۔ ... مغل شہزادے کی طرف سے جاری کیا گیا اعلان جس میں باغیوں کے مقاصد بیان کیے گئے تھے۔ منقول از تصنیف اشوک مہتہ صفحات ۲۱-۲۶

۲۲۰۔ کنگز ریویو مطبوعہ ۱۸۵۹ء صفحہ ۶۴

۲۲۱۔ بنڈل ۵۷ فولیوز نمبر ۴۱-۵۳۹ (اُردو) غیر مورخہ

۲۲۲۔ ... ن کے اپنے کلمات ، ایضاً قاعدہ نمبر ۷

۲۲۳۔ ملکی مہاجن ، ساہوکار اور کاری گر۔

۲۲۴۔ بحوالہ تصنیف ۔ تمہید۔

۲۲۵۔ بنڈل ۵۰ ، فولیو ۱۲ (فارسی ... ۱۸۵۷ء

۲۲۶۔ بنڈل ۵۷ فولیو ۴۱-۵۳۹ قاعدہ نمبر ۲

... ایضاً قاعدہ نمبر ۲۴

... ایضاً قاعدہ نمبر ۴

... ایضاً قاعدہ نمبر ۵

... بحوالہ مقام

۲۳... ان کے اپنے کلمات ، ایضاً قاعدہ نمبر ۳

۱۹۰۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد اوّل صفحہ ۶

۱۹۱۔ لینڈ لارڈ

۱۹۲۔ فارسٹ : بحوالہ تصنیف جلد اوّل صفحہ ۷

۱۹۳۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحات ۳۲ ۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد اوّل ۔ صفحات ۶۱-۵۹
فارسٹ : بحوالہ تصنیف جلد اوّل صفحات ۳۸ ۔ ۳۳-۳۲ ۔ ۴۶-۳۴۵

۱۹۴۔ کوپر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۳۱

۱۹۵۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۷۲ این

۱۹۶۔ کیو براؤن : بحوالہ تصنیف جلد اوّل صفحہ ۲۹۶ ۔ نیز ملاحظہ فرمائیں : مشکات بحوالہ تصنیف
صفحہ ۱۶۷

۱۹۷۔ کوپر : صفحات ۶۴ ، ۵۵-۵۴ ۔ ۱۵۴ ۔ نیز ملاحظہ فرمائیں The Hero of Delhi
مطبوعہ ۱۹۴۹ء صفحات ۲۰۹-۱۷۱ ۔ آر. سی. دت The Economic History
of India جلد دوم ۔ طبع ہفتم ، مطبوعہ ۱۹۵۰ء صفحہ ۹۰

۱۹۸۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۲۶

۱۹۹۔ ایضاً صفحہ ۳۲۶

۲۰۰۔ کیو براؤن : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحات ۸۲-۲۸۱

۲۰۱۔ ایضاً صفحہ ۲۸۶ ۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحات ۶۴-۳۶۳

۲۰۲۔ خان : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۴

۲۰۳۔ کوپر : بحوالہ تصنیف صفحات ۷۴-۷۳

۲۰۴۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۹۲

۲۰۵۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۱۱

۲۰۶۔ ایضاً صفحہ ۳۳ ۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۲۱

۲۰۷۔ فارسٹ : بحوالہ تصنیف جلد اوّل صفحہ ۱۷۱

۲۰۸۔ آر. راس. ورتھ سمتھ Life of Lord Lawrence مطبوعہ ۱۸۸۳ء
جلد اوّل صفحہ ۲۴۱

۲۰۹۔ فارسٹ : بحوالہ تصنیف جلد اوّل صفحہ ۱۷۱ ۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۳

۲۵۰۔ بنڈل ۱۹۹، فولیو نمبر ۱۹۵ (فارسی) ۲۳ر جولائی ۱۸۵۷ء

۲۵۱۔ Trial of Bahadur Shah صفحات ۳۵-۱۲۴

بادشاہ کی طرف سے مرزا مغل کے نام ایک غیر مورخہ حکم کی نقل

۲۵۲۔ ایضاً فولیو نمبر ۱۸۵ (فارسی) ۷ر اگست ۱۸۵۷ء

۲۵۳۔ ایضاً فولیو نمبر ۴۹ (فارسی) ۷ر اگست ۱۸۵۷ء

۲۵۴۔ کیو براؤن: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۴۰

ایچ۔ ایچ۔ گریتھڈ اپنی تصنیف: Letters written during the Siege of Delhi (1858) میں ۹ر اگست ۱۸۵۷ء کو لکھتا ہے: "شہزادوں سے مجھے خفیہ ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ انھیں ہمیشہ ہمارے ساتھ انس رہا ہے۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ ہماری کیا مدد کر سکتے ہیں۔" صفحات ۶-۲۰۵

یہ بھی قابل ذکر ہے کہ بادشاہ بہادر شاہ نے ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو لفٹیننٹ گورنر آگرہ کے نام ایک خط لکھا جس میں اس نے میرٹھ کے باغیوں کے دہلی میں وارد ہونے سے مطلع کیا۔ ۱۴ر جولائی ۱۸۵۷ء کو دہلی کا محاصرہ کرنے والی برطانوی فوج کے کمانڈر ان چیف جنرل ولسن نے چیف کمشنر پنجاب سر جان لارنس کو لکھا کہ اگر ہم بادشاہ کو جان بخشی اور پنشن کا یقین دلا دیں تو وہ ہم پر شہر اور لال قلعہ کے دروازے کھول دے گا۔

بادشاہ کی چہیتی بیگم زینت محل نے بادشاہ کے ساتھ اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لانے کی پیش کش کی تاکہ مصالحت کی کوئی نہ کوئی راہ نکالی جائے۔ (گریتھڈ بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۷)

۲۵۵۔ بنڈل ۱۹۹، فولیو نمبر ۱۳۷ (اردو) ۲۰ر جولائی ۱۸۵۷ء۔ اراکین مجلس کی بادشاہ کی خدمت میں درخواست

۲۵۶۔ ایضاً

۲۵۷۔ بنڈل ۱۲۹، فولیو نمبر ۶ (اردو) ۸ار اگست ۱۸۵۷ء

۲۵۸۔ بنڈل ۱۹۹، فولیو نمبر ۱۳۷ (اردو) ۱۰ر جولائی ۱۸۵۷ء

۲۵۹۔ بنڈل ۱۲۹، فولیو نمبر ۶۱ (اردو) ۸ اگست ۱۸۵۷ء

۲۶۰۔ بنڈل ۱۵۳، فولیو نمبر ۱۷ (فارسی) غیر مورخہ۔ بنڈل ۵۷، فولیو نمبر ۵۲۳ (فارسی) ۱۹ر اگست ۱۸۵۷ء

۲۳۲۔ ان کے اپنے کلمات ، بحوالۂ مقام

۲۳۳۔ ایضاً ، قاعدہ نمبر ۱۱

۲۳۴۔ بحوالۂ مقام

۲۳۵۔ کیمپ بیل : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۵۶

۲۳۶۔ بنڈل ۵۷ ، فولیو ۴۱-۵۲۹ (اردو) قاعدہ نمبر ۸

۲۳۷۔ ایضاً قاعدہ نمبر ۷

۲۳۸۔ Trial of Bahadur Shah مطبوعہ ۱۸۹۵ء ، صفحات ۱۴۰-۱۳۷

شہزادہ ظہیر الدین عرف مرزا مغل نے شاہنشاہ کو لکھا کہ میں نے جنرل بخت خاں اور مجلس کے دوسرے اراکین کے ساتھ بات چیت کی ہے لیکن انھوں نے بادشاہ سلامت کی تجاویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

بنڈل ۱۹۹ ، فولیو ۱۵۵ (فارسی) غیر مورخہ

۲۳۹۔ Trial of Bahadur Shah سابق بادشاہ کا بیان صفائی صفحات ۱۴۰-۱۳۷

۲۴۰۔ دہلی اردو اخبار ، جلد ۱۹ ، شمارہ ۲۱ ، ۲۴ رمئی ۱۸۵۷ء

نیز Trial of Bahadur Shah صفحات ۱۳۵-۱۳۴ ، بادشاہ کی طرف سے مرزا مغل کے نام ایک خط میں مکمل حوالہ ، غیر مورخہ

۲۴۱۔ بنڈل ۱۹۹ ، فولیو ۲۶۰ (فارسی) ۹ راگست ۱۸۵۷ء

۲۴۲۔ بنڈل ۵۷ ، فولیوز ۴۱-۵۲۹ (اردو) قاعدہ نمبر ۳ ۔ غیر مورخہ

۲۴۳۔ بحوالہ مقام

۲۴۴۔ ایضاً قواعد نمبر ۸ ۔ ۹ ۔ ۱۰

۲۴۵۔ ایضاً قاعدہ نمبر ۸

۲۴۶۔ ایضاً قواعد نمبر ۴ ، ۸

۲۴۷۔ ایضاً قواعد نمبر ۴ ، ۶

۲۴۸۔ بنڈل ۵۷ ، فولیو نمبر ۲۸۵ (اردو) ۸ راگست ۱۸۵۷ء

۲۴۹۔ ایضاً ، فولیوز نمبر ۹ ، ۱۲۰ ، ۲۷۶ (اردو) مورخہ ۱۳ ، ۱۴ رجولائی اور ۸ راگست ۱۸۵۷ء

۲۷۶۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحات ۳۴-۲۲۳

۲۷۷۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۴

۲۷۸۔ "آریہ کیرتی" مصنفہ رجنی گپتا بنگالی۔ منقول از تصنیف ساورکر صفحہ ۴۳۵

۲۷۹۔ مٹکاف : بحوالہ تصنیف، جابجا ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۵۲۔ کو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۸۵۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحات ۷-۸۶ گبنس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۳

۲۸۰۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۸

۲۸۱۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۵۲

۲۸۲۔ خاں : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵

۲۸۳۔ جائیس : بحوالہ کتاب صفحہ ۸۱

۲۸۴۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۳

۲۸۵۔ جنرل سر جیمز اوٹرام : Orders, despatches and correspondence مطبوعہ ۱۸۵۹ء صفحہ ۲۹۷۔

۲۸۶۔ انس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۲

۲۸۷۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحہ ۲۶۵

۲۸۸۔ لفٹیننٹ جنرل انس : Lucknow and Oudh in mutiny مطبوعہ ۱۸۹۶ء صفحہ ۲۹۳

۲۸۹۔ گبنس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۳۰

۲۹۰۔ انس The sepoy revolt P 111 ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶۰

۲۹۱۔ تمام نجی داستانوں میں ایسے حوالے بکثرت موجود ہیں۔ بقول گبنس "غداری کی صرف ایک مثال ہے جس سے ہمیں واسطہ پڑا۔" (بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۰)

۲۹۲۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۶۰

۲۹۳۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحات ۱۴۳ ۲۶۰

۲۹۴۔ منقول از تصنیف ہومز صفحہ ۶۲۶

۲۹۵۔ انس Lucknow and Oudh in mutiny صفحات ۹۳-۲۹۱

۲۹۶۔ ٹیس، بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۰۹

۲۶۱۔ بنڈل ۱۵۳، فولیو نمبر ۱۶ (فارسی) غیر مورخہ

۲۶۲۔ بنڈل ۱۹۹، فولیو ۲۴۸ (فارسی)، ۶ر اگست ۱۸۵۷ء

۲۶۳۔ بنڈل ۱۹۹، فولیو نمبر ۱۳۷ (اُردو) ۱۰ر جولائی ۱۸۵۷ء

اس کا مضمون یہ ہے "اگر دستاویزات کے معائنے اور گواہوں یعنی قانون گو، پٹواری اور موضع کے معزز آدمیوں کی شہادت پر یہ بات واضح طور پر ثابت ہو جائے کہ مدعی دائمی زمین پر قابض تھا تو انتقال حق ملکیت اس کے نام کر دیا جائے گا۔"

۲۶۴۔ بنڈل ۱۰۶، فولیو نمبر ۲۰ (اُردو) ۶ر جون ۱۸۵۷ء، نیز بنڈل ۱۲۶، فولیو نمبر ۲۰ (اُردو) ۸ر جون ۱۸۵۷ء

۲۶۵۔ بنڈل ۱۰۴، فولیو نمبر ۲۹۷ (اُردو) ۹ر اگست ۱۸۵۷ء

۲۶۶۔ بنڈل ۱۲۹، فولیوز نمبر ۴۲، ۴۹، ۵۷، ۷۹، ۸۵، ۱۰۰، ۱۰۱ و ۱۰۲ مختلف تواریخ کے نیز بنڈل ۱۳۰، فولیوز نمبر ۵، ۹، ۱۷، ۲۲، ۲۵، ۳۵، ۵۵، ۶۱، ۶۷، ۸۶، ۹۰، ۱۰۰، ۱۲۱، ۱۲۵، ۱۵۰، ۱۵۸، ۱۷۱، ۱۸۲، ۱۸۸، ۲۰۱ و ۲۰۲ مختلف تواریخ کے۔

۲۶۷۔ بنڈل ۱۵۲، فولیو نمبر ۶ (فارسی) ۲۸ر جولائی ۱۸۵۷ء

۲۶۸۔ ملاحظہ فرمائیں حاشیہ نمبر ۲۶۱

۲۶۹۔ کیپٹن جی۔ ہچنسن Narrative of the mutinies in Oudh مطبوعہ ۱۸۵۹ صفحہ ۱۶۱۔ ریز: بحوالہ تصنیف ۲۶۱۔ ہچنسن مجلس انتظامیہ لکھنؤ کے مندرجہ ذیل پانچ اراکین کے ناموں کا ذکر کرتا ہے ا۔ کیپٹن رگھوناتھ سنگھ ۲۔ کیپٹن امراؤ سنگھ ۳۔ کیپٹن امداد حسین ۴۔ داروغہ واجد علی ۵۔ ممّوں خاں شریف الدولہ، صفحہ ۱۰۰)

۲۷۰۔ ریز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶۲

۲۷۱۔ جے۔ ٹال بوائز وہیلر INDIA .. Under British rule مطبوعہ ۱۸۸۶ صفحہ ۲۶۵

۲۷۲۔ ریز بحوالہ تصنیف صفحات ۶۳-۲۶۲

۲۷۳۔ ایضاً صفحات ۶۳-۲۶۲۔

۲۷۴۔ انِس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۵۲

۲۷۵۔ ہومز: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶۰

۲۱۶۔ مشکات : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۶

۲۱۷۔ ایضاً جابجا

۲۱۸۔ ایضاً صفحہ ۹۳

۲۱۹۔ ایضاً صفحہ ۲۱۴

۲۲۰۔ ایضاً صفحہ ۲۱۳

۲۲۱۔ ایضاً صفحہ ۲۱۴

۲۲۲ ایضاً صفحہ ۹۴

۲۲۳۔ بحوالہ مقام

۲۲۴۔ کوپر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۲

۲۲۵۔ ایضاً صفحات ۲۱۰۔۲۱۱

۲۲۶۔ اشوک مہتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۴۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۵۸

۲۲۷۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحات ۴۵ : ۱۶۳ : ۱۷۰ ، ۱۸۸ ، ۲۵۲ اور ۲۶۱

۲۲۸۔ وجوہات کے لیے ملاحظہ فرمائیں اسٹریچے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۲۷ .

۲۲۹۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۴

۲۳۰۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۹۱۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۷

۲۳۱۔ کوپر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۵

۲۳۲۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۵۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۱۱۷۔ تھارن ہل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۸۔ خان : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۸

۲۳۳۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۰

۲۳۴۔ ایضاً صفحات ۱۶۳ ، ۱۶۸

۲۳۵۔ تو : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۳۹

۲۳۶۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۳۔ وجوہات کے لیے ملاحظہ فرمائیں ریکس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۳۷

۲۳۷۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۳۔ نارٹن نے اپنی تصنیف : Topics for Indian Statesmen (1858) میں بیان کیا : " جو احسان پڑھے لکھے ہندوستانیوں نے ہم پر کیا ہے

۲۹۷۔ جارج کیمپ بیل : بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحہ ۱۴۔ باس ورکھ سمتھ : بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحات ۱۷۶، ۱۹۸، ۹۵-۱۹۳۔ انس : the sepoy report صفحات ۵-۲۴۴

۲۹۸۔ منقول از تصنیف ہومز صفحہ ۴۴۷۔ مالیسن : بحوالہ تصنیف جلد سوم صفحہ ۲۵۱ صدر بورڈ آف کنٹرول لارڈ ایلن برا نے اعلان کو پسند نہ کیا۔ ملاحظہ فرمائیں کننگھم : بحوالہ تصنیف باب ہفتم، جا بجا

۲۹۹۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۲۳

۳۰۰۔ اسٹریچی : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸۱

۳۰۱۔ ایضاً صفحہ ۳۸۲

۳۰۲۔ سائکس : Compendium of the laws specially related to the Taluqdar's of Oudh صفحات ۸۳-۳۸۲

۳۰۳۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۳۴۔ کے : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۳۹۱

۳۰۴۔ چارلس ریکس : Notes on the revolt in the N. W. Provinces of India (1858) PP 156

۳۰۵۔ منقول از تصنیف کیو براؤن جلد دوم صفحہ ۳۷

۳۰۵۔ مٹکاف : بحوالہ تصنیف صفحہ ۸۷

۳۰۶۔ ایضاً صفحہ ۸۷

۳۰۷۔ ایضاً صفحہ ۹۳۔ کوپر بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰۳

۳۰۸۔ مٹکاف : بحوالہ تصنیف صفحات ۹۴-۱۹۳

۳۰۹۔ ایضاً صفحات ۱۶۵، ۱۷۸

۳۱۰۔ ایضاً صفحہ ۲۲۰۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۵۴

۳۱۱۔ کیو براؤن : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۳۹۔ ملاحظہ فرمائیں حاشیہ نمبر ۲۵۲

۳۱۲۔ مٹکاف : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۹

۳۱۳۔ ایضاً صفحہ ۹۳

۳۱۴۔ ایضاً صفحہ ۲۰۳

۳۱۵۔ ایضاً صفحہ ۲۱۴

۲۵۵۔ گبنس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۹۸

۲۵۶۔ میور۔ بحوالہ تصنیف صفحات ۸۳-۳۸۲

۲۵۷۔ حکومتِ ہند بنام وزیرِ ہند : منقول از تصنیف ہٹریچے صفحہ ۳۸۱

۲۵۸۔ اسٹریچے : ایضاً صفحات ۸۲ - ۳۸۱

۲۵۹۔ ایضاً صفحہ ۳۸۲

۲۶۰۔ کننگھم : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰

۲۶۱۔ منقول از تصنیف اشوک مہتہ صفحہ ۷۴

۲۶۲۔ ایضاً صفحات ۷۳-۷۱

۲۶۳۔ بحوالہ مقام

۲۶۴۔ ایضاً صفحہ ۷۴۔ گبنس نے لکھا: "برطانوی سلطنت ہندوستان میں پہلے حقیقتاً" اعتقاد پر مبنی تھی۔ اس کے بعد یہ مادی قوت کی مستحکم بنیاد پر قائم ہوگی۔ پہلے ہم نے اس فوج پر بھروسہ کیا جو ملکی رعایا سے بھرتی کی گئی تھی۔ اس کے بعد ہم اپنے ہم وطنوں کی سنگینوں پر زیادہ اعتماد رکھیں گے۔" (بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۳۶)

۲۶۵۔ ریکس کا بیان ہے: "'مسلمان' باغی کا مترادف کلمہ تھا" (بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۵) نیز ملاحظہ فرمائیں بال : بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحات ۷۹، ۹۲ - کیو۔ براؤن : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۷۲۔ انس : The Sepoy Report صفحہ ۸

۲۶۶۔ سر ولیم میور Indian Mutiny: Intellegence Record مطبوعہ ۱۹۰۲ء جلد اول، صفحہ ۲۷۳

۲۶۷۔ سی۔ الف۔ اینڈریوز : Maulvi Zakaullah of Delhi P 38

۲۶۸۔ منقول از تصنیف محمد نعمان : Muslim India مطبوعہ ۱۹۴۲ء صفحہ ۲۲

۲۶۹۔ سر ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر : Our Indian Musalmans طبع دوم، مطبوعہ ۱۸۷۲ء صفحہ ۱۷۰

۲۷۰۔ سیلے : The expancion of England طبع ہشتم۔ مطبوعہ ۱۹۱۳ء صفحہ ۳۶۳

۲۷۱۔ مہتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۰

۲۷۲۔ مارکس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۵ ۲۷۳۔ ایضاً صفحہ ۲۵ ۲۷۴۔ ایضاً صفحہ ۶۶

اس کا ہم شکریہ کے ساتھ اعتراف کرتے ہیں۔" (صفحہ ۵۶) نیز ملاحظ فرمائیں بروس ٹائی بنٹ میکلی :
English Education and the Origin of Indian Nationalism - مطبوعہ ۱۹۴۰ء صفحات ۲۷-۲۲۶

۲۳۸- مغلیہ حکومت

۲۳۹- ایس.بی.بیکزسن : Memorials of service in India. صفحہ ۳۱۱

۲۴۰- Political proceedings : نمبر ۲۸۰ ، ۳۰ دسمبر ۱۸۵۹ء

۲۴۱- نانا صاحب نے ملکۂ معظمہ ، پارلیمنٹ ، کورٹ آف ڈائرکٹرس ، گورنر جنرل وغیرہ کے نام ایک خط مورخہ ۲۰ راپریل ۱۸۵۹ء میں لکھا کہ یہ تعجب اور حیرت کا مقام ہے کہ آپ نے ان لوگوں کو معاف کر دیا ہے جو واقعی قاتل ہیں اور اس کو معاف نہیں کیا گیا جو بحالتِ مجبوری باغیوں کے ساتھ شامل ہوا۔ (Political proceedings نمبر ۷۰-۶۳ ، ۲۷ رمئی ۱۸۵۹ء نمبر کے۔ڈبلیو ۶۳)

۲۴۲- مارکس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸

۲۴۳- اینڈرسن اینڈ صوبیدار : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۴

۲۴۴- مٹکاف : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱

۲۴۵- ملاحظ فرمائیں مذکورہ بالا فصل پنجم

۲۴۶- مٹکاف ، بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱۴

۲۴۷- میجر جنرل سر اووِن ٹوڈر برن : Clyde and Strathnairn مطبوعہ ۱۸۹۱ء صفحہ ۵۵ - این۔

۲۴۸- بال : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۶۰۹

۲۴۹- رسل : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۲۴

۲۵۰- ملاحظ فرمائیں حاشیہ نمبر ۲۶۱

۲۵۱- بنڈل ۱۹۹ ، نوٹیو نمبر ۲۵ (فارسی) ، ۷ اگست ۱۸۵۷ء

۲۵۲- اسٹریچے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۸۰

۲۵۳- پی۔ای۔رابرٹس : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۳۸۹

۲۵۴- ریمزے میور : بحوالہ کتاب صفحہ ۳۸۲

تھی۔ خوشحال زندگی کی خواہش کی ترجمان تھی۔
اس کے علاوہ وہابی تحریک مزدور عوام کی بہتر اور زیادہ خوشحال زندگی کی خواہش کی ترجمان تھی۔
اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس دور کے وہابی راہنماؤں میں مزدوروں کی قوت اور استقلال کی
بھی جھلک ملتی ہے اور زوال پذیر حکمران طبقے کی الجھنوں کی بھی۔

اس مقالے میں ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہابیوں کے رول کا جائزہ لیں گے لیکن ان
واقعات کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے جنھوں نے احیائے اسلام کی روایت کی خاص شکل اختیار کی ہیں
کسی قدر پیچھے سے شروع کرنا ہوگا۔

۱۔ روایت

شاہ ولی اللہ

علما (خاص طور پر سُنّی اور ابو حنیفہ کے فرقے سے تعلق رکھنے والے) روایتاً مغلیہ سلطنت
کا لازمی حصہ تھے۔ بالعموم تعلیمی اداروں کا اہتمام انھیں کے سپرد تھا۔ یہی عدالت کے منصبوں پر فائز
ہوتے تھے اور اوقاف کے نگران ہوتے تھے۔ جب "فتاویٰ عالمگیری" (جو اورنگ زیب کے عہد
میں قانونِ شریعت کا خلاصہ تھی) مرتب ہو کر نافذ ہوئی تو علما کو حکومت کے معاملات میں کافی عمل دخل
حاصل ہو گیا۔ اس کی وفات کے بعد یہ اور بھی بڑھ گیا کیوں کہ جلد ہی مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہو گیا۔
تیموریوں کی بحالی کا مسئلہ نہ صرف مغل حکمرانوں کے لیے بلکہ علما کے لیے شدید اہمیت اختیار کر گیا کیونکہ
انھیں پر علما کا انحصار تھا۔ اس مرحلے پر شاہ ولی اللہ (وفات ۱۷۶۲ء) سامنے آئے جو احیائے اسلام
کے حامیوں میں سب سے زیادہ جدت پسند اور تعمیری مفکر تھے اور جو سیاسی حقائق سے بخوبی آشنا تھے۔
انھوں نے ابتدا ہی میں یہ بات تسلیم کی کہ چند خاندانوں میں دولت کا اجتماع اور اس کی غیر مساوی تقسیم
ایسی خرابیاں ہیں جو لازمی طور پر سماج میں تنزل اور افراتفری کا سبب ہوتی ہیں۔ اس لیے انھوں نے
اس اشد ضرورت پر زور دیا کہ قومی دولت کی منصفانہ اور مساوی تقسیم ہو اور ساتھ ہی سماج کا ایک
متوازن ڈھانچہ ہو اور پیداکاروں کی سلامتی اور ان کی سماجی مجلسی آزادی کی ضمانت ہو۔ ان کا کہنا تھا
کہ اگر یہ شرائط پوری نہ کی گئیں تو شہری سماج تباہ ہو جائے گا۔

شاہ ولی اللہ نے مغلیہ سلطنت کے زوال کا سبب ان بھاری اور ناقابلِ برداشت ٹیکسوں
کو قرار دیا جو کسانوں، کاریگروں، تاجروں یا دوسرے لفظوں میں پیداوار میں مشغول لوگوں کو

کے۔ ایم۔ اشرف

احیائے اسلام کے حامی اور ۱۸۵۷ء کا انقلاب

اگر ہم ۱۸۵۷ء سے متعلق سرکاری اور برطانوی دستاویزات کا مطالعہ کریں تو دھندلا سا گمان ہوتا ہے کہ احیائے اسلام کے حامی گروہوں، بالخصوص وہابیوں کا اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا۔ جا بجا جہاد کی دعوت، بڑے شہروں میں مولویوں کے فتووں اور بغاوت کے اہم مراکز میں سبز علم کی نمائش کا ذکر ملتا ہے۔ ان سب باتوں سے ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات میں احیائے اسلام کی تحریک کا رنگ تھا۔ بہادر شاہ کے مقدمے کے سلسلے میں یہ بیان قلمبند کیا گیا کہ جنرل بخت خاں ایک وہابی تھا اور اس نے سرفراز علی نام کے ایک شخص کو مجاہدین کا سالار مقرر کر اور یہ کہ مختلف مقامات سے وہابیوں کے دستے باغیوں کے ساتھ شامل ہوئے۔ ان مقامات میں ٹونک بھی شامل تھا۔

البتہ اس سے اس بغاوت میں ان کے حصے یا کارناموں کی مکمل اور واضح تصویر نہیں ملتی۔ درحقیقت اس بات کی اہمیت کو پورے طور پر نہیں سمجھا جاتا کہ احیائے اسلام کا رجحان مسلمانوں کے سیاسی نظریات کی تشکیل میں فیصلہ کن اثر رکھتا تھا اور یہ کہ صرف وہابی ہی تھے جو انگریزوں کے خلاف محکم عقائد کے ساتھ لیس ہو کر میدان میں نہ صرف خود اترے بلکہ ان کی پشت پر سارے شمالی ہندوستان میں منظم مراکز کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ جنوب میں رہنے والوں کے ساتھ بھی ان کا رابطہ تھا اور ملک کے طول و عرض میں روشن خیال مسلمانوں پر انھیں اثر و رسوخ بھی حاصل تھا۔ ایک طرح دیکھا جائے تو سیاست اور مذہب کے متعلق وہابی نظریہ حکمران مسلم طبقوں کی اس صد سالہ مخالفت کا آئینہ دار تھا جو برطانیہ کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے انھیں تھی۔

سمیت تمام مغل حکمرانوں کو انگریزوں کے خلاف نئے جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔[۶] چوں کہ شاہ عالم سندھیا کا محض ایک وظیفہ خوار تھا اس لیے وہ اس مہم میں شامل نہ ہوا۔ ٹیپو نے حکم دیا کہ جمعہ کے خطبہ میں مغل شہنشاہ کے نام کی جگہ اس کا اپنا نام شامل کر دیا جائے۔[۷] بحیثیت ایک مطلق العنان فرماں روائے اسلام اور احیائے اسلام کے حامی کے ٹیپو نے نہ صرف اپنی مملکت اور حیدرآباد کی پڑوسی ریاست میں انگریزوں کے خلاف جہاد کی تلقین کی بلکہ دور دور کے صوبہ بنگال اور کاٹھیاواڑ کو بھی اپنے سفیر بھیجے۔[۸] یہ اسلام میں نئی روح کی دلیل ہے کہ جب سرنگاپٹم پر انگریزوں نے ۱۷۹۹ء میں قبضہ کر لیا تو ٹیپو نے ہاتھ میں تلوار لے کر لڑتے ہوئے جان دینے کا فیصلہ کیا۔

انگریزوں کے خلاف لڑنے کا جو جذبہ اس نے بیدار کیا تھا وہ جلد ہی ۱۸۰۶ء کے غدر ویلور میں رونما ہوا۔ جنرل برگس کے قول کے مطابق "جنوب میں ہمارے اقتدار کو مٹانے کے لیے غیر مطمئن مسلمانوں کی طرف سے یہ پہلی کوشش تھی"۔ جنرل موصوف نے مزید لکھا ہے کہ اس کی اپنی رجمنٹ کے مسلمان فوجی جو اس وقت حیدرآباد میں متعین تھے مخالفانہ سازشوں میں دل سے شریک تھے اور اس کے بہت سے برطانوی افسر "اپنے سرہانے بھرے ہوئے پستول" رکھ کر سوتے تھے۔[۹] درحقیقت یہ ۱۸۵۷ء کا ریہرسل تھا۔ اس وقت کے گورنر مدراس لارڈ بنٹنک نے کہا کہ ہندوستانی پیادہ اور رسالہ فوج کو مذہب کے سوال پر حسن تدبر کے ساتھ بھڑکایا گیا تھا اور "شورش پسند عناصر سلطان ٹیپو کے کسی بیٹے کے تحت از سرِ نو مسلم حکومت کے قیام کا منصوبہ بنا رہے تھے"۔[۱۰] کسی "بڑے دھاکے" کی روک تھام کے لیے اس نے بے حد چوکس رہنے کی تاکید کی کیوں کہ سازش دور دور تک فوج میں پھیل چکی تھی۔[۱۱]

ان حالات میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ۱۸۵۷ء میں سرنگاپٹم کے مسلمانوں نے دہلی کے باغیوں کی کامیابی کے لیے سلطان ٹیپو کے مقبرے پر جا کر باقاعدہ دعا مانگی۔[۱۲] بہادر شاہ جو دہلی کی باغی حکومت کا صرف نام کا سربراہ تھا، اس احساس سے شرم اور ذلت محسوس کر رہا تھا کہ انگریزوں کے خلاف سلطان ٹیپو کا جہاد ہندوستانی فوج کی حمایت اور امداد سے محروم رہا۔[۱۳]

احیائے اسلام کے حامی بنگال کے فرائضی

مسلم نشاۃِ ثانیہ کی ترقی میں بنگال کے فرائضی احیائے اسلام میں زرعی اصلاحات کے رجحانات کے ترجمان ہیں۔ یہ ۱۷۹۳ء کے بندوبست دوامی اور برطانیہ کی اس اقتصادی پالیسی کے اثر

حکمران طبقہ کے عیش و آرام کی فراہمی کی خاطر ادا کرنے پڑتے تھے۔ مسلم حکومت کی دوبارہ تعمیر کی خاطر
ایک نئی نظریاتی بنیاد ڈالنے کے لیے انھوں نے حضرت محمدؐ کی احادیث کی روشنی میں قرآن مجید کی
حقیقی تعلیمات پر زور دیا۔ انھوں نے ایک طرف خلافت اور امامت کے عقائد کے بیچ (یعنی سُنی اور شیعہ
فرقوں کے بیچ) اور دوسری طرف شریعت اور طریقت یعنی قدامت پسندی اور تصوف کے درمیان
بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ شاہ ولی اللہ بلاشبہ انیسویں صدی کے احیائے اسلام کے
ممتاز محرکوں میں ہیں جنھوں نے برطانوی حکومت کے خلاف پے در پے شورشوں کی تنظیم اور قیادت کی۔

سلطان ٹیپو

دکن میں مسلمان، مسلم معاشرے کے اساسی تعمیر نو کے مسئلے سے دوچار نہیں تھے بلکہ انھیں
برطانوی جارحیت کی ٹھوس حقیقت سے سامنا تھا۔ سلطان ٹیپو نے اسلام میں نئی روح پھونکنے کا
بیڑا اٹھایا۔ اس لیے پیچھے کی طرف دیکھنے کی بجائے اس نے ۱۷۸۹ء کے انقلابِ فرانس کے انقلاب انگیز
تصورات سے بھی بکثرت استفادہ کیا اور نپولین کے فنِ حرب سے بھی۔ اس کا جدت پسند مسلمانوں کا
"احمدی" دستہ جدید ترین یورپی نمونے پر منظم کیا گیا تھا اور مغل امراء کی فوج کے مقابلے میں عثمانی
ترکوں کے جاں نثار سپاہیوں سے زیادہ مشابہ تھا۔ احیائے اسلام کے اپنے دعوے کی رعایت سے
وہ بعض اوقات جہاں گیر کے ہمعصر سید احمد سرہندی کی تصنیفات کا حوالہ دیتا تھا۔ جیسا کہ ولزلی پیپرز
(Wellesley) سے ظاہر ہے سرنگاپٹم میں ایک باقاعدہ انجمن جمہوریہ قائم کی گئی
اور ایک رات ٹیپو سمیت انجمن کے اراکین نے رسمی طور پر بادشاہت کے تمام نقوش کو جلا دیا اور اس
کے بعد ایک دوسرے کو "شہری" کہہ کر مخاطب کرنے لگے۔ جمہوریت کی طرف اس رجحان کی تصدیق اس
امر سے بھی ہوتی ہے کہ ٹیپو نے اپنے فوجیوں کے نام احکام جاری کیے کہ وہ سلام کے سادہ دستور کے
مطابق ایک دوسرے سے "سلام علیکم" اور اس کے جواب میں "وعلیکم السلام" کہہ کر خطاب کریں
اور قدیم درباری کے پُر تکلف اور رسمی آداب کو ترک کر دیں۔ اپنی قلمرو میں سلطان ٹیپو نے تمام
مسلمانوں کو روزی کے وسائل بہم پہنچانے کا بیڑا اٹھایا اور جو لوگ تجارت یا زراعت کا پیشہ اختیار
کرنا چاہتے تھے ان میں سے ہر ایک کو حکومت کی طرف سے ضروری سرمایہ اور زمین حسبِ ضرورت
مہیا کی جاتی تھی۔

ٹیپو نے انگریزوں کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن قرار دیا۔ اس نے مغل شہنشاہ شاہ عالم

قابل اور نڈر شاہ عبدالعزیز کے حصے میں آئی جس نے بلا تامل اعلان کیا کہ دہلی سے کلکتہ تک سارا ملک نصرانیوں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔ وہ مطلق العنان اور اعلیٰ اقتدار کے مالک ہیں جب کہ حیدرآباد، لکھنؤ اور رام پور کے نام نہاد مسلمان حکمران ان کے رحم و کرم پر ہیں۔[19] دوسرے لفظوں میں ہندوستان شرع کی رو سے دارالاسلام نہیں رہا اور اب اسے دارالحرب تصور کرنا ہوگا۔

اس سے کلیتہً ایک نئی اور نازک صورتِ حال پیدا ہوگئی کیوں کہ جب ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا تو مسلمانوں پر یہ فرض ہو گیا کہ وہ یا تو انگریزوں کے خلاف جہاد کریں یا کسی آزاد مسلم ملک کو ہجرت کر جائیں۔ اس کے سوا کوئی اور چارہ نہ تھا۔ اگر کسی ناگزیر سبب کی بنا پر انھیں انگریزوں کے تحت رہنا ہی پڑے تو انھیں انگریزی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔ انگریز غاصبوں کے ساتھ دوستی یا آشتی ممکن نہیں، درحقیقت یہ قطعی طور پر حرام تھی۔

اگلا قدم امام کا انتخاب تھا جو جہاد کا اہتمام کرے اور جس کے ہاتھوں بیعت کی جائے اور حلفِ وفاداری اٹھایا جائے۔[20]

مناسب مدت کے بعد سید احمد بریلوی (۱۷۸۶ء۔۱۸۳۱ء) کو امام اور امیرالمسلمین منتخب کر لیا گیا جب کہ ولی اللہ کے خاندان کے محمد اسماعیل (وفات ۱۸۳۱ء) کو اس کا نائب اور ناظم محاربات مقرر کیا گیا۔ سید احمد نے نہایت شدت کے ساتھ کہا کہ اگر کوئی امامت (یعنی سید احمد بریلوی) کی قبول کرنے سے انکار کرے یا قبول کر کے منحرف ہو جائے تو اسے اسلام کا غدار سمجھا جائے اور اسے وہی سزا دی جائے جو کسی اور کافر کو۔[21] یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ یہ وہابی (جنھوں نے بعد میں سید احمد بریلوی کی قیادت میں قرآن کے اصولوں پر مبنی حکومت قائم کی) چھوٹے تاجروں، رعیت اور کاریگروں پر عاید کی گئی قدیم اور ناجائز چنگی اور محصول کو اسلام کے انشا و منشا کے منافی سمجھتے تھے۔ وہ کھلم کھلا مقامی حکام کے جبری مطالبات کی وجہ سے ان کی مذمت کرتے تھے۔ ان حکام میں قاضی اور کوتوال بھی شامل تھے۔ محمد اسماعیل نے اپنی ذہانت سے مغل شہنشاہوں کے جدِ امجد تیمور کی حکومت کے زمانے میں صادر کیے گئے ایک فتوے میں اُن بنیادی اصلاحات کا جواز ڈھونڈ نکالا۔[22] اس طرح وہابیوں نے لوگوں کو تلقین کی کہ وہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر سرکار کا مقابلہ کریں اگر اس کے قانون کی تعمیل سے احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔[23] ان کے پیرو اِدھر اُدھر پھرتے اور کھلم کھلا یہ پرچار کرتے کہ ظالم اور جابر کی ہر کام میں مزاحمت کی جائے۔[24]

یہ عجیب بات ہے کہ سربرآوردہ وہابی مفکرین نے امام کے تصور کی بنیاد مطلق العنانی پر رکھی

سے وجود میں آئے جس نے قدیم مسلمان زمینداروں کو ختم کیا اور بنگال کی دستکاریوں کو تباہ کر دیا
ڈھاکہ کی آبادی ایک لاکھ پچاس ہزار سے گھٹ کر بیس ہزار رہ گئی۔ یہ لوگ زمینداروں کو زمین سے
بلامعاوضہ بے دخل کرنے کا پرچار کرتے تھے۔[14] فریدپور کے شریعت اللہ نے ۱۸۰۴ء میں فرائضی تحریک
کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے نئے زمینداروں کی جبری وصولیوں کے خلاف اسی
کے نام پر متحد کیا جس میں پھر سے جان ڈالی گئی تھی۔ "اس وقت عام خیال تھا کہ فرائضیوں کا اصل مقصد
غیرملکی حکمرانوں کو نکالنا اور مسلمانوں کے اقتدار کو بحال کرنا ہے۔" بنگال کی سرکار کے سپرنٹنڈنٹ
پولیس ڈیمپیئر نے بعد میں یہ خیال ظاہر کیا[15] اور شریعت اللہ کے بیٹے اور جانشین دودو میاں کی
انگریزوں کے خلاف سرگرمیوں سے اس کی تصدیق ہو گئی۔

دودو میاں نے بارا سیت میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے فوجیوں کے خلاف جداگانہ مگر ناکام شورش
کے ساتھ ۱۸۳۱ء میں سکھوں کے خلاف سید احمد بریلوی کی معرکہ آرائی (جس پر بعد میں بحث ہوگی) کی
تقلید کی۔ اس نے اپنے باپ کو بھی مات کر دیا جب اس نے کھلم کھلا یہ تلقین کی "خدا کی زمین پر کسی
انسان کو ٹیکس لگانے کا حق نہیں۔" اس نے دین دار بزرگوں کی زیر صدارت دیہاتی عدالتیں بھی قائم کیں
"اگر کوئی اپنا مقدمہ انگریزی عدالت میں لے جاتا تو اُسے سماج کی طرف سے مقررہ سزا دی جاتی۔"[16] نیا
میں فرائضی گویا "سُرخ جمہوریت پسند" تھے۔ وہ "بلا تعصب ہندو اور مسلمان زمینداروں کے گھروں میں
یکساں نقب لگاتے۔" ڈیمپیئر نے یہ بھی دیکھا کہ اسی ہزار فرائضیوں کی جماعت جو کامل مساوات کا دعویٰ
کرتی تھی، "ادنیٰ طبقوں کے لوگوں پر مشتمل تھی۔"[17] آخرش دودو میاں کا تصادم ہندو اور مسلمان
زمیندار امراء اور ۲۴ پرگنہ، نادیہ اور فریدپور کے ضلعوں میں وسیع کھیتوں کے انگریز کارخانہ دار مالکوں
کے ساتھ ہوا۔ اس نے ۱۸۳۸ء، ۱۸۴۱ء، ۱۸۴۴ء اور ۱۸۴۶ء میں کسانوں کے فسادات کو بھی منظم
کیا۔ ۱۸۵۷ء میں جب دہلی کی بغاوت کی خبر پہنچی تو اسے گرفتار کر کے حراست میں لے لیا گیا۔[18]

وہابیوں کا نعرۂ جہاد

۱۸۰۳ء میں دہلی میں لارڈ لیک کی آمد کے ساتھ علماء کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز
ہوا جب انھیں قرآن کے اصولوں اور احکام شریعت کی روشنی میں برطانوی حکمرانوں کی نسبت مسلمانوں
کی شرعی حیثیت کی وضاحت کرنے کو کہا گیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا کیوں کہ شریعت میں کوئی ایسا تصور
ہی نہیں ہے کہ جہاں مسلمانوں کے محکوم ہونے کا سوال ہو۔ خوش قسمتی سے شاہ ولی اللہ کی جانشینی

کے ساتھ ان کی عقیدت اور وہابی مقصد کے ساتھ ان کی ہمدردی میں تا عمر کوئی فرق نہ آیا۔[20] انھوں نے اپنی اُردو مثنوی کو مناجات کے ساتھ ختم کیا جس میں انھوں نے "مجاہدینِ اسلام" کے ساتھ شہید ہونے کی دعا مانگی۔

سر سید احمد خاں جب دہلی کے بلند رتبہ اشخاص کا ذکر اپنی کتاب میں کرتے ہیں تو وہ اس میں نہ صرف بعض وہابی رانہماؤں کو شامل کرتے ہیں بلکہ وہابیوں کی دعوتِ جہاد کے مذہبی تقدس کی مبالغہ آمیز تعریف کرتے ہیں۔ ان کی نگاہ میں شاہ عبدالعزیزؒ علما میں سب سے زیادہ سربر آوردہ ہستی ہیں اور ان کے مسلمہ قائد اور استاد ہیں۔ "سید احمد بریلوی کو" مومنین اسلام کی صحبت میں نہ صرف شرفِ شہادت نصیب ہوا بلکہ یہ حادثہ پہلے سے ان پر منکشف ہو چکا تھا۔ اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ لاکھوں مسلمانوں کو جہاد کے عظیم ثواب کا یقین ہے۔ وہ راہِ خدا میں اپنی جان و مال کی قربانی کو سعادتِ دینی تصور کرتے ہیں اور محمد اسماعیل اور عبدالحیٔ کی دکھائی ہوئی راہ پر گامزن ہوتے ہیں۔[21]

سید احمد بریلوی اور محمد اسماعیل کی وفات کے پندرہ سال بعد (جب وہابی مجاہد شمال مغربی سرحدی صوبہ کے اُس پار دور دراز کی بستی ستانہ کو انگریزوں کے ساتھ لڑنے کے لیے پاپیادہ جا رہے تھے) سر سید احمد خاں "احکام محمدی کی اطاعت" کرنے والوں کی تعریف کرتے نہ تھکتے اور "جہاد کو" انتہائی دینی تقدس کا فعل تصور کرتے جس کا ثواب جہاد کے قائد شہید محمد اسماعیل کی روح پاک کو پہنچتا ہے"[22] اواخر زندگی میں جب سر سید انگریزوں کے طرفدار ہو گئے تو انھوں نے چراغ علی کو جہاد سے متعلق آیاتِ قرآنی کی ایسی تفسیر کرنے پر آمادہ کیا جس کی رو سے جہاد صرف مدافعت کی غرض سے ہے اور اس کی حیثیت فرض [illegible] نہیں ہے۔[23]

جہاد کی وہ چنگاری جس سے سر[illegible] بھی ۱۸۴۶ء سے پہلے اعتقاد اور ہمت کی روشنی پائی ۱۸۵۷ء میں ایک بار ایک شعلہ بن گئی [illegible] نے اپنا زندگی بھر کا مشغلہ تعلیم و تدریس ترک کر دیا اور انگریزوں کے خلاف لڑائی میں مجاہدین کے ساتھ شامل ہو گئے۔[24]

۱۸۵۷ء سے قبل وہابیوں کی سرگرمی

اولین وہابی رانہماؤں کے سوانح حیات یا ان کی معرکہ آرائیوں پر بحث کرنا اس مضمون کے دائرے سے باہر ہے۔ جو لوگ ایسی تفصیلات سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ ہنٹر کی کتاب ملاحظہ

اور ان کا امام دہلی کے تخت پر بیٹھنے والے جنگ باز اور مطلق العنان سلاطین کی شبیہ تھا۔ کوئی بھی عوامی یا جمہوری طرزِ حکومت ان کے نظریات کے سراسر منافی دکھائی دیتی تھی۔ ان کی اصطلاح میں امام کا درجہ "سبطِ نبیؐ" کا ہے اور اس کے کارندے اس کے "فرض شناس خدام اور جاں نثار غلام" تھے۔ اگر امام کا کوئی مقلد اپنے آپ کو درجے میں اس کے برابر سمجھتا تو اس پر نمک حرامی کا الزام عاید ہوتا اور اس کی یہ تقصیر قدرتی طور پر شاہی قہر و عتاب کا موجب ہوتی[۲۵] خود سید احمد بریلوی، شاہ عبدالعزیز کے بیٹے محمد اسحاق کو صاحبزادہ والا تبار کہہ کر پکارتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہابی قدیم اور بوسیدہ نظام جاگیرداری کو بحال کر کے اور احیائے اسلام کے اس مقدس فرض کو جاگیردار سرداروں کے سپرد کر کے ختم ہو گئے جس کی خاطر ان کی ایک کثیر تعداد نے جانیں قربان کیں۔

ہمارے فوری مقصد کے لیے فی الحال یہ جاننا کافی ہے کہ ہندوستان کے وہابیوں نے مسلم عوام کو بیدار کیا اور انھیں برطانوی اور مسلمان جابروں کے سیاہی جور و ستم اور ہندوستانی مفاد پرستوں کے معاشی استحصال سے نجات حاصل کرنے پر اکسایا۔ انھوں نے مسلم معاشرے کے اندر طبقاتی امتیازات کو کسی قدر مٹانے میں مدد دی اور اصلاح کے لیے روشن خیال طبقے کو غیر مطمئن عوام کے ساتھ متحد ہونے پر آمادہ کیا۔ احیائے اسلام کی تحریک ان وہابی راہنماؤں کی اولین کوششوں کی رہینِ منت ہے جس سے انگریزوں کے خلاف مسلم معاشرے کے مختلف طبقوں میں بھی اتحاد کا ایک وسیع محاذ پیدا ہو گیا۔ اس محاذ میں سب ہی شامل تھے — جائیدادوں سے محروم امرا، تباہ حال دستکار، ناکام و نامراد علما، اور غیر مطمئن فوجی۔ یہی نہیں بلکہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے بھی ایک مشترک محاذ قائم کیا۔ بقول ڈاکٹر ہنٹر ان کا نظام "واقعی ایک بیقرار آبادی کے امید و بیم کے ساتھ ہم آہنگ تھا"[۲۶]

وہابیوں کے نعرۂ جہاد کی جاذبیت اور تاثیر کا اندازہ کرنے کے لیے آیئے دو مشہور امرا کے تاثرات کا مطالعہ کریں۔ ایک مومن خاں (۱۸۰۰ - ۵۱ء) اردو و فارسی کے ممتاز شاعر اور دوسرا سرسید احمد خاں (۱۸۲۰ - ۹۸ء)، مشہور سماجی رفارمر اور وہابی جنہوں نے بعد میں ان خیالات کی تردید کرنے کی کوشش کی جو انھوں نے ۱۸۴۶ء تک پیش کیے تھے۔[۲۷]

مومن خاں نے "اسلامی فوج کے سپہ سالار اور نیک سیرت امام" (یعنی سید احمد بریلوی) کے سکھوں کے خلاف جہاد کی عظمت پر اور ضمناً اپنے ایمان کو تازہ کرنے کے لیے فارسی اور اردو میں ایک مثنوی نظم کی[۲۸] مومن خاں عیسائی حملہ آوروں کا بھی چنداں دوستدار نہ تھے۔ ان کی سرگرمیوں نے دہلی کے حکام کو ان کا مخالف بنا دیا جس کی وجہ سے انھیں بڑی پریشانی اٹھانی پڑی۔[۲۹] امام

۱۸۲۰ء میں جب سید احمد بریلوی سکھوں کے ساتھ جنگ کے واضح مقصد کی تکمیل کے لیے کلکتہ گئے (کیوں کہ رنجیت سنگھ کی قلمرو میں اسلام پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں) تو انگریز ان کی حوصلہ افزائی اور مدد کرنے کو بے تاب تھے لیکن آگے چل کر جب سرحد کے وہابیوں نے سوات کے حکمران کی (جس کی انگریز دشمنی مشہور تھی) اور انگریزوں کے خلاف لڑائیوں میں شریک ہونے لگے تو انگریزوں کو اپنے رویّے اور پالیسی پر نظر ثانی کرنی پڑی۔ یہ اور بھی ضروری ہو گیا جب انھیں معلوم ہوا کہ وہابی مجاہدین جنگِ افغانستان کے دوران ان کے دشمنوں کی طرف سے لڑ رہے تھے اور نظام کا بھائی مبارز الدولہ جو سید احمد بریلوی مرحوم کا نائب اور رئیس المسلمین ہونے کا دعویٰ کرتا تھا برطانوی حکومت اور اس کے پٹھو نظام کا تختہ الٹنے کی غرض سے سارے ملک میں تعلقات قائم کر رہا تھا۔[۲۷]

۱۸۵۱ء میں انگریزوں کو یہ جان کر بڑی پریشانی ہوئی کہ وہابی ان کا تختہ الٹنے کے لیے پنجاب میں سازش کر رہے ہیں اور اس مقصد کے لیے "ہمارے فوجیوں" کے ساتھ نامہ و پیام میں مصروف ہیں۔ ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیان وہابی سرحدی قبائل کو انگریزوں کے خلاف بھڑکاتے رہے جس کا نتیجہ وہ سولہ برطانوی مہمات تھیں جن میں ۳۳۰۰۰ باقاعدہ فوجیوں نے شرکت کی۔ [illegible]ء میں سرحد پر واقع وہابی مرکز نے اپنے منصوبوں کو دہلی اور لکھنؤ کے باغیوں کے منصوبوں کے ساتھ مربوط کیا اور انگریزوں کے خلاف ملک گیر بغاوت کو منظم کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے میں سوات کے حکمران 'اخوند' نے سرحد پر اور پنجاب میں ہندوستانی فوجی دستوں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کی اور صورتِ حال اتنی خطرناک ہو گئی کہ جنرل سر سڈنی کاٹن کو پانچ ہزار جوانوں کے ساتھ سرحد کی طرف کوچ کرنا پڑا۔ ۱۸۶۳ء تک، جب سرحد پر واقع ستانہ کے وہابی مرکز کی قطعی تباہی کے [illegible] اقدامات کیے گئے، انگریزوں کو بیس فوجی مہمات کا اہتمام کرنا پڑا جس میں [illegible] باقاعدہ فوجیوں [illegible] ور امدادی پولیس کے علاوہ ساٹھ ہزار باقاعدہ فوجیوں نے حصّہ لیا۔

۲۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں وہابیوں کا حصّہ

تنظیم اور پروگرام

بعض ہندوستانی عالموں کی رائے ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت غیر مطمئن فوج کے ایک حصّے کی غیر مربوط اور بے ساختہ شورش سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی اور کسی بھی اعتبار سے اسے جنگ

فرمائیں بحث ۱۸۵۷ء کے واقعات کے سلسلے میں ہمیں صرف ان کی تنظیم اور سازشوں سے متعلق ان
طریقۂ کار سے سروکار ہے جو ۱۸۳۱ء میں ان کی فوجی ناکامی کے بعد بھی باقی اور جاری رہیں۔

۱۸۲۰ء ہی میں سید احمد بریلوی ("امام") نے شمالی ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں
اپنے معتبر کارندے متعین کیے جو مرکزی راہنماؤں کی طرف سے نامزد علاقائی خلیفہ کے تحت کام کرتے
مثلاً پٹنہ جو بنگال کا علاقائی مرکز تھا، محمد حسین کے زیر اہتمام تھا۔[۲۵]

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ جوں ہی ۲۱ دسمبر ۱۸۲۶ء کو سکھ سرکار کے خلاف جہاد کا اعلان کیا گیا سر
مجاہد کیمپ کے لیے ان کارندوں نے رنگروٹ بھرتی کرنا شروع کر دیے۔ اسی طرح جب پہلے پشاور
اور پھر ستانہ میں وہابی حکومت قائم کی گئی اور مالی امداد طلب کی گئی تو وہابی مراکز فوراً اس کی مدد
لیے زکوٰۃ جمع کرنے لگے۔ چوں کہ یہ کام مخفی اور خطرناک تھا اس لیے خلیفاؤں یا علاقائی ناظموں کو
کے صدر مقام خود جا کر میعادی رپورٹیں پیش کرنا پڑتی تھیں۔ آگے چل کر وہابیوں نے امام بادشاہ کے
ایک باقاعدہ صدر دفتر، محکمۂ مالیات اور دوسرے لوازماتِ حکومت قائم کیے۔ یہ امام بادشاہ بعد میں
تک پورے شد و مد کے ساتھ فرائض انجام دیتا رہا لیکن شمالی ہندوستان کے وہابی مراکز کی سرگرمیو
آہستہ آہستہ انگریز دشمنی کا رنگ نمایاں ہونے لگا اور برطانوی حکام ان پر شبہ کرنے لگے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہابیوں کو بعض اوقات مختلف علاقوں میں ۲۰۰۰ میل کی دوری
رنگروٹ اور روپیہ بھیجنے پڑتے تھے جس کی وجہ سے بنگال سے ستانہ تک تمام راستے بھر معتبر او
کارندوں کے زیرِ اہتمام خانقاہوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔ اپنی اصلی سرگرمی کو چھپانے کی غ
یہ کارندے مختلف قسم کی تجارت اور پیشوں میں مصروف رہتے۔ مثال کے طور پر فرض کر دکہ
رنگروٹ بنگال سے سرحد پر واقع وہابی مرکز کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں اس کے سفر کی ہر
کے خاتمے پر وہابی خانقاہ کے مہتم نے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس طرح وہ منزل بمنزل چلتا رہا اور
اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ اس طرح ایک رمزی زبان مرتب کی گئی جس سے بڑی بڑی رقم
اسلحہ و بارود بھیجنے میں مدد ملتی۔

درحقیقت اس سازشی طریقے کی تین نمایاں خصوصیات تھیں جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد
مقدمات کے دوران ظاہر ہوا۔ پہلی ان کے ایجنٹوں کی خوش تدبیری اور دانش مندی۔ دوسری
جس کے ساتھ وہ پیچیدہ کام انجام دیتے۔ تیسری، ایک دوسرے کے ساتھ کامل وفاداری اور مر
تک حصولِ مقصد میں ثابت قدم رہنے کا عزم کیوں کہ ان کا اعتقاد تھا کہ خدا تعالیٰ کی رضا یہی

خفیہ کارندوں اور خانقاہوں کا ایک سلسلہ قائم کر کے سازش کا طریقۂ کار تیار کر لیا تھا۔ ان روایتوں اور رابطوں سے فوجیوں کی منتخب کمیٹیاں وجود میں آئیں جنہوں نے عملی طور پر ۱۸۵۷ء میں دہلی و لکھنؤ کی حکومت سنبھال لی اور ساتھ ہی تربیت یافتہ فوجی بھی فراہم کیے جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ لڑنے میں حیرت انگیز تدبّر اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔

یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ ۱۸۵۷ء تک انگریز مخالف تحریکوں کے راہنماؤں نے عوامی پروگرام مرتب کرنے کا چرچا شروع کر دیا تھا۔ نظام جاگیرداری کی اصلاح کی ضرورت کا احساس تو پہلے ہی موجود تھا۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے سے کم از کم وہابی راہنماؤں کے دماغوں میں یہ خیال سمایا ہوا تھا۔ درحقیقت سلطان ٹیپو اس معاملے میں سبقت لے جا چکے تھے جب ان کی حکومت نے بیکاری دور کرنے کی ذمّہ داری سنبھال لی۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ غریب اور بے زمین کسانوں کا تھا۔ بنگال کے فرائضیوں نے نہ صرف زمینداری کو ختم کرنے بلکہ زمینداروں کو زمینوں سے محروم کرنے کا پروگرام بھی وضع کر لیا تھا۔ پس دہلی میں جب بخت خاں نے نمک اور کھانڈ کے محصول موقوف کر دیے اور ذخیرہ اندوزی کو قابلِ سزا قرار دیا تو وہ انگریزوں کی مخالف تحریک کے ایک دیرینہ مطالبے کو عملی جامہ پہنا رہا تھا۔ ایسے ہی اقدامات احمد اللہ اور فوجی کمیٹی نے لکھنؤ میں کیے۔ یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ایک موقعہ پر دہلی کی باغی سرکار نے پانچ بیگھہ زمین معافی دائمی ملکیت کے طور پر ہر اس فوجی کے کنبہ کو عطا کرنے کی پیش کش کی جو انگریزوں کے خلاف لڑائی میں جان دے گا۔[۴۴] درحقیقت بعض عالموں کی یہ رائے ہے کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی اور اودھ دونوں کے دیہات میں عوامی شورش نے کسانوں کی جنگ کی صورت بہت جلد اختیار کر لی جس سے صوبائی حکومت کے وہ لوگ جن کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا ڈر تھا اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ وہ آزاد قومیت کے تصوّر کو قربان کر کے فریقِ مخالف سے مل گئے۔[۴۵]

اس سے انکار نہیں کہ بعض اوقات محبانِ وطن عوام کے مذہبی تعصبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں زمانہ سازی کا ثبوت دیتے اور برطانوی حکام کی بعض رفاہِ عام کی اصلاحات کی مذمت کرنے مثلاً ستی کا انسداد، بیوہ کی دوبارہ شادی کی حوصلہ افزائی اور کچھ حد تک ذات پات میں تبدیلی۔[۴۶] چونکہ ہندو اور مسلمان عوام متحد تھے، دہلی کی باغی حکومت نے ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے گائے کا ذبح کرنا ممنوع قرار دے دیا۔ اس کے عوض ہندو باغی راہنماؤں نے (مثلاً نانا صاحب) از روئے تحسین مغل سرکار کے تمام نشانات کو برقرار رکھا جیسے ــــ سن ہجری کا استعمال، سرکاری

آزادی یا قومی بغاوت کا نام نہ دینا چاہیے۔ بعض باخبر برطانوی مشاہدین جنھوں نے موقعہ پر اس مسئلہ کی تحقیق کی، مذکورہ بالا نظریے کی تائید نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر الیگزینڈر ڈف "بغاوتِ ہند" پر جن کے مراسلات کا سلسلہ بغاوت کے فوراً بعد ہی شائع ہوا، یہ کہتے ہیں کہ "غدر اور بغاوت کو سیاسی سازش کا نتیجہ سمجھنے اور قرار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"[۴۰] وہ اسے "محض ایک فوجی شورش خیال نہیں کرتے بلکہ ایک بغاوت، ایک انقلاب" سمجھتے ہیں جس میں فوجی سپاہیوں کے علاوہ عوام نے انگریزی اقتدار اور برتری کے خلاف شرکت کی۔"[۴۱] اسی طرح مالیسن کا ۱۸۵۷ء سے متعلق مقالہ مشہور ہے۔ بعد میں جب ہندوستانی اس کے ساتھ کھل کر بات کرنے لگے تو اس نے از سر نو چھان بین کی۔ اُسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ کچھ "ایسے خارجی اسباب کام کر رہے تھے جن سے ہندوستانیوں کے دلوں میں کینہ بڑھ گیا اور یہ جذبۂ نفرت شخصی نہیں بلکہ قومی تھا۔"[۴۲]

اگر ہم سلطان ٹیپو کے عہد سے واقعات کا تسلسل دیکھیں تو ہم یقیناً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران ہندوستانی بحیثیت مجموعی برطانوی حکمرانوں سے مقابلہ کرنے کی ایک ملک گیر تحریک کی تیاری کر رہے تھے۔ سلطان ٹیپو نے انگریزوں کے خلاف جہاد میں سارے ہندوستان کو آمادۂ پیکار کرنے کی کوشش کی اور پھر غدر ویلور (۱۸۰۶ء) جو چھوٹے پیمانے پر ۱۸۵۷ء کے انقلاب کا ہی نمونہ تھا۔ البتہ یہ قابلِ ذکر ہے کہ نئے زمینداروں کا طبقہ اور بڑے شہروں میں رہنے والے انگریزیت کے دلدادہ روشن خیال لوگ اس ہنگامے میں شریک نہ ہوئے کیوں کہ ان کی تازہ حاصل کردہ دولت اور سماج میں حیثیت انگریزوں ہی کی وجہ سے تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی قسمت انگریزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔[۴۳]

اس طویل تیاری کی وجہ سے ہندوستان کی جنگِ آزادی کے سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء تک ملکی اور عالمی صورت حال سے اپنی خاص واقفیت حاصل کرلی تھی اور ہندوستانی فوج میں ایک پائدار محاذ قائم کرلیا تھا۔ مثال کے طور پر اٹھارویں صدی کے ختم کے قریب میسور کے سلطان ٹیپو اور اودھ کے نواب وزیر علی دونوں نے ملک کے اندر اور بیرونی ممالک میں انگریزوں کی مخالف قوتوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں ایسی سیاسی چالیں منظرِ عام پر آگئیں۔

اس کے علاوہ ویلور کی شورش (۱۸۰۶ء) کے بعد فوجیوں کی غیر سرکاری سیاسی انجمنوں کا قیام فوجی زندگی کی ایک عام خصوصیت تھی۔ ان انجمنوں نے ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۹ء کے دوران خاص طور پر پنجاب اور صوبہ سرحد میں ان وہابی راہنماؤں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کرلی تھی جنھوں نے

نئی سرکار کے عملے نے نہایت لیاقت، حسنِ انتظام اور ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے اور عارضی حکومت کی عزت کو دشمنوں کے ہاتھوں اس کا تختہ الٹ جانے کے بعد بھی برقرار رکھا۔[۵۲]

۳۔ ۱۸۵۷ء کے راہنما اور وہابی

۱۸۵۷ء کی عظیم قومی تحریک کی پشت پر کون سے راہنما تھے اس بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ بعض لوگ قدرتی طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً یہ بغاوت بہادر شاہ اور واجد علی شاہ کی سازش کا نتیجہ تھی جو شمالی ہندوستان کے دو ممتاز شاہی خاندانوں کے وارث تھے بلکہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مل کر ہندوستانی فوج کو برانگیختہ کیا اور فرنگیوں کے قتلِ عام کا منصوبہ باندھا جس کے بعد برطانوی فوج پر دوسرے ہندوستانی والیانِ ریاست کے حملے کی تجویز تھی۔[۵۳] البتہ اس دعوےٰ کی تائید میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس کے برعکس جو معلومات حاصل ہیں ان سے ظاہر ہے کہ اس وقت بھی جب عارضی حکومت کے معاملات میں ان کو کچھ اختیار حاصل تھا، انھوں نے کوئی خاص رول ادا نہیں کیا۔ ۱۸۵۷ء میں پٹنہ کے ایک پیر علی نامی شخص کے گھر سے جو خطوط حاصل ہوئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہابیوں کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے حکمرانوں کی طرف سے دو جماعتیں علی الاعلان کام کر رہی تھیں مگر اس بات کا کوئی قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ ان حکمرانوں کی طرف سے انھیں کوئی اختیار دیا گیا۔[۵۴] دہلی کے شاہی خاندان کے افراد میں سے اگر کوئی فرد تحریک میں عملی طور پر حصہ لینے اور اس کی رہنمائی کرنے کا دعوےٰ کر سکتا ہے تو وہ مغل شہنشاہ فرخ سیر کا پوتا شہزادہ فیروز شاہ تھا جس کو وہابی پٹھان کنٹنجنٹ کے ان سپاہیوں کی مدد حاصل تھی جو مرہٹہ حکمرانوں کی ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ جہاں تک بیگم اودھ کا تعلق ہے اُن کو فیض آباد کے مشہور مولوی سے ہدایت ملتی تھی جو ہر لحاظ سے "سازش کی روحِ رواں"[۵۵] کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ احمد اللہ خالص وہابی نہ تھا یعنی اہلِ حدیث کے فرقے سے تعلق نہ رکھتا تھا مگر وہ اپنے دکنی ہم وطن سلطان ٹیپو کی طرح احیائے اسلام کا حامی یقیناً تھا اور اس نے اسی مقصد کے پیش نظر سیاسی اقتدار کی بحالی کے لیے کام کیا۔ بہر حال وہ سید احمد بریلوی کے پیروؤں اور وہابیوں کی جماعت کے ساتھ پورے طور پر تعاون کر رہا تھا۔[۵۶] لیکن بغاوت کی سب سے سربرآوردہ شخصیت دہلی کی مرکزی حکومت کا سربراہ بخت خاں ہے جو سلطان پور (اودھ) کا روہیلہ سپاہی تھا۔ بخت خاں نے انگریزوں کے تحت فوجی تربیت کا کافی تجربہ حاصل کیا تھا۔ جب اُس نے روبہ زوال

مراسلات اور اطلاعات میں "بسم اللہ" کا اندراج اور جمعہ کو سرکاری تعطیل۔

بہادر شاہ: قومی اتحاد کی نشانی

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مقبول راہنماؤں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ دہلی کا نام نہاد بادشاہ بہادر شاہ جسے انگریزوں کے ہاتھوں کامل بربادی کا سامنا تھا،[۴۷] قومی اتحاد کی بے بہا نشانی تھا۔ اور جس کے پیچھے ہندوستان کے مختلف فرقے اور طبقے اکٹھے ہو سکتے تھے۔[۴۸] وہ نہ صرف اس بات پر متفق ہوئے کہ مرکزی حکومت کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے اور دہلی کو اس کا پایۂ تخت قرار دیا جائے بلکہ مغلیہ دربار کی قدیم روایات و رسوم کو بھی برقرار رکھا جائے۔[۴۹]

ایسے مستقبل کے تصور سے احیائے اسلام کے حامیوں کو دلی مسرت ہوئی جو ایک مستحکم اور متحد حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے اور امیر تیمور اعظم کے خاندان کے ایک فرد کو امام اور بادشاہ کی حیثیت میں دیکھنے کے متمنی تھے۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ بادشاہ بہادر شاہ لوگوں کی توقعات پر پورے اترے۔ احیائے اسلام کے حامی کی نگاہ میں وہ ایک غازی تھے۔ ایرانیوں یا لکھنؤ کے شیعوں کی نظر میں امام کا درجہ رکھتے تھے اور صوفی کے پیر و مرشد تھے جو ہندوؤں کے دستور کے مطابق مُرید (چیلے) رکھتے ہیں۔ روشن خیال طبقہ بالعموم ان کی شعر نوازی اور علم دوستی کی داد دیتا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ حکومت کی بحالی کی صورت میں وہ تمام لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو رعایتیں دیں گے۔ انھوں نے ہندو راجاؤں کو متبنیٰ کرنے کا حق دینے کا وعدہ کیا۔ قدیم زمینداروں سے کہا کہ ان کا دوامی بندوبست منسوخ کر دیا جائے گا اور لگان میں کافی کمی کی جائے گی۔ ہندوستانی تاجروں سے کہا کہ برطانوی اجارہ داریوں اور بھاری ٹیکسوں کو ختم کر دیا جائے گا اور مال لانے لے جانے کے لیے امداد اور سہولتیں دی جائیں گی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا جائے گا۔ اعلیٰ افسروں کو کم از کم دو سو سے تین سو روپیہ تک ملیں گے اور سپاہیوں کا مشاہرہ دگنا کر دیا جائے گا۔ کاری گروں کو بھی روزگار کے تحفظ کا قول دیا گیا جو بے شک ان کی خوشحالی کی ضمانت تھا۔ درویش صفت بادشاہ نے پنڈتوں فقیروں اور دوسرے مقدس انسانوں کو یاد فرمایا جن کو اکبر یا عالمگیر کی سی شان کے ساتھ معافی کی اراضی بطور وقف عطا کرنے کی تجویز تھی۔[۵۰] انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم بہادر شاہ کے تحت محبانِ وطن کی مختصر حکومت کی داد دیں اور اعتراف کریں کہ دہلی، لکھنؤ، بریلی اور کئی دوسرے مقامات میں

اور ناشائستہ طور طریقوں کا مذاق اڑایا گیا لیکن وہ انگریزوں کے ساتھ ہفتوں لڑا اور انہیں سپہ سالاری میں مات کیا۔ اس نے اس بات کی پوری لیکن ناکام کوششیں کیں کہ فوج کے ہاتھوں دہلی کی شہری آبادی کو کوئی تکلیف نہ ہو اور ہر حالت میں ضابطوں کی پابندی سختی کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ جب بخت خاں دہلی میں وارد ہوا اور فوجی کیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا آئین جمہوری تھا اور جس کے قواعد کی پابندی پر زور دیا گیا تو شاہی خاندانوں کے ذلیل طبع فوجی سرداروں اور امیروں کا وہ انبوہ جن پر بہادر شاہ کی عارضی حکومت کی مجلسِ مشاورت پہلے چند ہفتوں کے دوران مشتمل تھی یکسر منتشر ہو گیا۔

۴۔ دہلی سے باہر وہابی

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے بہت پہلے وہابی تحریک کے رہنما شمالی ہندوستان کے تمام اہم مراکز میں اپنی تنظیم کا جال بچھا چکے تھے اور علاقائی خلیفہ اور معتبر کارکن مقرر کر چکے تھے۔ ۱۸۳۱ء میں سید احمد بریلوی کی وفات کے بعد انہوں نے دکن کے مسلم مراکز جیسے حیدر آباد اور میسور اور وسطی ہندوستان اور راجپوتانہ کی بعض ریاستوں مثلاً بھوپال، ٹونک اور جے پور وغیرہ کے ساتھ بھی رابطہ قائم کر لیا تھا۔ چھاونیوں اور ہندوستانی سپاہ کی فوجی کمیٹیوں میں ان کا اثر و رسوخ ۱۸۴۰ء ہی میں ظاہر تھا۔ مختصر یہ کہ یہ کہنا بجا ہو گا کہ ۱۸۵۷ء تک وہابیوں نے ایک ملک گیر سیاسی تنظیم قائم کر لی تھی۔ خاص طور پر علاقہ دوآب میں یعنی دہلی سے الٰہ آباد تک ہر قابلِ ذکر قصبے میں وہابیوں اور دوسرے احیائے اسلام کے حامیوں کا منظم اور کارکن گروہ موجود تھا جو انگریزوں سے نفرت کرنے میں متحد اور عام بغاوت میں شریک ہونے کے لیے بیتاب تھا۔ درحقیقت اسی نے وہ سیاسی اور تنظیمی بنیاد فراہم کی جس نے بخت خاں اور دوسرے وہابی راہنماؤں کو دہلی کی عبوری حکومت سنبھالنے میں مدد دی۔

۱۸۵۷ء کا آغاز ملک کے دیہاتوں میں چپاتیوں کی تقسیم کے ساتھ ہوا ساتھ ہی یہ افواہیں پھیلائی گئیں کہ برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے والا ہے اور ہندوستانی فوجی کمیٹیوں میں مشورے ہونے لگے[۴۲]۔ اس کے جلد بعد بارک پور میں کارتوسوں کا واقعہ ہوا۔ پھر یہ آثار دکھائی دینے لگے کہ کوئی نہ کوئی عام شورش بپا ہونے والی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں میں سرگوشیوں کی مہم کے ذریعے سارے شمالی ہندوستان میں ایسی شورش کی مقررہ تاریخوں کا بھی عوام میں اعلان کر دیا گیا۔ ساتھ ہی اعلیٰ سطح پر راہنماؤں نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم کیا جیسے احمد اللہ جس کا تعلق مسلمانوں کی

شہزادہ مرزا مغل کی جگہ دہلی کی قوم پرست فوجوں کی کمان سنبھال لی تو اس نے سپہ سالار کا لقب اختیار کیا[۵۹] بخت خاں ہر اعتبار سے ایک کٹر اور متعصب وہابی تھا جو وہابی تنظیم کاروں کے ایک دستے کے ساتھ دہلی آیا اور اپنے روحانی مرشد مولوی سرفراز علی کو ہزاروں مجاہدین کے لشکر کا امام مقرر کیا۔[۶۰] یہ وہابیوں کے جوشِ عمل کا فیض تھا کہ شروع میں تدبیرِ جنگ کی سنگین غلطیوں اور شاہی خاندان کی سیاسی ناپختہ کاری کے باوجود فوج کا حوصلہ آخری دم تک بلند رہا۔[۶۱] وہابی مجاہدین نے دشوار حالات میں نہ صرف جنگ کو جاری رکھا بلکہ دشمن پر وار کرنے میں پہل بھی کی حالانکہ محبانِ وطن کی قوتِ مزاحمت زائل ہو چکی تھی[۶۲] وہابیوں کے جوش کا اندازہ کچھ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بخت خاں کے لشکر میں ہر فوجی نے انگریزوں کے ساتھ آخری دم تک لڑنے کا حلف لیا تھا جب دہلی فتح ہو گئی تو پہلے بخت خاں نے بہادر شاہ کو یہ ترغیب دینے کی کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ چلے اور کسی بہتر مقام پر دوسرا محاذ پیدا کرنے میں مدد دے۔ جب بادشاہ نے انکار کر دیا تو بخت خاں محمدی میں احمد اللہ کی عارضی حکومت میں شامل ہو گیا اور وزیرِ دفاع اور سپہ سالارِ اعظم کے عہدے پر فائز ہوا۔ اس عارضی حکومت میں سرفراز علی قاضی القضاۃ اور نانا صاحب وزیرِ اعظم مقرر ہوئے۔ آخر جب برطانوی حملے کی تاب نہ لا کر انھیں محبانِ وطن کے آخری گڑھ، محمدی سے دست بردار ہونا پڑا اور احمد اللہ کو دغابازی سے ہلاک کر دیا گیا تو بخت خاں نانا صاحب اور دوسروں کے ساتھ سرحد پار کر کے نیپال میں داخل ہو گیا۔

بخت خاں اور وہابیوں کے تحت دہلی کا نظامِ حکومت جمہوری پالیسیوں کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ بخت خاں نے عام استعمال کی چیزوں مثلاً نمک اور کھانڈ پر محصول ہٹا دیا تھا۔ ذخیرہ اندوزی کو قابلِ سزا جرم قرار دیا تھا اور پانچ بیگھہ زمین معافی دائمی حقوقِ ملکیت کے ساتھ ہر اس سپاہی کے کنبے کو عطا کرنے کی پیش کش کی تھی جو انگریزوں کے ساتھ لڑنے میں اپنی جان دے گا۔ ہم محبِ وطن فوج کے آخری دم تک لڑنے کے حلف کا بھی ذکر کر چکے ہیں اور ان کے حیرت انگیز حوصلے کا بھی جب دشمن نے انھیں چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ بخت خاں کے تحت حکومت کی بنیاد عوام کی حمایت اور فوج (جس میں اکثریت باہر سے آنے والوں کی تھی) اور شہر کے صنعت کاروں اور مزدوروں کے تعاون پر تھی[۶۳] بخت خاں خود تحریکِ احیا کا روحِ رواں تھا۔ اس کی عادتیں سادہ تھیں اور وہ عام سپاہی کی طرح زندگی بسر کرتا اور چلتا پھرتا تھا۔ جب پہلی بار دہلی میں وارد ہوا تو اسے کوئی پہچان بھی نہ سکا اور اس کی بھدی صورت، سادہ پوشی

پٹنہ: پٹنہ میں اس سے پہلے کہ صادق پور کے وہابی راہنما کوئی قدم اٹھا سکتے انگریز کمشنر نے ان کو گرفتار کر لیا۔ البتہ ایک مقامی کتب فروش نے جس کا وہابی مرکز کے ساتھ قریبی تعلق تھا تحریکِ مزاحمت کی قیادت سنبھال لی اور مجاہدین کا ایک مسلح دستہ منظم کیا۔ اس ہنگامے میں ایک انگریز کی موت واقع ہوئی؛ شورش اتنے بڑے پیمانے پر تھی کہ اس کو فرو کرنے کے لیے سکھ سپاہیوں کو بلوانا پڑا۔[67]

آگرہ: آگرہ کے لوگوں نے فوراً مشہور وہابی عالم اور سرجن ڈاکٹر وزیر خاں کی سرکردگی میں مجاہدین کا ایک لشکر تیار کیا اور قلعے میں مقیم برطانوی فوج کا محاصرہ کر لیا مگر ڈاکٹر وزیر خاں کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ تھی جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے وہابیوں کے مرکزی راہنماؤں کے زمرے میں شامل کیا گیا وہ بخت خاں اور سرفراز علی کے پیچھے پیچھے پہلے دہلی آیا اور پھر لکھنؤ اور محمدی۔ اس کے بعد وہابی مقامی تحریکِ مزاحمت میں شامل ہو گئے۔

حیدرآباد: جیسا کہ ہم جانتے ہیں مبارز الدولہ کے عہد سے ہی حیدرآباد وہابیوں کا ایک طاقتور مرکز تھا۔ مسلمان فوجیوں میں احیائے اسلام کا جذبہ خاص طور پر شدت کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ہلچل کے دوران اگرچہ نظام نے مسلمانوں کو تحریک میں شرکت کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن دو مشہور وہابی راہنماؤں طرہ باز خاں اور مولوی علاءالدین نے برطانوی ریزیڈنسی پر ایک فوجی حملے کی تنظیم کی۔ یہ حملہ ناکام ہو گیا اور وہابی راہنما گرفتار کر لیے گئے۔ بعد میں طرہ باز خاں کو گولی سے اڑا دیا گیا اور مولوی علاؤالدین کو جلاوطن کر کے انڈیمان بھیج دیا گیا۔[69]

الٰہ آباد: جوں ہی بغاوت کی خبر الٰہ آباد پہنچی قلعہ میں مقیم ہندوستانی فوجیوں نے برطانوی افسروں کو قتل کر ڈالا اور گولہ بارود اور فوجی گودام پر قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں مشہور وہابی راہنما لیاقت علی نے جو پہلے چَیل میں رہتا تھا اور پھر الٰہ آباد شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی، بہادر شاہ کے نام پر سبز علم لہرایا اور قوم پرست فوجیوں کے راہنما رام چندر کے ساتھ مل کر الٰہ آباد سرکار کا صدر مقام خسرو باغ میں قائم کیا۔ لیاقت علی کو یا تو دہلی کی مرکزی حکومت کی طرف سے اختیارات ملے تھے یا مقامی راہنماؤں نے اسے ضروری اختیارات تفویض کیے۔ بہرحال دہلی کے بادشاہ کی طرف سے وہ صوبیدار الٰہ آباد کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہا۔ وطن دوست سپاہیوں کی ابتدائی فتح کے بعد انھیں شکست ہوئی اور انگریزوں نے اُسے معزول کر دیا۔ اس کے بعد لیاقت علی لکھنؤ میں احمد اللہ کے ساتھ جا ملا اور تحریکِ مزاحمت میں شریک ہو گیا یہاں تک کہ اُسے نیپال کی سرحد پر گرفتار کر لیا گیا۔ ہم پہلے ہی اس کے مقدمہ اور ۱۸۷۲ء میں جلاوطنی کا ذکر کر چکے ہیں۔

مختلف جماعتوں اور نانا صاحب کے ساتھ تھا جو ہندو طبقۂ امراء کا نمائندہ تھا۔ یہ راہنما ایک طریق کار پر متفق ہوئے جسے عوام کے ادنیٰ طبقوں میں ہر قسم کے مقامی لوگوں کے ذریعہ اشاعت دی گئی۔ مثلاً علما، تاجر، قدیم زمیندار، بلکہ عام سادھو اور پھرنے والے فقیر۔ بہرحال میرٹھ کے ہندوستانی فوجی اور شہر دہلی کے دربان جانتے تھے کہ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء سے متعلق کون سے کام ان کے ذمے ہیں۔[۲۵] جوں ہی میرٹھ کے سواروں کے وارد ہونے کا اشارہ ملا اور بہادر شاہ کے تحت دہلی میں عارضی حکومت کا اعلان ہوا، سارے شمالی ہندوستان بالخصوص ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہابی تنظیموں کا سلسلہ حرکت میں آگیا۔ روایت کے عین مطابق مذہب کی شیدائی ہر جماعت کے اراکین نے جہاد کے لیے پہلے امیر کا انتخاب کیا۔ پھر اپنے آپ کو اس کے ہاتھوں پر بیعت کا پابند کیا۔ پھر انہوں نے اسلام کا سبز علم لہراتے ہوئے ایک جلوس نکالا۔ مجاہدین کو بھرتی کی دعوت دی اور جہاد سے متعلق فتویٰ کو اشاعت دی۔ اسی اثنا میں اسلحہ خانے پر حملہ کیا گیا، خزانے کو لوٹا گیا اور جیل خانے کے پھاٹک کھول دیے گئے۔ بعض حالتوں میں کاغذات مالگزاری جلا دیے گئے، ساہوکاروں کو مجبور کیا گیا کہ قرضوں کو قلم زد کر دیں۔

اس کے بعد حسب موقع برطانوی بیرکوں یا مقامی انگریز افسروں پر مسلح حملے ہونے لگے۔ دہلی کی مرکزی سرکار سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے کسی آدمی کو اس علاقے کے لیے بحیثیت ناظم نامزد کرے۔ جب ایسا نہ ہوا تو انہوں نے اپنی مقامی جماعت کے سربراہ کو یہ اختیارات تفویض کر دیے۔ بہرحال علاقے کے نئے نظام حکومت میں عوام کو موثر دخل حاصل تھا۔ اگر اس [illegible] کو [illegible] عمدہ فوجی دستہ موجود ہوتا تو تمام معاملات منتخب فوجی مجلس کے سپرد کر دیے جاتے

اب ہم ہندوستان کے شہروں اور قصبوں سے مثالیں دے کر ان واقعات کی وضاحت کرتے ہیں۔

لکھنؤ: جوں ہی ۳۰ مئی کو شہر میں بغاوت کی خبر پھیلی، لکھنؤ کے وہابیوں نے سبز علم لہرایا اور گلیوں بازاروں میں گشت لگایا۔ ان کے پیچھے ایک ہزار پانچ سو لوگوں کا ہجوم تھا۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد میں بطور مجاہد بھرتی ہونے کے لیے لوگوں سے اپیل کی۔ مناسب مدت گزرنے پر انہوں نے مشہور مولوی احمد اللہ کو جو پھانسی کے منتظر تھے جیل خانے سے رہا کر دیا اور ان سے تحریک کی راہنمائی قبول کرنے کی درخواست کی۔ درحقیقت احیائے اسلام کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ عارضی حکومت کے فوجی سالار نے خود سبز علم کو سرکاری جھنڈے کا درجہ دیا اور اس کے تقدس کو بڑھانے کے لیے قرآن مجید کا ایک نسخہ اس کے ساتھ باندھا۔ مناسب مدت کے بعد دوسرے فرقوں کے جھنڈے بھی نمودار ہو گئے اور ہر جماعت نے اپنے جھنڈے کو اونچے سے اونچا لہرانے کی کوشش کی۔[۲۶]

(مجلس ملی Association) کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے علیحدہ کر دیا جائے
تو لدھیانہ (پنجاب) کے وہابیوں نے کانگریس کی حمایت میں فتووں کی ایک کتاب بعنوان 'نصرت الابرار'
شایع کی۔ یہ کتاب ایک سو فتووں پر مشتمل تھی جن میں دو فتوے دیوبند کے راہنماؤں کے تھے۔[۲] اسی
طرح جب پہلی عالمگیر جنگ چھڑی تو سرحد پر واقع وہابی مرکز نے کابل میں پہلی "آزاد حکومت ہند" کے
قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ جنگ کے خاتمے پر ہم دیکھتے ہیں کہ وہابیوں نے مہاتما گاندھی کی شروع کی ہوئی
تحریکِ عدم تعاون میں بھی شرکت کی اور اس کی راہنمائی بھی کی۔ ایک وہابی مرکز اب بھی سرحد پر
موجود ہے گو اسے کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہے۔[۳]

یہ کہنا بجا ہوگا کہ فضل حق خیرآبادی ۱۸۵۷ء کے مسلمانوں کی روح تھے، اگرچہ اصطلاحاً وہ خود
وہابی نہ تھے بلکہ ان کے عقائد اور مذہبی رسوم کے مخالف تھے پھر بھی انھوں نے استدلال کے ساتھ
انگریزوں کے خلاف وہابیوں کی سرگرمیوں کی حمایت کی۔ انھوں نے اپنی کتاب "رسالہ غدریہ" میں جو
انڈیمان میں ان کی قید کے دوران شستہ عربی میں لکھی گئی، انھوں نے اپنے برطانیہ دشمن موقف
کو واحد صحیح راستہ قرار دیا جو ایک مسلمان اختیار کر سکتا تھا خواہ وہ وہابی ہو یا غیر وہابی۔[۵] اس
سے ۱۸۵۷ء کے واقعات میں وہابیوں کو بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے تسلیم شدہ راہنما بننے میں مدد ملی۔
اگر برطانوی حکام وہابیوں کو ایک جنگ باز طبقہ اور سلطنت کے لیے مستقل خطرے کا سبب تصور
کرتے تھے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔[۶]

حواشی

۱۔ لفظ "وہابی" کا استعمال یقیناً صحیح نہیں کیوں کہ نام نہاد ہندوستانی وہابیوں کے سیاسی مقاصد
اور ان کے عام سماجی نظریات نجد کے عبدالوہاب (وفات ۱۷۸۷ء) کے عقائد سے اخذ نہیں کیے گئے تھے
بلکہ اس سے قبل دہلی کے شاہ ولی اللہ (وفات ۱۷۶۲ء) کی تعلیمات سے تھے، اس لیے احیائے اسلام کے
بعض حامیوں مثلاً عبیداللہ سندھی (۱۸۶۱ء - ۱۹۴۴ء) غلام سرور اور اجمل خاں نے اپنے آپ کو
ولی اللہی یا شاہ ولی اللہ کے پیرو کہنا پسند کیا ہے۔ البتہ میں نے اس لفظ کو اس کی مقبولیت اور تاریخی اہمیت کے سبب
برقرار رکھا ہے۔

۲۔ Trial of the Ex-king of Delhi

۳۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کے مختصر جائزے کے لیے ملاحظہ فرمائیں History ...

اسی قسم کے چھوٹے پیمانے پر ہنگاموں کی اطلاعات علی گڑھ، شاہجہانپور، بریلی، ہانسی اور کئی دوسرے
مقامات سے بھی وصول ہوئیں۔ پنجاب اور صوبہ سرحد میں چھاؤنیوں کے علاقے بھی مشتعل تھے۔
ہم ان تفصیلات کو دارالعلوم دیوبند کے بانی کے سرسری ذکر کے ساتھ ختم کرتے ہیں (یہ دارالعلوم اترپردیش
کے ضلع سہارنپور میں واقع ہے۔)

شاملی، میرٹھ کے نزدیک شاملی میں احیائے اسلام کے حامیوں کی مقامی جماعت نے اپنا امام و
سالار اور قاضی منتخب کیا تاکہ باغی سرکار کا بنیادی مرکز قائم کیا جائے۔ پھر انگریزوں کے مقامی توپخانہ
پر حملہ کرنے کے لیے فی الفور مسلح مجاہدین کو منظم کیا۔" چوں کہ تحریکِ مزاحمت جلد ہی ناکام ہو گئی اور
دہلی کی عارضی حکومت ٹوٹ گئی۔ شاملی کی شورش کے راہنما عرب کو ہجرت کر گئے۔ البتہ محمد قاسم نے جو
شاملی کی مہم میں شریک تھے دیوبند کے دارالعلوم یا مذہبی درسگاہ کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں انھوں
نے ادارے کے بنیادی قواعد مرتب کیے اور اپنے مریدوں کو سرکاری امداد قبول کرنے سے منع کیا۔ انگریزی
زبان کی تعلیم بھی ممنوع قرار دی۔[17]

۵۔ انقلاب کے بعد

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد کئی مقامات پر ساری مسلم آبادی کو قتل کر دیا گیا۔ تمام شمالی ہندوستان
میں [illegible] ہاؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کیا گیا تاکہ انھیں پھانسی دی جائے۔ ان میں سے سینکڑوں
کو جن میں ممتاز علما بھی شامل تھے توپوں سے اڑا دیا گیا۔ بہتوں کو انڈیمان کی تعزیری بستی کو بھیج کر
ملک بدر کر دیا گیا۔ درحقیقت انڈیمان میں قیدیوں کا جو پہلا جتھا پہنچا اس میں بغاوت کے ایسے مشہور معروف
وہابی راہنما بھی شامل تھے جیسے دہلی کے مفتی مظہر کریم اور لکھنؤ کے منشی عنایت احمد۔ ان کے پیچھے
پیچھے انبالہ (۱۸۶۵ء) اور پٹنہ (۱۸۶۹ء) کے وہابی مقدمات کے مجرم بھی پہنچ گئے۔ بیباکی کے
چلے پٹنہ کے مولانا احمد اللہ نے جسے جلا وطن کر کے انڈیمان بھیجا گیا، وائسرائے ہند لارڈ میو کے قتل
کی سازش منظم کی جب ۱۸۷۲ء میں وہ سرکاری دورے پر اس بستی میں وارد ہوا۔ یہ وہابی راہنماؤں
کے غیر فانی جوش اور استقلال کی قابلِ قدر شہادت ہے۔ اس اثنا میں ستانہ کا وہابی مرکز کام
کرتا رہا۔ "مرکز جس کے ساتھ ہماری بے وفا رعایا اور سرحد پار کے دشمنوں کی امیدیں یکساں
طور پر وابستہ ہیں۔" (ہنٹر)

یہ ذکر کرنا باعثِ دلچسپی ہے کہ ۱۸۸۸ء میں جب سر سید احمد خاں نے

Patriotic ۔

۲۰۔ "جب ایک بار ذمہ دار (معتبر) مسلمانوں کی اتفاق رائے سے امام کا انتخاب ہو جاتا ہے تو پھر اس کے ہاتھوں بیعت میں تاخیر کرنا جائز نہیں۔" ایضاً جلد دوم۔ صفحہ ۷۷۔

۲۱۔ مرزا حیرت، حیاتِ طیبہ صفحہ ۲۷۸

۲۲۔ ایضاً صفحہ ۲۸۲، "ناجائز محصولات" (Illegal Impositions) کے لیے لفظ "مال ہائے ناحق" کا استعمال کیا گیا ہے۔

۲۳۔ یہ فتویٰ ایک حدیث کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں محمد اسماعیل: "منصب امامت"

۲۴۔ اس سلسلے میں وہ اشعار ملاحظہ فرمائیں جو "حریق الاشرار" سے محمد اسماعیل کی تصنیف "تقویۃ الاسلام" میں منقول ہیں

۲۵۔ محمد اسماعیل بحوالہ تصنیف

۲۶۔ ہنٹر: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۰۲

۲۷۔ وہابی راہنماؤں سے متعلق سرسید کے خیالات جو یہاں بیان کیے گئے ہیں ۱۸۴۶ء میں پہلی بار ان کی تصنیف "آثار الصنادید ۳ باب چہارم) میں شائع ہوئے تھے لیکن کتاب کے بعد کے مطبوعہ نسخوں میں سے حذف کردیے گئے تھے۔ اب انجمن ترقی اردو، پاکستان، نے اس باب کو دوبارہ بعنوان "تذکرہ اہل دہلی" (اُردو) شائع کیا ہے۔

۲۸۔ مومن خاں: کلیات

۲۹۔ وہ ایک شعر میں اس کا حوالہ دیتا ہے ملاحظہ فرمائیں؛ مومن خاں: دیوانِ فارسی (مسودہ)

۳۰۔ مومن خاں: بحوالہ تصنیف

۳۱۔ سرسید احمد خاں: بحوالہ تصنیف

۳۲۔ ایضاً صفحہ ۸۰

۳۳۔ چراغ علی کی رائے تھی کہ جہاد فرضِ عین (حتمی اور تحکمی فرض) نہیں بلکہ فرضِ کفایہ یعنی اختیاری اور رسمی فرض ہے۔ ملاحظہ فرمائیں: "تحقیق الجہاد" صفحہ ۱۳۷

۳۴۔ اس پٹھان اتالیق کی مثال لیجیے جو دہلی کے ایک رئیس کی ملازمت میں تھا جو تلاشِ شہادت میں باغیوں سے مل گیا۔ ملاحظہ فرمائیں، آغا مرزا بیگ، کارنامۂ سروری صفحہ ۷

۳۵۔ ہنٹر: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵

۳۶۔ ایضاً صفحات ۹۰-۸۴ برائے تفصیلات

جلد اول مقالہ متعلق ولی اللہ۔ اس کے علاوہ Philosophy -- Eastern and Western
اور اسلام کی فلسفیانہ تفسیر کے تفصیلی مطالعے کے لیے لاحظہ فرمائیں: حجت اللہ البالغہ (نسخہ عربی مطبوعہ قاہرہ)

۴۔ محمود: صحیفۂ ٹیپو سلطان جلد دوم صفحہ ۲۴۴

۵۔ ایضاً صفحات ۵۲-۲۵۰

۶۔ ایضاً صفحہ ۲۲۸

۷۔ شاہ عالم کے نام اپنے خط مورخہ ۲ اگست ۱۷۸۶ء میں وہ اپنے آپ کو 'خادم دین محمدی'، -serv ant of the faith of Mohammad) کہتا ہے۔ ایضاً جلد دوم صفحہ ۸

۸۔ ایضاً جلد اول صفحہ ۲۸۱

۹۔ ایونس بیل

۱۰۔ جان بریڈشا Memoir of General Briggs صفحہ ۲۴

۱۱۔ بحوالہ مقام Sir Thomas Munro صفحات ۳۶-۱۳۵

۱۲۔ محمود: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۹

۱۳۔ شعر متعلقہ حسب ذیل ہے:-

اعتبارِ صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

Trust and patience be damned oh Zafar!
(When did the soldiery of India support Tipu?)

منقول از تصنیف امیر احمد علوی Bahadur Shah Zafar, P. 182

۱۴۔ انھوں نے یہ تلقین کی کہ "زمین خدا کی ملکیت ہے اور پیداوار اس کی جو اس زمین پر ہل چلاتا ہے"
منقول از مقالہ اشرف Notes on the Muslim Question

۱۵۔ چودھری Civil Disturbances in India (مسودہ) صفحہ ۱۲

۱۶۔ ایضاً صفحہ ۱۱

۱۷۔ ہنٹر ۔ این The Indian Musalmans. صفحہ ۱۱۳

۱۸۔ چودھری: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱۳

۱۹۔ عبدالعزیز، فتاویٰ عزیزی - جلد اول صفحات ۱۷-۱۶

۴۹۔ مثال کے طور پر، عوامی فوج کے راہنماؤں نے لکھنؤ میں مرزا برجیس قدر کو جو اودھ کے تخت پر بیٹھنے کا خواہاں تھا صاف صاف بتا دیا کہ تمہارا انتظام اور رتبہ شہنشاہ دہلی ہی متعین کریں گے۔ جب شاہی فرمان پہنچا جس نے بحیثیت حکمرانِ اودھ اس کی تقرری کی تصدیق تھی تو اکیس توپوں کی رسمی سلامی دی گئی اسی طرح جب سکے کا سوال بحث کے لیے پیش ہوا تو فوجی سالاروں نے اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ سکے حکمرانِ اودھ کے نام پر جاری کیے جائیں۔ یہ شہنشاہِ دہلی کا خاص شاہی حق تھا اور اسے برقرار رکھا گیا۔ درحقیقت حکومتِ اودھ کے بعض عہدے داروں کو جن میں سپہ سالارِ اعظم اور صوبہ دار بھی شامل تھے مرکزی حکومت مقرر کرتی تھی اور بہادر شاہ کا سرکاری اخبار نویس ہمیشہ دربار لکھنؤ میں حاضر رہتا تاکہ قواعد و روایات کی ہر خلاف ورزی کی اطلاع پایۂ تخت کو بھیجے۔ یہ انہی عام روایات کے سبب ہی تھا کہ جونہی اودھ میں حکومت قائم ہوئی ایک معتمد و مختار سفیر رواج کے مطابق نذر کے ساتھ دہلی کو روانہ ہوا اور جب ۱۶ ارنومبر ۱۸۵۷ء کے دن انگریزوں کے ہاتھوں دہلی کے قتلِ عام کی خبر لکھنؤ میں پہنچی تو چھ سات انگریز قیدیوں کو فی الفور بطور انتقام قتل کر دیا گیا۔

(کمال الدین حیدر: تاریخ اودھ جلد دوم صفحات ۲۲۵-۴۰، ۲۴۲، ۲۶۲ نیز رام سہائے تمنا: تاریخ صوبہ اودھ صفحہ ۸۶)

۵۰۔ متبنیٰ بنانے سے متعلق اس کے فرمان کے لیے ملاحظہ فرمائیں کنھیا لال: تاریخ بغاوت، وغیرہ صفحات ۸۷-۲۸۶

۵۱۔ فرمان بہادر شاہ، منقول کے از مصنف Indian Mutiny pap... misc 726 (انڈیا آفس لندن ۲)

۵۲۔ یہ ذکر کرنا ایک حقیقت کا انکشاف ہے کہ ... کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اس وقت دہلی میں پہنچا جب برطانوی فوج شہر کے اندر گھسنے والی تھی اور اگر اس نے لوٹ جانا پسند کیا تو اس کو قصور وار نہیں ٹھہرا سکتے لیکن اس سفیر نے شہنشاہ کی خدمت میں بذاتِ خود نذر پیش کرنے اور شاہی خزانہ سے اس کی رسید لیے بغیر جانے سے انکار کر دیا (کمال الدین حیدر: حوالہ تصنیف صفحات ۲۴۲-۲۴۰)

جب ۱۸۷۲ء میں مشہور باغی راہنما، لیاقت علی کو جس نے ۱۸۵۷ء میں الٰہ آباد کی سارضی حکومت قائم کی تھی ایک برطانوی عدالت کے روبرو مقدمے میں پیش کیا گیا اور اس پر

۳۷۔ ایضاً صفحات ۱۴-۱۳، ۱۸۳۸ء میں دو اہم وہابی راہنما ولایت علی اور مولوی سلیم دکن کو گئے
اور مبارز الدولہ کے تحت ایک طاقتور خفیہ تنظیم قائم کی تھی۔ ۱۸۳۹ء میں برطانوی ریزیڈنٹ کو اس
تنظیم کا پتہ چل گیا۔ آخر کار مبارز الدولہ کو قلعہ گولکنڈہ میں قید کر دیا گیا اور وہیں ۱۸۵۱ء میں اس
نے انتقال کیا Freedom Struggle in Hyderabad جلد اول صفحات ۳۳-۱۲۸

۳۸۔ اشرف: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۳

۳۹۔ اشرف: بحوالہ تصنیف برائے تفصیلات

۴۰۔ ڈف The Indian Rebellion صفحہ ۱۹۵

۴۱۔ منقول تصنیف ڈیسائی
Social Background of Indian Nationalism
صفحات ۸۲-۲۸۲

۴۲۔ مالیسن The Indian Mutiny of 1857 دیباچہ صفحہ 7:1

۴۳۔ ڈف: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۸۱، اس میں ہندوستانیوں کے مختلف طبقات کا ذکر آتا ہے جنھوں
نے انگریزوں کا ساتھ ۱۸۵۷ء میں دیا۔

۴۴۔ ذکاء اللہ: تاریخ عروج وغیرہ

۴۵۔ India Today

۴۶۔ کے، فروری مارچ ۱۹۵۲ء صفحہ ۷۵

۴۷۔ Mutiny papers misc., 727
برطانوی حکام نے بہادر شاہ کو پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ اُسے اپنے شاہی خاندان کے دوسرے
اراکین کے ساتھ لال قلعہ کو خالی کرنا ہوگا اور کسی کو اپنا جانشین نامزد نہ کرنا ہوگا۔ دوسرے لفظوں
میں تیموریوں کا نام تک لوگوں کی یاد سے مٹنے والا تھا۔ بہادر شاہ ایک رقت انگیز شعر میں مغل
حکومت کے خاتمے کے احتمال کی طرف اشارہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ "کاروبارِ سلطنت صرف اس
تک محدود ہے۔ اس کے بعد نہ اس کا کوئی جانشین ہوگا اور نہ ہی مغلیہ حکومت کا نام و نشان رہے
گا۔" (منقول از تصنیف ذکاء اللہ، صفحہ ۳۱۰)

۴۸۔ سلیمن غم و غصہ کے ساتھ لکھتا ہے کہ راجہ دھولپور اور بندھیلکھنڈ کے سردار جو انگریزوں ہی کے
پروردہ ہیں اور جنھیں بہادر شاہ کی حکومت سے کسی فیض کا احتمال نہیں، ابھی تک اپنی مہر منصب
پر اپنے لقب کو یوں ظاہر کرتے ہیں "خادم و خانہ زادِ شہنشاہ، مجاہدِ دین اسلام"
(Rambles and Recollections p 309)

کا دعویٰ رکھتا تھا۔ جو چیز واقعی معنی خیز ہے وہ یہ حقیقت ہے کہ ایک اطلاع کے مطابق اس
کا باپ ٹیپو کا درباری رہ چکا تھا۔ بہر حال اس نے غالباً پہلے حیدر آباد میں تعلیم پائی اور پھر لندن
میں۔ اس کے بعد ایران اور عرب سے ہو کر واپس ہندوستان کو آ گیا۔ ہندوستان میں واپس آنے
کے بعد اس کی داستانِ سفر بڑی طویل اور دلچسپ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ فیض آباد میں سکونت
اختیار کرنے سے پہلے وہ راجپوتانہ میں سانبھر، جے پور اور ٹونک گیا، پھر گوالیار (غالباً اپنے پیر
محراب شاہ کا نیاز حاصل کرنے کے لیے جن کی اتنی قدر و منزلت تھی کہ اس کا نام محمدی حکومت کے
سکوں پر مذکور تھا) دہلی اور آگرہ کو۔ نظریے کے اعتبار سے وہ احیائے اسلام کا حقیقی حامی تھا۔
دہلی کے قیام کے دوران میں اس کی راہ و رسم مفتی صدر الدین اور صدر دہلی فضل حق جیسے اشخاص
کے ساتھ تھی۔ فیض آباد میں انگریزوں نے اُسے باغیانہ سرگرمیوں کی بنا پر گرفتار کر لیا اور جب
لکھنؤ میں بغاوت بپا ہوئی، وہ سچ مچ پھانسی کا منتظر تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ میں تحریکِ مزاحمت
کی کہانی اس کے استقلال، ہمت، حسنِ تدبیر اور سپہ گری کے جوہر کی داستان ہے جن کا
اظہار اس نے برطانوی فوج کے تربیت یافتہ جرنیلوں کے خلاف ازاں بعد ظاہر کیا۔ جب دہلی
کانپور اور الٰہ آباد انگریزوں کے ہاتھوں مفتوح ہو گئے تو لکھنؤ نے قومی مزاحمت کا جھنڈا بلند
کیے رکھا۔ جب اس کی حفاظت ناممکن ہو گئی تو احمد اللہ اور دوسرے رہنما کے وطن پرست
راہنما شاہجہانپور میں لڑتے رہے اور بالآخر وہ محمدی میں مورچے بنا کر ڈٹ گئے جب کہ احمد اللہ بادشاہ
اور نئی حکومت کا سربراہ تھا۔ اب اس نے احیائے اسلام کے حقیقی علم بردار کی حیثیت سے "حامیٔ
دینِ محمد" کا لقب اختیار کیا اور اپنے روحانی مرشد محراب شاہ کے نام کے سکے جاری کیے لیکن
جلد ہی ۱۵ جون ۱۸۵۸ء کے دن بے دغا بازی سے قتل کر دیا گیا (انتظام اللہ شہابی: ایسٹ

انڈیا کمپنی اور باغی علماء، صفحات ۴۹-۴۸)۔
بخت خاں کی ابتدائی زندگی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ ایک روہیلہ تھا اور ماں کے ناتے
سے اودھ کے شاہی خاندان سے تعلق رکھنے کا دعویٰ کرتا تھا۔ ایک اطلاع کے مطابق جنگ
افغانستان میں اس نے ایک معمولی رسالدار کی حیثیت سے برطانوی فوج کی خدمت انجام
دی تھی۔ اس کے بعد ترقی پا کر وہ پہلے افسر توپخانہ بنا اور بالآخر رجمنٹ میں صوبیدار کے عہدے
پر فائز ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد ہم اُسے تھوڑی دیر کے لیے بریلی میں دیکھتے ہیں جہاں
اس نے انگریزوں کو روہیلکھنڈ سے نکال دینے میں نواب بہادر خاں کی مدد کی۔ (یہ نواب

ملکۂ معظمہ کے خلاف جنگ چھیڑنے کا الزام لگایا تو اس نے بڑے وقار کے ساتھ اپنے عمل کو حق بجانب
ٹھہرایا اور اعلان کیا کہ ——— "میں اپنے آپ کو بہادر شاہ کا نائب تصور کرتا تھا" اسے عمر بھر کے لیے عبور دریائے
شور کی سزا دی گئی۔ اس نے اس سزا کو بیان سے منحرف ہونے کا اشارہ تک دیے بغیر خوشی کے ساتھ
قبول کیا۔ (The Times. London. ۱۷ جون ۱۸۶۲ء)

۵۳۔ کنھیالال: بحوالہ تصنیف صفحہ ۷

۵۴۔ جٹا شنکر جھا:
The Patna Conspiracy of 1857
Indian Historical Records Proceedings, 1956

۵۵۔ اس بہادر مغل شہزادے کے بارے میں تفصیلات میسر نہیں ہیں۔ وہ مرزا ناظم کا بیٹا اور شاہ عالم
کا نواسہ تھا۔ کسی وقت ۱۸۵۶ء میں یعنی بغاوت پھوٹنے سے پہلے وہ مکہ کو حج پر روانہ ہو گیا تھا۔
واپسی پر اسے یہ دیکھ کر کہ انگریزوں کے خلاف ملک گیر بغاوت بپا ہے، بڑا اطمینان ہوا۔ اندور
کے باغی فوجی اور گوالیار اور دھولپور کے افغان مجاہدین راستے میں اس کے ساتھ شامل ہو گئے
اور اس فوج کے ساتھ اس نے آگرہ کا محاصرہ کر لیا اور پھر میواڑ کو روانہ ہو گیا۔ اس وقت غالباً
دہلی انگریزوں کے ہاتھوں مفتوح ہو چکی تھی، جب وہ پایۂ تخت میں وطن دوست راہنماؤں سے
رابطہ پیدا کر رہا تھا۔ بہر حال ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فرخ آباد اور شاہجہانپور (جو محبانِ وطن کے گڑھ
تھے) کے راستے سے لکھنؤ کی جانب روانہ ہوا تاکہ احمد اللہ کے ساتھ مل جائے۔ جب اُسے
دعوت دی گئی تو وہ محمدی میں احمد اللہ کی عارضی حکومت میں شامل ہونے پر رضامند ہو گیا۔
اس کے بعد اس کی حرکات و سکنات پردۂ تاریکی میں ہیں۔ ایک روایت یہ ہے کہ وہ سرحد پار
کر کے روس چلا گیا (کمال الدین حیدر، بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۴۶۸) ایک اور بیان سے
جس کے صحیح ہونے کا زیادہ احتمال ہے اس کے مکہ کو لوٹ جانے کا سراغ ملتا ہے۔ مکہ میں ہم
اسے دوسرے ممتاز وہابی علما کی صحبت میں پاتے ہیں جیسے محمد اسحاق، حاجی امداد اللہ وغیرہ
جو تحریکِ مزاحمت کی ناکامی کے بعد عرب کو فرار ہو گئے تھے۔ ایک اطلاع کے مطابق ۱۸۹۵ء
میں عرب میں اس کا انتقال ہو گیا۔ (انتظام اللہ شہابی۔ غدر کے چند علماء صفحہ ۱۳۵)

۵۶۔ مالیسن: بحوالہ تصنیف صفحات ۱۸-۱۷

۵۷۔ مولوی احمد اللہ ۱۸۵۷ء کی تحریک میں ایک حیرت انگیز ہستی ہے۔ وہ شمالی ہندوستان کا
نہیں بلکہ مدراس کا رہنے والا تھا۔ وہ گولکنڈہ کے قطب شاہی خاندان کی اولاد سے ہو

تباہ کر دیے گئے تھے۔ (غالب: اردو خطوط برائے تفصیلات)

۶۳۔ غالب: کلیاتِ غالب صفحہ ۱۹۲

۶۴۔ مابین کی رائے ہے کہ چپاتیوں کا منصوبہ احمد اللہ نے تیار کیا تھا۔ اس وقت کئی ایک بھوشس وانیوں (مستقبل کے واقعات سے متعلق پیشگوئیاں) کا چرچا تھا ذکاء اللہ نے اپنی "تاریخ" (بحوالہ تصنیف) میں فارسی شعر کی صورت میں ایک پیش گوئی کا حوالہ دیا ہے جس کا مقصد غالباً یہ تھا کہ مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کو متاثر کیا جائے۔

۶۵۔ غالب: بحوالہ تصنیف

۶۶۔ اس برطانوی جاسوس کو ایک بہت ہی اچھا موقع ملا۔ انھوں نے ہندوؤں کے مقبول دیوتا ہنومان کے نام کا ایک جھنڈا نکالا اور اسے باغیوں کے کیمپ کے بیچ میں پیپل کے درخت پر گاڑ دیا۔ اس دھوکے کا پتہ صرف اس وقت چلا جب برطانوی توپوں نے گولہ باری کے لیے اس سے نشانے کا کام لینا شروع کر دیا (کمال الدین حیدر: بحوالہ تصنیف صفحات ۸۷-۲۸۶ برائے تفصیلات)

۶۷۔ علی محمد شاد: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۷۱

۶۸۔ اصل کے لحاظ سے وزیر خاں بہار کے ایک افغان خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ انگریزی تعلیم کے لیے وہ مرشد آباد گیا۔ اس کے بعد طب کے مطالعے کے لیے اسے انگلستان بھیجا گیا۔ وہاں سے وہ سند یافتہ سرجن بن کر لوٹا۔ پہلے کلکتے کے ایک ہسپتال میں سرجن کے عہدے پر فائز ہوا اور پھر آگرہ میں جہاں احمد اللہ سے اس کی راہ و رسم ہو گئی۔ اس نے وہاں ایک مجلس علما قائم کی۔ اسے یونانی اور عبرانی کے مطالعے کا شوق تھا اور عیسائی مبلغوں کے ساتھ مناظروں میں شریک ہوتا تھا۔ ۱۸۵۷ء میں جب وہ دہلی میں پہنچا تو اسے بہادر شاہ کی کونسل کا رکن نامزد کر دیا گیا۔ محمدی کی حکومت میں بھی اس کا یہی مرتبہ تھا

۶۹۔ اشرف: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴

۷۰۔ حسین احمد: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحات ۴۴-۴۳

۷۱۔ مناظر احسن گیلانی: "سوانح قاسمی" جلد دوم صفحہ ۲۲۱۔ یہ بیان کرنا دلچسپی کا موجب ہے کہ دیوبند کے دارالعلوم کے پرنسپل اور کانگریسی حسین احمد مدنی نے حال ہی میں اس خطاب کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو صدر جمہوریہ ہند نے انھیں عطا کیا۔

۷۲۔ حسین احمد: بحوالہ تصنیف صفحہ ۷۱

بریلی میں عارضی حکومت کا روہیلہ سربراہ تھا) بریلی سے وہ نانا صاحب کی فوج کے لیے فرخ آباد اور بداؤں سے سپاہی بھرتی کرنے میں مدد کو گیا۔ آخر کار چودہ ہزار فوجیوں، رسالہ کے تین دستوں، توپخانہ اور بریلی سے ہتھیائے ہوئے چند لاکھ نقد روپوں کے ساتھ وہ دہلی کو روانہ ہوا (کمال الدین حیدر: بحوالہ تصنیف)

۵۹۔ مولوی سرفراز علی جونپور کے کرامت علی کا مرید، سید احمد بریلوی کا مشہور خلیفہ اور وہابی تحریک میں ایک ممتاز رکن تھا (کمال الدین حیدر: بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۴۵)

۶۰۔ دہلی میں آنے والے وہابی مجاہدین میں جے پور، جھانسی، حصار، بھوپال اور نصیر آباد کے چھ ہزار مجاہدین کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ والیٔ سوات اخوند کے تحت جو وہابیوں کا مشہور و معروف سرپرست اور حامی تھا، سرحد پر واقع وہاں مرکز نے چودہ ہزار مجاہد بھیجنے کی پیش کش کی۔ ٹونک نے چھ سو کا دستہ بھیج دیا اور دو ہزار کا اور جتھا بھیجنے کا وعدہ کیا۔ دو سو آدمی نجیب آباد سے پہنچ گئے جو ایک قدیم روہیلہ مرکز تھا (اب اتر پردیش کے ضلع بجنور میں واقع ہے)۔ امیر احمد علوی: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۴۲ نیز ملاحظہ فرمائیں حسن نظامی: "غدر کی صبح و شام" برائے تفصیلات۔

۶۱۔ جب دہلی مفتوح ہو گئی اور بہادر شاہ دہشت زدہ تھا تو بخت خاں نے ناکامی کے سبب کی وضاحت کی یعنی انھوں نے ابتدائی غلطی یہ کی کہ شہر دہلی کو لڑائی کے اڈے کے طور پر منتخب کیا جب کہ برج (پہاڑی) کی بلندیوں پر دشمن قابض تھا۔ اس نے یہ بھی بیان کیا کہ کس طرح شہزادہ مرزا مغل جو ایک احمق تھا اور جس نے ازراہِ شوق کمان سنبھال لی، معاملہ چوپٹ کر دیا (امیر احمد علوی: بحوالہ تصنیف صفحات ۱۳۹-۳۸)

۶۲۔ ۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو جب برطانوی فوجی دستے دہلی کے اندر گھسنے میں کامیاب ہو گئے تو وہابیوں نے مسلمانوں کو جامع مسجد کے علاقے میں جمع کیا اور اپنے ابتدائی حملے میں بڑھتی ہوئی برطانوی فوج کی صفوں کو پسپا کر کے بھگا دیا اور دشمن کے چار سو جوان مارے گئے (حسن نظامی: "غدر کی صبح و شام" برائے تفصیلات) بالآخر جب جامع مسجد کے علاقے پر دشمن کا قبضہ ہو گیا تو تین کوتوالی تک ایک فرلانگ لمبے رستے پر سوائے کشتوں کے پشتوں کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ (ظہیر دہلوی: داستانِ غدر صفحات ۱۴-۱۱۲) یہی وجہ ہے کہ مدت تک مسلمانوں کو جامع مسجد واگذاشت نہ کی گئی۔ برطانوی حکام اس مسجد کو مسمار کرنے کا منصوبہ باندھ رہے تھے جیسا کہ انھوں نے کئی دوسری مساجد شہید کر دی تھیں۔ البتہ اس علاقے میں مسلمانوں کے اکثر مکانات

"فتویٰ جہاد" : علمائے دہلی (اردو) بقبضہ آغا حیدر صاحب، حیدرآباد دکن
The Freedom Struggle in Hyderabad 1956 ، جلد ا حیدرآباد دکن
غالب : ملاحظہ فرمائیں "مرزا اسد اللہ خاں"
غلام رسول مہر : "سید احمد شہید" (اردو) لاہور ۱۹۵۴ء
حسن نظامی : "غدر کی صبح و شام" (اردو) ۱۹۲۶ء
حسن نظامی : "محاصرۂ دہلی کے خطوط" (اردو) دہلی ۱۹۲۵ء
History of Philosophy: Eastern and Western دو جلد، وزارت تعلیم، حکومت ہند، لندن ۱۹۵۲ء
ہنٹر۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو: The Indian Musalmans. کلکتہ، ۱۹۴۵ء
حسین احمد مدنی : "نقش حیات" (اردو) دو جلد، دیوبند ۱۹۵۴ء
امام خان نوشہری : "تراجم علمائے حدیث ہند" (اردو) جلد اول، دہلی ۱۹۳۸ء
India Today ، رسالہ ماہانہ ، الٰہ آباد
Indian Historical Records Commission Proceedings 1955 - 1956
انتظام اللہ شہابی : "غدر کے چند علماء" دہلی
اسماعیل شہید : "منصب امامت" (فارسی) دہلی
اسماعیل شہید : "تقویۃ الاسلام" (فارسی) لاہور
کمال الدین حیدر : "تاریخ اودھ" (اردو) جلد دوم، لکھنؤ ۱۸۷۸ء
کنہیا لال : "تاریخ بغاوت ہند" (اردو) لکھنؤ ۱۹۱۶ء
کے : Mutiny Papers. (قلمی نسخہ) انڈیا آفس ریکارڈز، ہوم سیریز، لندن
خلیق احمد نظامی : "شاہ ولی اللہ کے سیاسی خطوط" (اردو) دہلی ۱۹۵۰ء
"خطوط سید احمد بریلوی" (فارسی قلمی نسخہ) برٹش میوزیم، لندن
محمود بنگلوری : "صحیفۂ ٹیپو سلطان" (اردو) دو جلد، لاہور، ۱۹۴۷
"محاربۂ عظیم" یعنی "تاریخ بغاوت ہند" ۱۹۴۷ء ملاحظہ فرمائیں کنہیا لال مذکورہ بالا۔
مالیسن کرنل جی۔ بی : The Indian Mutiny of 1857 لندن، ۱۸۹۱ء
مناظر احسن گیلانی : "سوانح قاسمی" (اردو) دو جلد، دیوبند، ۱۳۷۵ھ

۷۳۔ محمد علی قصوری "تاریخ و سیاست" میں ۵۲-۱۹۵۱ء ملاحظہ فرمائیں "کتابیات"

۷۴۔ "التوراۃ الہند" کے نام سے بھی موسوم ہے۔ ملاحظہ فرمائیں "کتابیات"

۷۵۔ وہ کہتا ہے: "میں نے کوئی جرم نہیں کیا، سوائے اس کے کہ مجھے انگریزوں (یا دوسرے کافروں) کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ میں ان کے لیے کسی غمخواری کا اظہار نہیں کر سکتا۔ یہ ایک مشہور عام حکم قرآن کے عین مطابق ہے جس میں ہدایت کی گئی ہے کہ مومن ان کے ساتھ دوستانہ تعلقات نہ رکھیں (عبدالشہید خاں شیروانی: "باغی ہندوستان" صفحہ ۲۸۸) جب دہلی میں اس پر فتوی جہاد پر دستخط کرنے کا الزام لگایا گیا تو اس نے صاف اس الزام کا اعتراف کر لیا۔ اگرچہ شہادت نہ ملنے کی بنا پر وہ بری ہو سکتا تھا۔

۷۶۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر The Indian Musalmans انتساب

کتابیات

عبدالعزیز دہلوی: "فتاویٰ عزیزی" (فارسی) دو جلد، ۱۳۴۱ھ

عبدالحق: "جنگ ستانہ و ملکہ" (فارسی قلمی نسخہ) برٹش میوزیم، لندن

عبدالشہید خاں شیروانی: "باغی ہندوستان" (اردو) بجنور، ۱۹۴۷ء

آغا مرزا بیگ: "کارنامۂ سروری" (اردو) علی گڑھ، ۱۹۳۳ء

محمد علی شاد: "تاریخ صوبہ بہار" (اردو) عظیم آباد، ۱۸۷۵ء

امیر احمد علوی: "بہادر شاہ ظفر" (اردو) لکھنؤ ۱۹۵۵ء

اشرف۔ کے۔ ایم۔ Notes on the Muslim Questions (مسودہ)
کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا۔ رپورٹ۔

بیل، میجر ایونس:

بریڈ شا جان: Memoirs of General Briggs لندن ۱۸۸۵ء

Sir Thomas Munro آکسفورڈ ۱۸۹۷ء

چودھری ایس۔ بی۔: Civil Disturbances During the British Rule in India (1765-1857) Calcutta 1955

چراغ علی: تحقیق الجہاد (اردو) لاہور

ڈف۔ ریورنڈ الگزینڈر: The Indian Rebellion لندن ۱۸۵۸ء

بنے گھوش

بنگال کا روشن خیال طبقہ اور انقلاب

اس مقالے میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کی طرف بنگال کے روشن خیال طبقے کی بے رُخی کے رویّے کی تحقیق کی جائے۔ بنگال کی سماجی تاریخ کے طالبعلموں کے لیے یہ بے رُخی ایک پریشان کن مسئلہ رہی ہے جس کی کوئی خاطر خواہ وضاحت پیش نہیں کی جا سکی۔ اس کی وجہ صرف انیسویں صدی کے وسط کا وہ جذبۂ وفاداری نہیں جس کا خیال، روشن خیال طبقہ کرتا تھا۔ ان کی وفاداری کبھی بھی غلاموں کی سی وفاداری نہیں تھی بلکہ اس پڑھے لکھے سمجھدار طبقے کی وفاداری تھی جو نئے سماج میں اپنے تاریخی رول اور اپنے مفاد کا پورا پورا شعور رکھتا تھا۔

اس لیے بنگال کے روشن خیال طبقے کی وفاداری مشروط تھی۔ جب تک برطانوی حکام پڑھے لکھے لوگوں کے طبقاتی مفاد کے حق میں کام کرتے ان کی وفاداری یقینی تھی ورنہ نہیں۔ جدید بنگال کے روشن خیال طبقے کی پہلی پشت کے سن بلوغ سے لے کر گزشتہ صدی کی تیسویں دہائی تک انگریز حکمرانوں کے ساتھ کئی بار اُن کی جھڑپیں ہوئی تھیں اور کئی موقعوں پر انھوں نے جرأت کا اظہار کیا تھا اس لیے یہ کہنا غلط ہوگا کہ انیسویں صدی کے وسط میں بنگال کا روشن خیال طبقہ باغیوں کی جو مخالفت کرتا تھا وہ محض ان کے حکمرانوں کے جذبات کی صدائے بازگشت تھی۔ اس معاملے میں ان کا اپنا نقطۂ نظر اور اپنی رائے تھی۔ اس مقالے کا بڑا مقصد یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر کو معلوم کیا جائے اور متعلقہ مواد کی روشنی میں اس کے اسباب کا جائزہ لیا جائے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب کی اصلی ماہیت اور ممکن اسباب پر سو سال کے مباحثہ کے بعد بھی مورخین

"مراۃ الانظار" یعنی "تاریخ صوبۂ بہار" مصنفہ علی محمد شاد
مرزا اسد اللہ خاں: "کلیاتِ غالب" (فارسی) لکھنؤ، ۱۲۸۴ھ
"عودِ ہندی" (اردو) علی گڑھ، ۱۸۲۷ء
"اردوئے معلیٰ" (اردو) لاہور، ۱۹۲۲ء
مرزا حیرت دہلوی، "حیاتِ طیبہ" (اردو) امرتسر، ۱۹۳۳ء
مولوی محمد اسماعیل: ملاحظہ فرمائیں اسماعیل شہید
محمد علی قصوری: "مشاہداتِ کابل و یاغستان" (اردو)
"تاریخ و سیاست" رسالہ سہ ماہی، کراچی ۱۹۵۱-۵۲ء
مومن خاں مومن: کلیاتِ مومن (اردو) کراچی، ۱۹۵۵ء
مومن خاں مومن: "دیوانِ فارسی" (فارسی مسودہ) مجموعہ شیفتہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
نظامی بدایونی: "انقلاب دہلی" (اردو) بدایوں، ۱۹۳۱ء
رام سہائے تمنا: "تاریخ صوبۂ اودھ" (اردو) لکھنؤ ۱۸۷۶ء
رئیس احمد جعفری: "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد" (اردو) لاہور ۱۹۵۵ء
ساورکر۔ وی۔ ڈی: Indian War of Independence دو جلد، کلکتہ ۱۹۳۰ء
سرسید احمد خاں: "تذکرہ اہلِ دہلی" (اردو) کراچی، ۱۹۵۵ء
سلیمن۔ سر ڈبلیو۔ ایچ۔ Rambles and Recollections of an Indian Official, Oxford 1915
سپنسر الفریڈ: Memoirs of William Hickey, 4 Volumes, London 1913-1925
Times, The London 1857-1872
Trial of Ex-king of Delhi. I. R. Department.
شاہ ولی اللہ: "حجۃ اللہ البالغۃ" (عربی) دو جلد، قاہرہ، ۱۳۵۲ھ
شاہ ولی اللہ: ملاحظہ فرمائیں خلیق احمد نظامی
Wellesley Papers, India Office Records, Home Misc. Series
ظہیر دہلوی: "داستانِ غدر" (اردو) لاہور
ذکاء اللہ: "تاریخ عروجِ انگلشیہ ہند" (اردو) دہلی، ۱۹۰۴ء

کرنے کی واقعی اشد ضرورت تھی اور اس میں بغاوت کے جن اسباب کا خدشہ ظاہر کیا گیا تھا وہ حقیقی تھے اگرچہ صرف یہی نہ تھے۔

میجر جنرل ایچ۔ ٹی۔ ٹکر نے جو کئی سال بنگال کی فوج کے ایڈ جوٹینٹ جنرل رہے تھے، بغاوت کے ممکن اسباب کے بارے میں ۱۹ر جولائی ۱۸۵۷ء کو "ٹائمز لندن" کے نام ایک خط لکھا۔ یہ خط ایک بیش بہا دستاویز ہے کیوں کہ یہ بنگال کے فوجی عملے کے ایک نہایت تجربہ کار اور اعلیٰ افسر کی رائے پیش کرتا ہے۔ ٹکر لکھتا ہے:-

"جنابِ محترم! اس وقت جب کہ سارا ملک بنگال میں بغاوت کے اسباب پر قیاس آرائی کر رہا ہے۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ میں چند باتیں بطور تشریح پیش کروں جن سے مجھے یقین ہے کہ لوگوں میں اعتماد پیدا ہوگا۔ حال ہی میں یہ خیال عام طور پر دیسی باشندوں اور خاص طور پر دیسی فوج کے دلوں میں گھر کر گیا ہے (خواہ کیسے ہی یہ خیال ان تک پہنچا) کہ سرکار کا ارادہ ان کو بے دین کرنے اور فوجیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ حالیہ قوانین جو نسبتاً عجلت میں ایسے مسائل کے بارے میں بنائے گئے جن کا گہرا تعلق دیسی لوگوں کے جذبات اور مذہب کے ساتھ ہے اور بنگال کے ملکی طریقۂ تعلیم میں بڑے پیمانے پر تبدیلیاں اور ہمارے بعض کمزور اور جاہل مذہب کے دیوانوں کے عاقبت نااندیشی اور غیر دانشمندی کے طور طریقے فوجیوں کو ہماری حکومت کے خلاف زبردست بدگمانیوں پر مائل کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئے ہیں۔ فوجیوں کی نگاہ میں مرشد پرستی اور مذہبی تعصب سب سے بڑا اصول ہے۔ درحقیقت تقریباً ہر رجمنٹ میں برسوں سے برہمنوں کا اثر و رسوخ خطرناک حد تک غالب ہے۔"

اس سلسلے میں اب میں ایک اہم ترین ہندوستانی سر سید احمد خاں کے آنکھوں دیکھے حال کا بیان پیش کروں گا۔ چونکہ یہ بیان ہندوستان کے مسلم فرقے کے ایک ممتاز راہنما کے قلم سے ہے جو بغاوت کے دوران ہندوؤں کی نسبت بجا طور پر زیادہ رنجیدہ خاطر تھے اور بنگال سے باہر بغاوت کے طوفانی مراکز میں موجود تھے اس لیے سید احمد کے بیان کو خاص وقعت حاصل ہے۔ اپنی تصنیف "رسالہ اسباب بغاوت ہند" (An Essay on the causes of the Indian Revolt) میں سر سید احمد نے مذہب میں مداخلت کے اس خوف کو بغاوت کا ایک بہت بڑا سبب قرار دیا۔ انھوں نے لکھا:-

"اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام اشخاص، دانا یا نادان، معزز یا غیر معزز، کا خیال تھا کہ حکومت واقعی دل و جان سے لوگوں کے مذہب اور رسم و رواج میں دخل دینے، سب کو، خواہ ہندو ہوں یا مسلمان عیسائی بنانے اور ان کو یورپی طور طریقے اور عادات اپنانے پر مجبور کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ شاید یہ

میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ اگر ہم ۱۸۵۰ء-۵۵ء کے فرینڈ آف انڈیا، انگلش مین، بنگال ہرکارو، کلکتہ ریویو، ہندو پیٹریٹ اور دوسرے اخبارات و رسائل کا بغور مطالعہ کریں تو ہمیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اصل اسباب سماجی اور مذہبی تھے اور سیاسی اور معاشی اسباب ثانوی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ بات اہم ہے، خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ بنگال روشن خیال طبقے کا رویہ بغاوت کے اصل اسباب کے تجزیے پر منحصر تھا۔ سیاسی اور معاشی اسباب کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن ان کا جائزہ تاریخی نقطۂ نگاہ سے لیا گیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ اسباب اس نوخیز متوسط شہری طبقے کے مفاد کے منافی ہیں جس کا بنگالی روشن خیال طبقہ ایک جز تھا۔ پہلے ہم بغاوت کے مذکورہ بالا اصلی اسباب پر بحث کریں گے۔

اپریل اور مئی میں بغاوت کے تیزی کے ساتھ پھیلنے پر لارڈ کیننگ نے ایک اعلان جاری کیا جو ۱۶ مئی ۱۸۵۷ء کے Calcutta Gazette Extra-ordinary میں شائع ہوا۔ یہ حسب ذیل ہے:-

"گورنر جنرل ہند نے بنگال کی فوج کو آگاہ کیا ہے کہ وہ افواہیں جن سے بعض رجمنٹوں کے آدمیوں میں یہ شک پیدا ہو گیا ہے کہ حکومت ہندوستان ان کے مذہب پر حملہ کرنے اور ہماری ذات پات کو نقصان پہنچانے کی تدبیر سوچ رہی ہے، محض شرارت بھرے جھوٹ ہیں۔

گورنر جنرل با جلاس کو معلوم ہوا ہے کہ بد خواہ اور بدنیت آدمیوں کے ذریعے اس کا پروپیگنڈا نہ صرف فوج میں بلکہ لوگوں کے دوسرے طبقوں میں بھی جاری ہے ...

ایک بار پھر گورنر جنرل تمام لوگوں کو ان دغا بازیوں کے خلاف متنبہ کرتے ہیں۔"

اگر مذہب اور ذات پات کے معاملات میں سرکاری مداخلت کا سوال برطانوی حکمرانوں کے لیے پریشانی کا سبب نہ ہوتا تو ایسا اعلان جاری کرنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ وارن ہیسٹنگز کے عہد سے ان کی یہ قطعی پالیسی تھی کہ قدیم سماجی اور مذہبی رسم و رواج کے معاملے میں ہر ممکن مصالحت کا رویہ اپنائیں اور آہستہ آہستہ تبدیلیاں اور اصلاحات عمل میں لائیں۔ وہ نرمی اور مصالحت کے ساتھ تبدیلی لانے کی توقع رکھتے تھے اور یہ اس زمانے کے قدامت پسند سماج میں تبھی ممکن تھا جب روایتی معاشرے میں کم سے کم مداخلت کی پالیسی اختیار کی جائے۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ انیسویں صدی کے اوائل کی اکثر سماجی، تعلیمی اور مذہبی اصلاحات کی تحریکیں بنگال کے نئے شہری متوسط اور روشن خیال طبقے نے شروع کیں نہ کہ برطانوی حکمرانوں نے۔ اس لیے حکمرانوں کے نقطۂ نگاہ سے مذکورہ بالا اعلان جاری

حسب ذیل تھا۔[۳]

"اس بات کی خاص احتیاط رکھی جائے کہ ادنی ذاتوں کے تمام آدمیوں کو نہ بھرتی کیا جائے مثلاً چھوٹے موٹے دوکاندار، کاتب، حجام، تیلی، گڈریے، چھپر بند، پنواڑی، بھڑبھونجے، تلی، کہار، حلوائی، مالی اور بہت سے دوسرے جو ادنی پیشوں میں کام کرنے کے عادی ہیں۔"

ایک بنگالی رجمنٹ کی ترکیب عام طور پر اس طرح تھی:— برہمن ۳۵۰، راجپوت ۳۵۰، مسلمان ۱۵۰، اعلیٰ ذاتوں کے ہندو ۱۵۰

اس قسم کی فوج میں ہر قسم کے مذہبی پرچار سے متاثر ہونے کی زبردست صلاحیت ہونی چاہیے تھی اور بنگالی فوج میں واقعی پیدا ہو گئی۔ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے پر متضاد خیالات کی پوری پوری چھان بین کے بعد "کلکتہ ریویو" (دسمبر ۱۸۵۷ء) اس نتیجہ پر پہنچا کہ "بنگال کے غدر کا اصلی سبب وہ مکمل بے قاعدگی اور نافرمانی کی ذہنیت تھی جو بنگالی فوج کے برہمنوں کا خاصہ تھی۔"

بغاوت کے مذکورہ بالا سماجی اور مذہبی اسباب اور بنگال کی فوج میں اونچی ذات کے غیر بنگالیوں کی موجودگی نہایت اہم امور تھے جو نئے بنگالی متوسط طبقے کے بالعموم اور پڑھے لکھے لوگوں کے رویہ کے بالخصوص موجب تھے۔ انیسویں صدی کے اولین نصف کے دوران جو سماجی اور تعلیمی تحریکیں یکے بعد دیگرے چلائی گئی تھیں ان پر یکے بعد دیگرے نئے متوسط اور روشن خیال طبقوں نے متواتر اور جم کر لڑنے کے بعد اپنا اثر قائم کر لیا تھا۔ رام موہن رائے اور ان کے ساتھیوں نے جنھیں نوجوان بنگال کے ڈیروزین (Derozians) کہتے تھے، برہمو سماجیوں اور ودیا ساگر کے مریدوں نے غازیوں کی طرح سماجی اور مذہبی قدامت پسندی کی تمام قوتوں کے متحدہ محاذ کے خلاف جنگ کی۔ ان سماجی جنگوں کی شدت کی ایک جھلک ان کی تصنیفات اور بیانات سے ظاہر ہے۔ ان میں سے چند قابل ذکر ہیں۔

نوجوان بنگال کے دو اہم ترین اخبارات یہ تھے، "دی انکوائرر" The Enquirer (انگریزی) اور "گیان انوشن (بنگالی یعنی جستجوئے علم)، جس نصب العین کے لیے نوجوان بنگال نے جنگ کی، ان کے اخبارات کے نام سے ظاہر ہے The Enquirer کا مدیر کرشن موہن بنرجی تھا اور گیان انودیشن کا دکشنا رنجن مکرجی تھا۔ دونوں سرکردہ ڈیروزین تھے۔ "انکوائرر" (The Enquirer) نے جولائی ۱۸۳۱ء میں کٹر ہندو فرقے کے غیظ و غضب کے بارے میں یوں لکھا:[۵]

"مذہبی ظلم و ستم اب بھی جاری ہیں، مذہب کے متعصب دیوانے الزام تراشی میں مصروف ہیں

بغاوت کا اہم ترین سبب تھا۔

"عیسائی مبلغوں نے بھی دینِ عیسوی کی تبلیغ کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا۔ مذہبی رسائل بصورت سوال وجواب شایع اور لوگوں میں تقسیم ہونے لگے۔ وہ اپنی مرضی سے مسلمانوں کی مسجدوں اور ہندوؤں کے مندروں اور میلوں میں اکثر تبلیغِ مذہب کی خاطر جاتے جس پر کوئی شخص حکام کے خوف کی وجہ سے اعتراض کرنے کی جرأت نہ کرتا۔ اس کے علاوہ بعض ضلعوں میں انھیں اپنے ساتھ تھانے کا ایک سپاہی یا چپراسی لے جانے کی بھی اجازت تھی۔ یہ لوگ صرف دینِ عیسوی کی تبلیغ پر اکتفا نہ کرتے بلکہ دوسرے مذاہب کے مقدس مقامات اور قابلِ تعظیم ہستیوں کا بہت بے ادبی کے ساتھ ذکر کرتے جس سے سُننے والوں کو بہت دُکھ اور رنج ہوتا اور لوگوں کے دلوں میں حکومت کے تئیں نفرت پیدا ہوتی تھی۔"

سر سید احمد نے کلکتہ کے ایک شخص ڈبلیو۔ای۔ ایڈمنڈ کے ایک خط کا حوالہ دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ چوں کہ ملک کے تمام حصّوں کو ریلوں، دخانی جہازوں اور برقی تاروں کے ذریعے ایک دوسرے کے ساتھ تیزی سے ملایا جا رہا ہے اس لیے اب سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کرنے کا وقت ہے کہ آیا مذہبی اتحاد بھی ہونا مناسب ہے یا نہیں۔ یہ مذہب عیسائیت ہے جو ہندوستان میں مختلف فرقوں اور طبقوں کو متحد کر سکتا ہے۔ اس خط پر جو کلکتہ کے عوام اور سرکاری ملازمین میں مشتہر کیا گیا، سید احمد نے نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا:

"یہ ایک حقیقت ہے کہ ان خطوط کے پہنچتے ہی پردیسی باشندے ایسے دہشت زدہ ہوئے کہ گویا ان کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا ہو اور ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ سب کو یقین ہو گیا کہ مدت سے جس گھڑی کا ڈر تھا، آخر آ پہنچی۔ اب پہلے سرکاری ملازموں کو اور پھر ساری آبادی کو دینِ عیسوی قبول کرنا ہوگا۔"

ان امور کے علاوہ بنگالی فوج کی ارتقا کی تاریخ، اس کی ترکیب اور بھرتی کرنے کے قواعد بھی قابلِ غور ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کلائیو نے ایک بٹالین بھرتی کی جو اس کے تحت پلاسی میں لڑی اور جو بنگال کی فوج کی بنیاد تھی۔ چوں کہ یہ شمال مغرب علاقوں کی جنگجو آبادی سے بھرتی کی گئی تھی اس لیے یہ زیادہ تر اونچی ذات کے آدمیوں پر مشتمل تھی جو ہر خطرے کا سامنا کرنے پر آمادہ تھے لیکن سپاہی کے ادنیٰ فرائض سے کراہیت کا اظہار کرتے تھے جب کہ مدراس اور بمبئی کی رجمنٹیں، جن میں مختلف نسلوں اور ذاتوں کے آدمی ایک دوسرے سے ملتے اور بھائیوں کی طرح رہتے، عام طور پر زیادہ فائدہ مند اور فرماں بردار تھیں۔[2] بنگالی فوج کے بھرتی کے قواعد میں ایک پیراگراف

ذہین نوجوان مثلاً کرشن موہن، مدھوسودن دت (مشہور شاعر) اور کئی دوسرے عیسائی ہو گئے۔

تبدیلیٔ مذہب کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ عیسائیت سے متعلق خطبوں اور مناظروں کا اہتمام کیا جاتا جس میں کالج کے طلبا اور تعلیم یافتہ لوگ بھاری تعداد میں حصہ لیتے۔ ڈف نے جس مجلسی ہلچل کی تصویر کھینچی اس سے بے حد جوشیلے مبلغین چشم پوشی کرتے۔ ہندو کالج کے حکام چوکس ہو گئے اور خیال کرنے لگے کہ ان کا مذہب خطرے میں ہے۔ اس لیے انھوں نے فیصلہ کیا کہ جو طالب علم ان خطبوں اور مناظروں میں شامل ہوگا اسے کالج سے خارج کر دیا جائے گا۔ ۱۸۴۰-۵۹ء کے دوران حالات انتہائے ابتری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ صورت حال ایسی نازک ہو گئی کہ برہمو سبھائیوں اور دوسرے مصلحین نے تتوبودھنی میں دیوندر ناتھ ٹیگور (والد رابندر ناتھ ٹیگور) کی زیر قیادت ایک مجلس منعقد کی اور اُس وقت مصلحت اس بات میں دیکھی کہ قدامت پرست دھرم سبھائیوں کے ساتھ جو ان کے دشمن تھے، عیسائی مبلغین کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک متحدہ محاذ بنایا جائے[6] "تتوبودھنی پتر کا" میں اداریتی مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوا جن میں عیسائی مبلغوں کی مذمت کی گئی۔ لیکن یہ تمام کوششیں مشنریوں کی سرگرمیوں کو روکنے میں ناکام رہیں بلکہ ان کو اتنی جرأت ہوئی کہ انھوں نے ستمبر ۱۸۵۵ء میں بمقام کلکتہ بنگال کے تمام مشنریوں کی ایک مجلسِ عام منعقد کی۔ اس مجلس کے خاتمے پر یورپ اور امریکہ کی تبلیغی انجمنوں سے زیادہ آدمیوں اور روپے کی امداد اور تعاون کی اپیل کی گئی تاکہ زیادہ جوش وخروش کے ساتھ تبلیغی سرگرمیوں کو جاری رکھا جائے۔

عیسائی مبلغوں کی ان زیادتیوں کو روکنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ بنگال کے مصلحین نے اپنی سماجی اور تعلیمی اصلاحات کی جدوجہد کو مذہب کے خلاف جہاد کی راہ سے الگ تھلگ رکھا زیادہ توجہ سماجی مسائل پر مرکوز کی جاتی جیسے ہندو بیوہ کی دوبارہ شادی، بچپن کی شادیوں کی ممانعت، ذات پات کی تفریق، ایک سے زیادہ شادیوں کا دستور، عورتوں کی تعلیم اور نجات وغیرہ۔ وسط صدی کی سماجی تحریکات میں پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر نے ایک مرکزی حیثیت حاصل کی۔ زیادہ تر ان کی اور ان کے ایک رفیق کلا اکشے کمار دت کی مسلسل کوششوں کی وجہ سے بیوہ کی دوبارہ شادی، تعلیم نسواں کے حق میں اور ایک سے زیادہ شادیوں اور بچپن کی شادیوں کے رواج کے خلاف تتوبودھنی پتر کا اور دوسرے اخبارات کے کالموں کے ذریعہ مہمات شروع کی گئیں[8]۔ ودیا ساگر نے عیسائی مبلغوں اور قدامت پرست ہندوؤں کو اپنے حملے کا سیدھا نشانہ نہ بنایا۔ ان کے حربے دلائل اور انسان دوستی تھے۔ ان کا جھکاؤ سوائے ہندومت کے کسی اور مذہب کا طرفدار

گرم سبھا تشدد پر مائل ہے وہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں (ڈاکٹر ہندوؤں کی دھرم سبھا کو جو نوجوان
مصلحین کے خلاف ہنگامے کرتی رہتی تھی، طنزاً گرم سبھا کہتے تھے) مذہبی دیوانوں کا نعرہ ہے
"حقہ پانی بند کرو!" ہمیں امید ہے کہ "ثابت قدمی" روشن خیال لوگوں کے پاس اس کا جواب ہے
گرم سبھا میں ابال آرہا ہے۔ اسے کھولنے کی حد تک پہنچنے دو۔ مذہبی دیوانے غضب ناک ہی نہیں
مشتعل ہونے دو۔ آزاد خیال کی آواز ایک رومن کی آواز ہونے دو۔ رومن نہ صرف عمل کرنا جانتا ہے
بلکہ سختی جھیلنا بھی جانتا ہے۔ "حقہ پانی بند" کا ڈھنڈورا گھر گھر پٹنے دو۔ چند سو کو سماج برادری سے
خارج ہونے دو۔ یہ ایک جماعت منظم کریں گے جو ہم صدق دل سے چاہتے ہیں۔

اگرچہ کرشن موہن خود ایک کٹر بنگالی برہمن خاندان سے تھا، پھر بھی اس نے اپنے فرقے پر
سخت حملے کیے۔ اس نے ایک ناٹک بعنوان دی پری کیوٹڈ (The Persecuted) لکھا جس
کی تمہید میں اس نے بیان کیا:۵

"ہندو فرقے کے بارسوخ افراد کی سیاہ کاریوں اور بے اصولیوں کی تصویر ان کی آنکھوں
کے سامنے کھینچی گئی ہے۔ اب وہ برہمنوں کی عیاریوں اور دغا بازیوں کو صاف صاف دیکھیں گے
اور ان سے اپنے آپ کو بچا سکیں گے۔"

ناٹک کا ایک کردار بنی لال کہتا ہے: "اب جب کہ علم نے آگے بڑھنا شروع کر دیا ہے
ہندو مت منہ کے بل گرے گا اور دھڑام سے گرے گا۔ اصلاحِ مذہب ضرور ہوگی اور لوگوں کے دل
حسد کی آگ سے جلیں گے۔ تعصب اور آزاد خیالی زیادہ مدت تک ایک ہی چھت کے نیچے چھت
میں شگاف کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

قدامت پسند ہندوؤں کی گیدڑ بھبکیوں کے خلاف بنگال کے نوجوان مصلحین کا [illegible]
تھا۔ اس سے ان کی بے صبری، جنگ جوئی اور عدم مصالحت ٹپکتی تھی۔ یہ کوئی دانائی یا دور اندیشی
کی بات نہیں تھی لیکن مصلحین کے خلوص، جوش اور عقیدت میں کوئی شک نہ تھا۔ جب اصلاح
سے مراد اصلاحِ مذہب تھا اور مذہب سماج کا بڑا ستون تھا تو نوجوان ڈیروزیوں (مصلحین) کے
لیے مذہب کو چن کر سیدھے حملے کا نشانہ بنانا ایک فطری فعل تھا۔ (اگرچہ حکمت عملی کے اعتبار سے
غلط تھا) مذہب کے تئیں اس ڈیروزین رویے نے مشنریوں کے لیے دینِ عیسوی کی تبلیغ کا ایک
تاریخی موقع پیدا کر دیا۔

پادری ڈف کی طرح کئی مقتدر شخصیتیں اس میدان میں سرگرم ہوگئیں۔ معزز خاندانوں کے

نے رجعت پسندوں کے لامحدود وسائل کے خلاف لڑائیاں زیادہ تر انگریزوں کی مدد سے جیتی تھیں۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ بغاوت کرنے والوں اور ان کے مذہبی رجعت پسندی کے نعرۂ جہاد کی مخالفت کر کے بنگال کا روشن خیال طبقہ قدامت پسند برطانوی حکمرانوں کے موقف کی بھی مخالفت کر رہا تھا جو اپنی پارٹی کے آزاد خیال لوگوں کی سختی کے ساتھ نکتہ چینی کر رہے تھے اور ان پر الزام رکھ رہے تھے کہ وہ سماجی اصلاحات میں عجلت سے کام لے کر بغاوت کا موجب بن رہے تھے۔

۲

سیاسی، اقتصادی اور سماجی اسباب کی بنا پر بھی بنگال کے روشن خیال طبقے نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی مخالفت کی۔ جدید سماج میں چیدہ لوگوں کے انتخاب سے متعلق کارل منہیم کہتا ہے:[9]

اگر ہم تاریخی پس منظر میں اس کا جائزہ لیں کہ چیدہ لوگوں کا انتخاب کس بنیاد پر عمل میں آ رہا ہے تو ہمیں تین واضح اصول نظر آتے ہیں: خاندان، جائداد اور استعداد۔ طبقہ امرا اپنے چیدہ نمائندوں کو بنیادی طور پر خاندان کی بنا پر چنتا تھا خصوصاً اس وقت جب اس نے اپنے قدم جما لیے تھے۔ شہری متوسط طبقے نے آہستہ آہستہ ایک اور اصول کا بھی اضافہ کیا یعنی اصولِ دولت جو پڑھے لکھے طبقے کے چیدہ لوگوں پر بھی صادق آتا تھا کیوں کہ تعلیم کا موقعہ کم و بیش صرف امیروں ہی کے بچوں کو حاصل تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ابتدائی دور میں بھی استعداد کا اصول کسی قدر دوسرے دو اصولوں کے ساتھ شامل تھا لیکن یہ جدید جمہوریت (جب تک اس میں توانائی ہے) ہی کا فیض ہے کہ استعداد سماجی کامیابی کی معیاری شرط کی حیثیت سے روز افزوں اہمیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

انیسویں صدی کے پہلے نصف کو ہم بنگال کے جدید شہری متوسط طبقے کا ابتدائی دور کہہ سکتے ہیں۔ روشن خیالوں کے انتخاب کے طریقوں میں اصولِ استعداد کو خاندان اور جائداد کے دو اصولوں کے ساتھ شامل کیا گیا تھا۔ بغاوت کے وقت بنگالی روشن خیالوں کی دوسری اور تیسری پشت میں تین اصولوں میں سے کم از کم اصولِ خاندان یقیناً متروک ہو رہا تھا۔ بنگالی سماج میں روشن خیالوں کے انتخاب کے لیے دولت اور استعداد کے اصول موثر معیار بن رہے تھے۔ بنگال کے پڑھے لکھے لوگوں کی بڑی اکثریت خوش حال، اعلیٰ، متوسط طبقوں کے کنبوں سے تعلق رکھتی تھی جنھوں نے ادنیٰ

نہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ ہر مذہب کے اپنے اعتقادات اور توہمات ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں وہ اپنے ساتھی مصلحین یعنی ڈیروزیوں اور برہمو سبھائیوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ ودیا ساگر کے بے لاگ اور متوازن رویّے نے اس زمانے کی سماجی تحریکات پر سنجیدہ اثر ڈالا۔ خاص طور پر ڈیروزیوں کی مذہب کے خلاف انتہا پسندی پر۔ لیکن اس کی چلائی ہوئی تحریکوں سے قدامت پسند دھرم سبھائی ایسے برانگیختہ ہوئے کہ انھوں نے متانت اور سنجیدگی کو بالائے طاق رکھ کر مصلحین کو بے دینوں کا ایک گروہ قرار دیا جسے فتنہ پرداز پادریوں نے گمراہ کر رکھا تھا۔ یہ حملے جوابی حملوں کا موجب ہوئے جب ۱۸۵۶ء کے ایکٹ پندرہ کی رو سے ہندو بیوہ کی شادی دوبارہ قانوناً جائز قرار دی گئی اور دسمبر ۱۹۵۶ء میں بمقام کلکتہ ترقی پسندوں نے اس قانون کے اختیار کے تحت پہلی ایسی شادی بڑی دھوم دھام سے منائی تو بحث و مباحثہ کی گرمی اشتعال کی حد تک پہنچ گئی۔ یہ بحث زیادہ تر مذہبی تھی۔

۱۸۵۷ء کے آغاز میں بنگال کے سارے سماج میں ہیجان بپا تھا۔ قدامت پسند ہندو اور جاہل اور توہم پرست لوگ مصلحین کی نمایاں کامیابیوں پر بدحواس ہو گئے۔ مذہبی دیوانوں کا گڑھ اب منہدم ہونے والا تھا۔ رام موہن، ڈیروزین، برہمو سبھائی اور ودیا ساگر کے پیرو اس گڑھ کے بعض بھاری ستونوں کو یکے بعد دیگرے مسمار کر رہے تھے۔ دھرم سبھائی اسے برطانوی حکمرانوں اور ان کے ایجنٹوں یعنی عیسائی مشنریوں کی محض ایک سازش خیال کرتے تھے جس کا مقصد تمام لوگوں کو ان کے مذہب کو برباد کر کے عیسائی بنانا تھا۔ صدائے احتجاج بلند سے بلند تر ہونے لگی۔

اس شور، افراتفری اور ہنگامے کے درمیان اس شک کی بنا پر کہ کارتوس گائے اور سور کی چربی سے آلودہ کیے جاتے ہیں۔ کلکتے سے چند میل دور بارک پور میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ یہی وجہ تھی کہ سپاہیوں کی شکایات نے مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔ سپاہیوں نے عین اس وقت مذہب میں مداخلت کے خلاف شور برپا کیا جب روشن خیال طبقہ شہر میں قدامت پسند ہندوؤں کے اسی ہنگامے کی مخالفت کر رہا تھا۔ بنگال کا روشن خیال طبقہ بنگالی فوج کے اعلیٰ ذات ہندوستانی اور راجپوت عنصر سے پوری طرح باخبر تھا اور ان کے مشہور مذہبی تعصب اور قدامت پسندی سے بھی واقف تھا اس لیے وہ قدرتی طور پر ان کو سماجی رجعت پسندوں کا طرفدار سمجھتا تھا۔ ان حالات میں اُن کے لیے سوائے ان کی مخالفت کرنے کے کوئی اور چارہ نہ تھا۔ باغیوں اور ان کے مقصد کی حمایت کرنا اس وقت ان اصولوں اور عقیدوں کے منافی تھا جن کے لیے روشن خیال طبقے نے نصف صدی سے زیادہ جدوجہد کی تھی۔ انھوں نے برطانوی حکمرانوں کا ساتھ دیا کیوں کہ انھوں

حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے) لوگوں کی بے اطمینانی کے مندرجہ ذیل اہم سبب کا ذکر کرتا ہے:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ طریقۂ امتحان سے حکومت ملک میں لائق آدمیوں کی خدمات حاصل
کرنے کے قابل ہو گئی لیکن یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ اس کے عمل سے اکثر ایسے اشخاص کو اعلیٰ عہدوں پر
فائز کیا جاتا ہے جنہیں ان کے ہموطن انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ قابلیت کی سندات عطا
کرنے میں خاندانی تعلقات، اعلیٰ ذات یا سماجی وقار کا کوئی لحاظ نہیں رکھا جاتا۔"

سید احمد کے اس نکتے پر تبصرہ کرتے ہوئے رچرڈ ٹیمپل نے ایک یادداشت میں لکھا (ضمیمہ
متن مقالہ):-

"ان کا بیان ہے کہ اونچی ذات، خاندان اور اعلیٰ تعلقات رکھنے والے بہت تھوڑے دیسی
باشندوں کو ملازمت میں لیا جاتا ہے اور ایک سخت طریقۂ امتحان کی وجہ سے استعداد کو کلیتاً
ترجیح دی جاتی ہے۔ یہ بیان بہت حد تک درست ہے۔ مصلحت اسی میں ہے کہ اب اعلیٰ طبقات
کو پہلے سے زیادہ مواقع میسر ہوں اور ساتھ ہی قابلیت کے مخصوص معیار پر بھی تاکید روا رکھی جائے۔"

یہ ظاہر ہے کہ متوسط طبقات اور روشن خیال لوگوں کے انتخاب [illegible] استعداد کافی
سختی کے ساتھ عمل کر رہا تھا اور دوررس سماجی اثرات پیدا کر رہا تھا۔ اس سے قدیم معاشرے کے
شرفا اور اُمرا کی صفوں اور ان کی لاڈلی اولاد میں بے اطمینانی پھیل رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں انھوں
نے ذات اور جاگیر پر مبنی اپنے کھوئے مقام کو از سر نو حاصل کرنے کا موقع دیکھا۔ نہ صرف بنگال کے روشن
خیال طبقے کو بلکہ ہندوستان کے بالعموم ہندو اور مسلم، بنگالی اور غیر بنگالی تعلیم یافتہ متوسط طبقے کو ۱۸۵۷ء
کی بغاوت کی کامیابی کے امکانات میں قدیم معاشرے کی بحالی [illegible] جس کے نصب العین اور اصول
تمام تر رجعت پسندانہ تھے۔ لیفٹننٹ [illegible] ایک [illegible] حقیقت بیان کر رہا تھا جب اس نے کہا:
"جن لوگوں نے انگریزی خیالات اور [illegible] سب سے زیادہ فیض پایا ہے انھوں نے حالیہ
فتنہ و فساد میں سب سے کم حصہ لیا ہے... مجھے حقیقی طور پر تعلیم یافتہ ایک ہندوستانی کی مثال بھی
معلوم نہیں جس نے باغیوں کے ساتھ شامل ہونا تو درکنار ان کے ساتھ ہمدردی کا اظہار بھی کیا ہو۔"

بعض اوقات یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے نہیں بلکہ صرف تعلیم یافتہ ہندوؤں نے ہی ۱۸۵۷ء
کی بغاوت کی مخالفت کی تھی۔ ہم [illegible] تسلیم کرتے ہیں کہ غدر کے دوران ہندوؤں کی نسبت مسلمان زیادہ آزردہ
خاطر تھے لیکن سید احمد خاں نے ایک رسالہ بعنوان "An Account of the Loyal Mohammedans in India Part II"
میں اس بیان کی تردید کی۔ رسالے میں ان کا مقصد یہ ثابت

متوسط طبقے نے ترقی کے مرحلے طے کیے تھے

انھوں نے اپنا اقتصادی نظام تجارت اور سوداگری سے اور علمی معیار نئی انگریزی تعلیم سے بلند کیا تھا۔ بغاوت کے دوران اہلِ علم وادب کا بڑا گروہ جن کی اکثریت ایسے کنبوں سے تعلق رکھتی تھی مذکورہ ذیل اشخاص پر مشتمل تھا۔

پرسن کمار ٹیگور، دیبندر ناتھ ٹیگور، رام گوپال گھوش، پیاری چند مترا، کشور چند مترا، موہن بینرجی، ہر چندر گھوش، رسک کرشن ملک، رادھا ناتھ سکدر، ہریش چندر مکرجی، راجندر مترا، مائیکل مدھوسدن دت، لال بہاری دے، جتیندر موہن ٹیگور، دکشنا رنجن مکرجی، گریش گھوش، پنڈت ایشور چندر ودیا ساگر اور بیس پچیس سال کے بعض نوجوان مثلاً بنکم چندر چیٹرجی، کیشپ چندر سین، کرسٹو داس پال اور دوارکا ناتھ مترا۔

ان میں سے بعض نئے بنگالی زمینداروں کی اولاد تھے۔ یہ نو دولتوں کا ایک طبقہ تھا جو بندوبست دوامی کے فیض سے قدیم زمیندار امرا کی راکھ سے پیدا ہوا۔ اصل میں یہ لوگ بنیے اور متوسط (دلال اور ایجنٹ) تھے جنھوں نے بڑی بڑی رقمیں زمین کی خریداری میں لگا دیں۔ خود زمین پر نہ رہتے بلکہ شہروں میں رہنے لگے جس کی وجہ سے امرا کے نئے شہری طبقہ میں بھاری اضافہ ہوا۔ خیالوں کے انتخاب میں دولت کا حصول اس قدر فیصلہ کن اور اہم تھا کہ دیبندر ناتھ ٹیگور، رام گوپال گھوش اور پیاری چند مترا جیسے ممتاز بنگالی علما و فضلا نے کاروبار کے ذریعہ دولت جمع کرنے کے لیے بے حد کوشش کی۔

بنگال میں اب علمی مہم جو تجارتی مہم جو بھی بن رہے تھے۔ نئے شہری ماحول میں خاندان اور جائداد کی اب خاص وقعت نہ رہی اور جہاں شخصی وقار کی اہمیت بڑھ رہی تھی عقل کی برتری بھی سماج میں درجہ بلند ہونے کا وسیلہ ہو سکتی تھی اور اس کے دور رس اثرات ہو سکتے تھے۔ ودیا ساگر کے سے لوگوں نے جو غریب متوسط طبقے کے کنبوں سے تعلق رکھتے تھے، اسی وسیلے سے اپنا رتبہ بڑھایا تھا لیکن دولت کے حصول سے بھی انھوں نے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ ودیا ساگر کو بھی دولت اور استعداد کے دو معیاروں میں توازن قائم رکھنے کے لیے طباعت اور اشاعت کا آزاد کاروبار شروع کرنا پڑا۔ بنگال میں وہ اس پیشے کے بانیوں میں سے تھا۔

سماج میں اس اصولِ استعداد کے عمل اور اس کے تاثرات کی وضاحت کے لیے میں ایک مثال پیش کرتا ہوں جو بہت اہم ہے۔ سید احمد بغاوت کے اسباب پر اپنے مقالے میں (جو

ساتھ یوں لکھتا ہے[۳]:

"بنگالی کبھی بھی فوجی قیادت کے ذریعہ شان وشوکت کے خواہاں نہیں رہے۔ ان کے مشاغل اور کارنامے کلیتاً غیر فوجی ہیں۔ ان کی قوی اور ہمہ گیر ذہانت انھیں دقیقہ رسی اور دور اندیشی کے اہل بناتی ہے۔ وہ امید رکھتے ہیں کہ ان انگریزوں کو جو خود مختار کونسل یا پارلیمنٹ میں لوگوں کے نمائندے بن کر بیٹھے ہیں ان کی عقلِ سلیم اور انصاف پروری کا واسطہ دے کر جونہی مناسب موقع آئے گا وہ قانونی اور آئینی طریقوں سے اپنے غیر ملکی حکمرانوں کے ساتھ مساوات کے درجے کی طرف اور بڑھیں گے اور ایشیا میں سب سے بڑی اور مستحکم سلطنت کے معاملات کے اہتمام میں ذمہ داری اور عزت کے ساتھ شریک ہوں گے۔"

ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کے ان جاگیردار آقاؤں سے قانون اور آئین کی اپیل کرنے کا موقع نہیں آئے گا جو برطانوی حکمرانوں سے اپنا کھویا ہوا اقتدار چھیننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور ایسے سماجی نظام میں جس پر بادشاہوں اور امیروں کا غلبہ ہو ایسا وقت نہ آئے گا جب متوسط طبقے اپنے حکمرانوں کے ساتھ برابری کا درجہ پا سکیں۔

برطانوی حکومت کے زیرِ اثر جو نئے متوسط طبقات پیدا ہوئے انھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں امید کی کوئی جھلک دکھائی نہ دی۔ ان کی امیدیں یورپ اور انگلستان کے متوسط طبقے کی سیاسی، معاشی اور سماجی میدانوں میں کامیابی کے ساتھ وابستہ تھیں۔ ان کی نگاہ میں برطانوی حکمران ان "متوسط طبقات" کے نمائندے تھے اور انھوں نے اپنے طبقاتی مفاد کی خاطر ان کے نقشِ قدم پر چلنے میں زیادہ مصلحت دیکھی بجائے اس کے کہ جاگیرداری کے منہ زور گھوڑے کی سواری کریں۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے ۱۸۵۷ء کے باغیوں کی صاف صاف مذمت کی۔

حواشی

۱۔ سید احمد خاں: *An Essay on the Causes of the Indian Revolt.* صفحات ۱۵-۸

۲۔ ٹی۔ رائیس ہومز: *A History of the Indian Mutiny.* طبع پنجم ۱۹۰۴ء

۳۔ دسمبر ۱۸۵۷ء کے "کلکتہ ریویو" صفحہ ۴۸۰ پر منقول

کرنے کا تھا کہ کسی تعلیم یافتہ یا معزز مسلمان نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا اور جو لوگ [illegible]
میں اپنے آپ کو "مولوی" کہتے تھے وہ "عیار" تھے۔

اس لیے فوجی بغاوت سے مخالفت کے معاملے میں ہندو یا مسلم اور بنگالی یا غیر بنگالی کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا بلکہ یہ مجموعی طور پڑھتے لکھے طبقے کے سماجی اور معاشی مفاد کے تحفظ کا سوال تھا جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کے نئے معاشرتی حالات کے تحت پیدا ہوا تھا۔ ان کی ابتدا اور ترقی دولت اور استعداد کی ایسی آزاد محرک قوتوں کی رہینِ منت تھی جوان کی رائے میں اس سماج میں ناپید ہوں گی جس کا نقشہ بغاوت کے جاگیردار رہنماؤں کے ذہن میں تھا۔

تعلیم یافتہ متوسط طبقے کا بڑھتا ہوا سیاسی شعور بغاوت سے اس کے مخالفانہ رویے کا جزوی ذمہ دار تھا۔ وہ اس سماج میں اپنے سیاسی پارٹ سے آگاہ تھے جس نے انھیں پیدا کیا۔ ان کے حکمرانوں کے وطن، انگلستان سمیت یورپ میں ہر جگہ آزادی، برابری اور برادری کے جھنڈے تلے متوسط طبقات کا عہد شروع ہو رہا تھا۔ رام موہن کے زمانے سے بنگال کا تعلیم یافتہ متوسط طبقہ یورپ اور امریکہ میں اپنے ساتھیوں کی ہر فتح پر کھلم کھلا خوشیاں منا رہا تھا۔

جب انگلستان کے دارالعوام میں گذشتہ صدی کے ۲۹-۱۸۳۰ء کے دوران اہم ریفارم بل پیش کیے گئے اور انگریزوں کے متوسط طبقات نے صنعتی انقلاب کے بعد سماجی اصلاحات کے سلسلے کے ذریعے قابل قدر فتوحات حاصل کیں تو بنگال کے روشن خیال طبقے نے اس خبر کا خیر مقدم خوشی کے نعروں کے ساتھ کیا۔ جب جولائی ۱۸۳۱ء میں ایک دن اصلاحات کی خبر کلکتہ پہنچی سرکردہ ڈیروزین جریدے نے اس پر پُرجوش تنقید کی۔ پادری ڈف نے اس تاثر کو نوٹ کرتے ہوئے لکھا:[۱۲]

"The Enquirer (دی انکوائرر) کا اگلا شمارہ خاص طور پر آتش بیانی کا مرقع بن کر آتا تھا۔ جس قدر دلآویزی اور جادو بیانی یونان اور روم کی داستانِ آزادی میں پائی جاتی ہے اسے جوش اور مسرت کے ساتھ دُہرایا گیا ہے۔ انگلستان کے ریفارم بل میں عالمی اصلاحات کے آثار دیکھے گئے ہیں۔" مرحبا! اے آزادی مرحبا!" کا پرجوش نعرہ گونج اٹھا۔"

یہ کلمات بنگال کے تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے سیاسی شعور کا بیّن ثبوت پیش کرتے ہیں۔ ان سے اُن ارمانوں کا بھی اظہار ہوتا ہے جن کے حصول کی توقع وہ بے تابی کے ساتھ کر رہے تھے۔ ہندو پیٹریٹ (The Hindu Patriot) بغاوت کے دوران اس سے متعلق سنجیدگی

Educated Natives

۱۱۔ ڈف، بحوالہ تصنیف صفحہ ۶۴۸

۱۲۔ "دی ہندو پیٹریٹ" The Hindu Patriot مورخہ ۱۸؍جون ۱۸۵۷ء
"The Sepoy Mutiny and its action upon the People of Bengal."

۴۔ "دی انکوائرر" (The Enquirer) کی پرانی فائل نہیں ملی۔ الیگزینڈر ڈف نے اپنی کتاب "انڈیا اینڈ انڈیا مشن" (۱۸۴۰ء) میں اس کے بعض اقتباسات نقل کیے ہیں۔ یہ اقتباسات ریورنڈ ڈف کی کتاب سے لیے گئے ہیں۔ صفحات ۶۴۹-۶۴۸، ۶۵۳-۶۵۲۔

۵۔ بابو کرشن موہن بینرجی: "دی پرسی کیوٹڈ"
The Persecuted or Dramatic Scenes, Illustrative of the present state of Hindu society in Calcutta (Calcutta 1831)

۶۔ دیبندر ناتھ ٹیگور کی بنگالی زبان میں آپ بیتی "آتم چرت" مرتبہ ستیش ودیابھوشن باب تیرھواں۔

۷۔ "تتو بودھنی پتر کا" یکم جیٹھ، ۱۷۶۷ء شک سمت (۱۸۴۵ء)، یکم پوس ۱۷۶۷ء شک سمت (۱۸۴۵ء)

۸۔ ایضاً یکم بھادوں، ۱۷۶۷ء شک سمت (۱۸۴۵ء) بچپن کی شادی اور ایک سے زیادہ شادیوں کے رواج سے متعلق، یکم کاتک ۱۷۶۸ء شک سمت (۱۸۴۶ء) تعلیم نسواں سے متعلق، پھاگن ۱۷۷۶ء شک سمت (۱۸۵۴ء) بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق ودیا ساگر کا دستخطی مقالہ، چیت ۱۷۷۶ء شک سمت (۱۸۵۴ء) مقالہ اکشے کمار دت متعلقہ شادی بیوہ۔ اگہن (نومبر۔ دسمبر) ۱۷۷۷ء شک سمت (۱۸۵۵ء) بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق، چیت (۱۸۵۵ء) ایک سے زیادہ شادیوں کے رواج کے متعلق۔ بھادوں ۱۷۷۸ء شک سمت (۱۸۵۶ء) ایک سے زیادہ شادیوں کے متعلق، پوس ۱۷۷۸ء شک سمت (۱۸۵۶ء) بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق، پوس ۱۷۷۹ء شک سمت (۱۸۵۷ء) بیوہ کی دوبارہ شادی سے متعلق۔

۹۔ کارل مینہم: "مین اینڈ سوسائٹی"
Man and Society صفحہ ۸۹

۱۰۔ سید احمد خاں: بحوالہ تصنیف صفحات ۴۴-۴۳

۱۱۔ میڈیکل کالج، کلکتہ کے طلبہ میں تقسیم اسناد (ڈپلومے) کے موقع پر تقریر مورخہ ۱۹ر اپریل ۱۸۵۹ء "کلکتہ منتھلی ریویو" Calcutta Monthly Review مورخہ مئی ۱۸۵۹ء کے اداریہ میں تقریر مذکورہ کی حمایت: "The Mutiny and the

چلنے کی سزا دی جاتی۔

"مصنف نے وہی سزا اس ہندوستانی کو دینے کی حمایت کی جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بارے میں کچھ لکھنے کی جرأت کرے"!

پس ہندوستانیوں کو اس مباحثے میں کسی رائے کے اظہار کی مجال نہ تھی لیکن ہمارے باغی بزرگ بہادری کے کارنامے انجام دے کر اور اپنا گرم خون بہا کر ایسی داستان چھوڑ گئے جس کا بیان الفاظ کا محتاج نہیں ہے۔ یہ افسوس کا مقام ہے کہ ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار کے اہم سال میں بلند پایہ ہندوستانی مورخین پرانی بحث کو چھیڑیں اور نئی کتابیں لکھ کر برطانوی شہنشاہیت پرستوں کے نقطۂ نظر کی حمایت میں زور رعایت سے کام لیں۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی عالموں پر برطانوی فنِ تاریخ نگاری کا کتنا گہرا اثر ہے اور ہندوستان کے قومی اندازِ فکر میں کتنے بڑے نقائص ہیں جنھیں دور کرنا ہے۔

یہ بحث پہلے خود برطانوی حکمران طبقے میں چھڑی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حامیوں نے ہندوستانی بغاوت کو محض فوجی غدر قرار دے کر اس کی وقعت کو گھٹایا تاکہ کمپنی کی حکومت کی کمزوریوں کو چھپایا جائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مخالفوں یعنی برطانیہ کے صنعتی، شہری متوسط طبقے کے نمائندوں نے مذکورہ بالا نقطۂ نظر کی حامیوں کو فاش کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ ایک قومی بغاوت تھی نتیجہ انھوں نے یہ اخذ کیا کہ کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا جائے اور برطانوی حکومت ہندوستان کو اپنے تحت کر لے۔ لارڈ کیننگ نے غیر جانبداری کا رویہ اختیار کیا تاکہ کوئی فریق ناراض نہ ہو۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے برطانوی مورخ کے کا بیان ہے کہ کیننگ نے اپنے دل میں کہا "کیا یہ محض فوجی غدر ہے جس کا میں مقابلہ کر رہا ہوں؟ ایسا نہیں لگتا تھا کہ ایسے ہنگامے کی ابتدا بلا کسی بیرونی تحریک کے صرف فوجیوں کے جذبات سے ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جو سرگرمیاں اس وقت رونما ہوئیں وہ خالص فوجی شورش کا نتیجہ رہی ہوں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسے خارجی اثرات کام نہیں کر رہے تھے جن سے ایسی ذہنی کیفیت پیدا ہوئی جو بڑھ کر خوفناک نتائج کا موجب ہوئی۔

"اس نے جلد ہی غدر کا ذکر کرنا ترک کر دیا اور اسے ایک شورش اور ایک بغاوت کا نام دیا۔ سال کے شروع میں وہ سیاسی اسباب کے خیال کو کچھ اہمیت دینے پر مائل تھا — جیسا کہ اس نے متعدد بار لکھا — لیکن اب اس معاملے کے بارے میں اس کا شک رفع ہونے لگا۔ اس نے برطانیہ کے وزیر ہند کو لکھا کہ مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بغاوت برہمنوں نے مذہبی حیلوں بہانوں

پی. سی. جوشی

ہماری تاریخ میں ۱۸۵۷ء

۱ فوجی غدر یا قومی بغاوت؟

اس سال ہندوستان ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کی صد سالہ یادگار منا رہا ہے۔ یہ ہمارے قومی ارتقا میں ایک عہد آفریں واقعہ ہے۔ یہ ایک عظیم واقعہ ہے جسے وطن پرست ہندوستانی جدید قومی تحریکِ آزادی کی بنیاد تصور کرتے ہیں۔ پھر بھی یہی واقعہ اس بحث کا شکار ہے کہ آیا یہ محض "فوجی غدر" تھا یا قومی بغاوت"!

داستان کا صحیح ہندوستانی پہلو پوری طرح معلوم نہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں کہ تاریخی رکارڈ چھوڑ جانا ہندوستانیوں کی روایت نہیں رہی بلکہ اس وقت برطانوی عہدِ حکومت میں ایسے حالات تھے کہ اگر کوئی ایسی کوشش کرتا تو اپنی جان خطرے میں ڈالتا۔ چند ہم عصر ہندوستانیوں نے اگر ۱۸۵۷ء سے متعلق کچھ لکھا تو یہ انگریزوں کی حمایت میں تھا۔ "بنگالی پریس سے کیسے نپٹا جائے" "The Bengali press: How to deal with it" اس عنوان کے ایک مقالے سے جابرانہ برطانوی رویہ ظاہر ہے۔ یہ مقالہ ۹ اگست ۱۸۹۶ء کو اس وقت کے ایک بہت مقتدر برطانوی رسالے "Pioneer" میں شایع ہوا تھا۔

"جہاں تک موجودہ پشت کو یاد ہے ہم جانتے ہیں کہ انگریز خود اپنے اخبار نویسوں کے ساتھ کیسا سلوک روا رکھتے تھے۔ اگر کوئی شریف النفس اور خوش طبع صحافی بھول کر پرنس ریجنٹ (نائب السلطنت) کو چالیس سالہ بانکا کہہ دیتا تو اسے دو سال کی قید بامشقت کی سزا دی جاتی۔ اگر کوئی پادری انقلابِ فرانس کی تعریف کرتا اور پارلیمانی اصلاح اور منصفانہ نیابت کی حمایت کردیتا تو اسے لوہے کی بیڑیاں پہن کر کام کرنے اور حقیر ترین مجرموں کے ساتھ دلدل میں پیدل

سماگئی۔ اس وقت یہ توقع تھی کہ یہ سیلاب امنڈ کر فرنگی عنصر کو نیست و نابود کر دے گا اور جب بغاوت کا طوفان تھم کر مناسب حدود کے اندر سمٹ جائے گا تو وطن پرست ہندوستانی غیر ملکی حکمرانوں کے پنجے سے نجات پا کر کسی والیِ ریاست کے عصائے حکومت کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں گے۔ بہر حال اس تحریک نے اب ایک زیادہ اہم رنگ اختیار کیا۔ یہ تمام قوم کی بغاوت بن گئی جسے من گھڑت زیادتیوں کو بیان کر کے بھڑکایا گیا اور نفرت اور تعصب کے بل بوتے پر اس کی خام خیالیوں کو برقرار رکھا گیا۔"[۵]

"دی لندن ٹائمز" The London Times کے مشہور نامہ نگار سر ڈبلیو رسل نے لکھا:
"یہاں نہ صرف غلاموں کی جنگ اور کسانوں کی بغاوت یکجا ہو گئی بلکہ اجنبی حکومت کا جُوا اُتار پھینکنے، ہندوستانی والیانِ ریاست کے کامل اقتدار کو بحال کرنے اور ملکی مذہب کا پورا غلبہ قائم کرنے کی غرض سے یہ ایک مذہب کی جنگ، نسل کی جنگ، انتقام کی جنگ، امید کی جنگ اور قومی عزم کی جنگ تھی۔"[۶]

کرنل مالیسن نے "فوجی غدر" کے نظریے کی بنیاد پر بغاوت سے متعلق تین جلدوں پر مشتمل ایک تاریخ لکھی۔ بغاوت دبنے کے آٹھ سال بعد وہ پھر ہندوستان آیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے واقعات کے بارے میں زندگی کے مختلف شعبوں کے لوگوں کے ساتھ بات چیت کی اور اپنی بعد کی نسبتاً کم ضخامت کی تصنیف "دی انڈین میوٹنی آف ۱۸۵۷ء" (The Indian Mutiny of 1857) میں تسلیم کیا کہ بغاوت کی پشت پر قومی عنصر کا غلبہ تھا۔ یہ تصنیف ۱۸۹۱ء میں شایع ہوئی۔ اس نے لکھا: "حالات نے مجھ پر یہ ثابت کر دیا کہ ان لوگوں کے دلوں میں، جو سو سال تک ہمارے نہایت مخلص اور وفادار خادم رہے، عداوت اور نفرت کی آگ بھڑکانے میں خارجی اسباب بروئے کار تھے یہ عداوت اور نفرت ذاتی نہیں بلکہ ایک قومی جذبہ تھا۔"[۷]

اب ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے گڑھ یعنی اودھ کی شورش سے متعلق برطانوی مورخین کے بعض معنی خیز خیالات کا ذکر کرتے ہیں۔ میکلوڈ انس کا بیان ہے کہ "کم سے کم اہلِ اودھ کی جدوجہد کو جنگِ آزادی قرار دینا چاہیے۔"[۸] گورنر جنرل کے نام کورٹ آف ڈائرکٹرس کی خفیہ کمیٹی کے ایک خط مورخہ ۱۹ اپریل ۱۸۵۸ء میں لکھا ہے: "جنگِ اودھ کے عوامی جنگ کا رنگ اختیار کرنے کی وجہ بادشاہ کی ناگہانی معزولی اور لگان کا سرسری تصفیہ ہے جس نے زمینداروں کی ایک بڑی تعداد کو اپنی زمینوں سے محروم کر دیا ہے۔

ان حالات میں جو معرکہ آرائیاں اودھ میں ہوئیں ان کی حیثیت ایک جائز جنگ کی ہے نہ کہ بغاوت کی۔"[۹]

اور دوسروں نے سیاسی مقاصد کی بنا پر بپا کی ہے۔ سلطنتِ ہندوستان میں آگ لگی ہوئی ہے۔"

کارل مارکس "دی نیویارک ڈیلی ٹریبیون"
The New York Daily Tribune
کے نام اپنے ایک بلا دستخط مراسلے میں مخالف پارٹی کے رہنما ڈسرائیلی کی تقریر مورخہ ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کا حوالہ دیتا ہے اور اس پر یوں رائے زنی کرتا ہے:

"پچھلے دس سال تک ڈسرائیلی اس حقیقت کا قائل تھا کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بنیاد "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے پرانے اصول پر قائم تھی۔ لیکن اس اصول پر عمل کرتے وقت ہندوستان کی مختلف قوموں کا لحاظ رکھا جاتا تھا۔ ان کے مذہب میں مداخلت سے احتراز کیا جاتا تھا۔ اور زمیندار شرفا کی حفاظت کی جاتی تھی۔ دیسی فوج ملک کی شورش پسند ذہنیتوں کو جذب کرنے کا ایک وسیلہ تھی لیکن پچھلے کچھ سالوں سے حکومتِ ہند نے ایک نیا اصول اختیار کیا ہے یعنی قومیت کو تباہ کرنے کا اصول۔ اس اصول کو والیانِ ریاست کی جبری بربادی، جاگیروں کے بندوبست میں خلل اندازی اور لوگوں کے مذہب میں مداخلت کے ذریعے عمل میں لایا گیا ہے۔

"ڈسرائیلی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ موجودہ ہندوستانی شورش کوئی فوجی غدر نہیں ہے بلکہ ایک قومی بغاوت ہے جس کے ہندوستانی سپاہی سرگرم آلۂ کار ہیں۔ وہ اپنے خطبے کے آخر میں برطانوی ہند کو مشورہ دیتا ہے کہ وہ موجودہ ظلم و ستم کی راہ اختیار کرنے کے بجائے ہندوستان کی اندرونی حالت کو سنوارنے پر توجہ مبذول کرے۔"

اب ہم معصر برطانوی مورخوں اور وقائع نگاروں کے خیالات کا ذکر کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں وہ صاف گوئی سے کام لیتے تھے اور بعد کے انگریز ماہرین کی طرح ریاکاری سے اپنی راستبازی اور پارسائی کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔

جوسٹن میکارتھی کا بیان ہے: "حقیقت یہ تھی کہ ہندوستانی جزیرہ نما کے شمالی اور شمال مغربی صوبوں کے بیشتر حصے میں برطانوی اقتدار کے خلاف دیسی قوموں کی بغاوت پھیلی ہوئی تھی۔ اس میں صرف سپاہی ہی نہیں شامل تھے۔ کسی بھی لحاظ سے یہ محض فوجی غدر نہ تھا۔ یہ فوجیوں کی شکایات، قومی نفرت، مذہبی تعصب اور ہندوستان پر برطانوی قبضے کے خلاف غم و غصہ کا ملا جلا اظہار تھا۔ اس میں ہندوستانی والیانِ ریاست بھی شامل تھے اور ہندوستانی فوجی بھی۔ مسلمان اور ہندو، عیسائیوں کے خلاف متحد ہونے کے لیے اپنی گذشتہ مذہبی کدورتوں کو بھول گئے۔"

چارلس بال نے لکھا ہے: "بالآخر پانی سر سے گزر گیا اور ہندوستانیوں کی رگ رگ میں نفرت

طرف سے انھیں روکنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے گی۔"[۱۴۰]

پادری کینیڈی نے بیان کیا: "بغاوت نے بیشتر معاملات میں ذاتی مفاد کے خیال کو اور سابق آقا کے ساتھ وفاداری کے خیال کو بالکل مٹا دیا۔ ایسے حالات میں حکومت کا وفادار رہنے کی تہمت ناقابلِ برداشت تھی۔ یہ سبھی جانتے ہیں کہ جو چند سپاہی ہماری ملازمت میں ڈٹے رہے ان کو نہ صرف ان کے ساتھی، بلکہ عام طور پر ان کی ذات کے لوگ بھی برادری سے خارج تصور کرتے ہیں۔ وہ تو یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنے گھروں کو جانے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے کیوں کہ نہ صرف انھیں لعن طعن کی جائے گی اور برادرانہ عنایات سے محروم رکھا جائے گا بلکہ ان کی جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔"[۱۴۱]

اگر سپاہیوں اور دوسرے لوگوں کا جو انگریزوں کی ملازمت میں تھے اس کامیابی کے ساتھ حقہ پانی بند کیا جا سکتا ہے تو کیا یہ اس بات کی قطعی شہادت نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی شورش ماہیت کے اعتبار سے ایک قومی انقلاب اور عوامی بغاوت تھی!

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر آر۔ سی۔ موزمدار لکھتے ہیں کہ "شورش کی ناکامی کا سبب یہ بھی تھا کہ رہنماؤں، سپاہیوں اور عوام کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہیں تھا۔"[۱۴۲]

اب ہم مشہور مثالوں کی بجائے ایسی مثالیں لیں گے جن کے بارے میں لوگوں کو بہت کم معلوم ہے۔ یہ مثالیں بغاوت کے اہم مراکز کی نہیں ہیں بلکہ دور افتادہ علاقوں کی ہیں، نہ ایسے وقت کی ہیں جب بغاوت کی لہر زوروں پر تھی اور بہادری کے جوہر دکھانا آسان تھا بلکہ اس وقت کی ہیں جب بغاوت ٹھنڈی پڑ رہی تھی۔

دہلی اور لکھنؤ کے فتح ہونے کے بعد برطانوی کمانڈر انچیف سر کولن کیمپ بیل نے یہ منصوبہ باندھا کہ تین بڑی افواج اودھ اور دوآب کے باغیوں کو گھیر کر فتح گڑھ کی جانب دھکیل دیں اور پھر انھیں ختم کر دیں۔ جنرل وال پول نے کانپور سے کوچ کیا لیکن باغیوں کے ایک چھوٹے سے دستے نے اُسے اٹاوہ میں رکنے پر مجبور کر دیا۔ "ان کی تعداد قلیل تھی اور وہ دیسی بندوقوں سے مسلح تھے لیکن ناامیدی نے ان کے اندر نئی روح پھونک دی تھی اور وہ نصب العین کی خاطر شہیدوں کی موت مرنے کا تہیہ کیے ہوئے تھے۔ وال پول نے اس مقام کا معائنہ کیا۔ فوج کے قیام کے اعتبار سے اس جگہ کی کوئی اہمیت نہ تھی اور اس پر آسانی سے دھاوا ہو سکتا تھا لیکن باغیوں پر سامنے سے ہلہ بولنے سے قیمتی جانیں تلف ہونے کا خدشہ تھا۔ غالباً اس مقصد کے حصول کے سستے اور آسان طریقے بھی ممکن تھے۔ یہی طریقے پہلے آزمائے گئے۔ دستی بم اندر پھینکے گئے۔ جلتی پیال کے دھوئیں سے

اودھ کی جدوجہد کمالِ عروج پر تھی۔ اس کی بنیاد بہت ہی وسیع اور اس کی جڑیں نہایت گہری تھیں۔ اس کے سامنے ہر چیز خس و خاشاک کی مانند بہ گئی لیکن ماہیت کے اعتبار سے یہ دوسرے مقامات کی جدوجہد سے مختلف نہ تھی۔ فرق صرف شدت کا تھا۔ دشمن، مشکلات، مسائل، شورش کرنے والے اور راہنما وہی تھے۔ ایسے حالات میں اگر ہم یہ کہیں کہ اودھ میں یہ ایک جنگِ آزادی تھی لیکن باقی صوبوں میں نہیں تو اُسے نہ تو عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے اور نہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے۔ اس کے برعکس سائنٹفک طریقہ تحقیق کا تقاضا ہے کہ اگر ۱۸۵۷ء جیسے عبوری دور میں بغاوت کی اصل ماہیت کا مطالعہ کرنا ہے تو اودھ جیسے علاقے میں کرنا چاہیے جو شورش کے معاملے میں بہت آگے تھا۔

بغاوت کی خصوصیت کو پرکھنے کے لیے ایک اور کسوٹی یہ ہے کہ ہم یہ معلوم کریں کہ کتنے لوگ برطانوی سرکار کے وفادار رہے اور ان لوگوں کے بارے میں اکثریت کا کیا رویہ تھا۔

اگر ان ہندوستانی افسروں کی فہرست تیار کی جائے جو بغاوت زدہ ضلعوں میں ملازم تھے اور جو برطانوی حکومت کے وفادار رہے تو ہمیں پتہ چلے گا کہ ان میں سے اکثر باغیوں کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اس کی تصدیق ان اطلاعات سے ہوتی ہے جو ضلع مجسٹریٹوں نے بغاوت کی کیفیت کا جائزہ لیتے ہوئے گورنر جنرل کو بھیجیں۔

ضلع مجسٹریٹ جے۔ ڈبلیو۔ شیرر نے ۲ر جنوری ۱۸۵۹ء کو کانپور کے بارے میں لکھا: "ہندوستانی عملہ کی غداری کا بھی بے شبہ ضلع میں بہت برا اثر پڑا۔ ڈپٹی کلکٹر کی سرکردگی میں سبھی آدمی، [illegible] دشمنوں سے مل گئے اور انھوں نے نئے نظام حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ڈپٹی کلکٹر رام لعل نے نانا صاحب کی حکومت کو منظم کرنے میں بہت سرگرم حصہ لیا۔ جب میں پہلی بار یہاں پہنچا تو میں نے اس غداری کے جرم میں جس نے تمام عملہ کو بگاڑ دیا تھا اس کو موت کی سزا دی۔"۱۰

کمشنر جے۔ ڈبلیو۔ پنکنی نے ۲۰ر نومبر ۱۸۵۸ء کو جھانسی کے متعلق لکھا: "عملہ اور ماتحت دیسی ملازمین کا رویہ عام طور پر برا یا غیر جانب دار تھا۔"۱۱

کمشنر ایف۔ ولیمس نے ۱۵ر نومبر ۱۸۵۸ء کو شمال مغربی صوبجات کی حکومت کے سیکریٹری ولیم میور کی خدمت میں سہارنپور سے متعلق یہ رپورٹ بھیجی: "پولیس نے کامل غفلت اختیار کی اور سارے عرصے میں ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ایسا دکھائی دیتا تھا گویا انھوں نے لوگوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے کہ کوئی ایک دوسرے کے کام میں دخل نہ دے گا۔ اور یہ کہ اگر دیہات کے لوگ پولیس کو تھانوں میں ان کے حال پر چھوڑ دیں اور انھیں تنخواہ لینے دیں تو دیہاتی جو بھی جرم چاہیں کر سکتے ہیں اور پولیس کی

کیے جن پر کوئی بھی قوم فخر کر سکتی ہے اور جنھیں برطانوی مورخوں نے بھی خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

مالیسن نے فیض آباد کے مولوی احمد اللہ کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے:

"مولوی غضب کا آدمی تھا۔ بغاوت کے دوران بحیثیت ایک فوجی سالار کے اس نے اپنی
ت کے کئی ثبوت دیے۔ کوئی بھی دوسرا آدمی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے سر کولن کیمپ بل کو
ن جنگ میں دو بار پسپا کیا۔ اگر محبِ وطن سے مراد وہ شخص ہے جو وطن کی آزادی کے لیے، جسے
نصافی کے ساتھ سلب کر لیا گیا ہو، سازش اور جنگ کرتا ہے تو یقیناً مولوی ایک سچا محبِ وطن ہے
نے کسی کے قتل سے اپنی تلوار کو آلودہ نہیں کیا تھا۔ اس نے کسی کے قتل سے چشم پوشی نہیں کی تھی۔ اس
ان اجنبیوں کے خلاف جنھوں نے اس کے ملک پر قبضہ کر رکھا تھا، میدانِ کارزار میں بڑی جوانمردی اور
ن قدمی کے ساتھ اور باعزت طریقے سے جنگ کی تھی۔ اس کی یاد تمام قوموں کے بہادروں اور سچے لوگوں
زت کی مستحق ہے۔"[19]

جھانسی کی رانی، تانتیا ٹوپے، کنور سنگھ اور بہت سے دوسرے مقامی راہنماؤں کے بارے
خود انگریزوں کی طرف سے شاندار خراجِ تحسین کی کئی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم از سرِ نو ان لوگوں اور راہنماؤں کی عزت کرنا سیکھیں جنھوں نے انگریزوں
ملاف ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت میں اپنا فرض ادا کیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متعلق مارکس کا خیال ہمارے لیے بڑا احساس آفریں ہے۔ ہندوستانی
ے موصول ہوئیں ۱۷ جون تک کی دہلی کی خبروں کی بنیاد پر اس نے "نیویارک ڈیلی ٹریبیون" کے نام
جولائی ۱۸۵۷ء کے ایک بلا دستخط مراسلے کو ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا:

"آہستہ آہستہ ایسے راز فاش ہو جائیں گے جن کی بنا پر خود جان بُل کو اس بات کا یقین ہو جائے
جسے وہ ایک فوجی غدر تصور کرتا ہے وہ درحقیقت ایک قومی بغاوت ہے۔"[20]

ہندوستان کے مورخ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ماہیت کے بارے میں جتنی بھی بحث کریں لیکن ہندوستانی
م تسلیم کر چکے ہیں کہ یہ ہماری قومی تحریک کا سرچشمہ ہے۔ قوم کے دل و دماغ پر ۱۸۵۷ء کی میراث کا اثر
قدر غالب ہے کہ ڈاکٹر آر. سی. موزمدار بھی اپنی تحقیق کو مندرجہ ذیل الفاظ کے ساتھ ختم کرتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی شورش ہندوستان میں برطانوی حکومت کے لیے وسیع پیمانے پر پہلی بڑی اور
راست چنوتی کی حیثیت سے ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گی۔ نصف صدی بعد شروع ہونے والی آزادی
تحریک کو اسی تحریک سے روشنی ملی۔ ۱۸۵۷-۵۸ء کی یاد نے ہماری آزادی کی تحریک کو تقویت دی

محصور باغیوں کا دم گھونٹنے کی کوشش کی گئی لیکن سب کچھ بے سود ثابت ہوا۔ شگافوں میں سے باغی
حملہ آوروں پر متواتر اور مؤثر فیر کرتے رہے اور تین گھنٹے تک انھیں نزدیک نہ پھٹکنے دیا۔ آخر اس جگہ کو
بارود سے اڑا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مقصد کے لیے بورشیر نے انجینئر، سیر شلے کی مدد سے کارتوسوں
کے ساتھ ایک بارودی سرنگ بنائی۔ اس دھماکے نے مدافعت کرنے والوں کو وہ شرفِ شہادت بخشا
جس کی وہ تمنا رکھتے تھے۔ اس سے وہ مکان کے ملبے میں ہی دفن ہو گئے۔"[۱۵]

۲۵ر فروری ۱۸۵۹ء کو زبردست نیپالی اور انگریزی فوجوں نے گھاگرا کو پار کیا اور عنبر پور کی طرف
کوچ کیا۔ راستے میں ایک گھنے جنگل میں ایک مضبوط قلعہ تھا۔ جنگی اعتبار سے اس کی بڑی اہمیت تھی۔ اس
میں صرف ۳۴ باغی مقیم تھے۔ اس پر دھاوا بولا گیا" اس قدر قوت اور عزم کے ساتھ اس کی مدافعت کی
گئی کہ اس پر قابض ہونے سے پہلے حملہ آوروں کے سات جوان ہلاک ہو گئے اور ۴۳ گھائل۔ تمام محافظینِ
قلعہ نے اپنے مورچوں پر ہی جانیں قربان کیں۔"[۱۶]

۱۵ر دسمبر کو کولھاپور میں ایک مقامی شورش شروع ہوئی لیکن اسے دبا دیا گیا۔ جب باغیوں کو
توپوں کے منہ پر رکھ کر اُڑایا جا رہا تھا تو برطانوی افسر جیکب نے انھیں جان بخشی کی پیش کش کی بشرطیکہ
وہ اپنے ساتھیوں کے نام بتا دیں۔ وہ ناکام رہا۔ بعد میں اس نے اپنے تجربات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا:
"لیکن یہ بیان کرنا دشوار ہے کہ کس قدر حیرت انگیز رازداری کے ساتھ سازش عمل میں لائی گئی۔
دوراندیشی کے ساتھ تدبیریں کی گئیں اور کتنی احتیاط کے ساتھ سازش کرنے والوں کے ہر گروہ نے جدا جدا
کام کیا۔ سازش کی مختلف کڑیوں کو پوشیدہ رکھا گیا اور متعلقہ لوگوں کو صرف ضروری ہدایات کی اطلاع بہم
پہنچائی جاتی رہی۔ اور پھر جس وفاداری کے ساتھ انھوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا وہ بھی کم قابلِ تعریف
نہیں ہے۔"[۱۷]

جب انگریزوں نے لکھنؤ کو تباہ و برباد کیا تو بعض بیگمات ان کے ہاتھوں گرفتار ہوئیں۔ کپتان نے
ان خواتین سے پوچھا "کیا تم اب بھی یہ نہیں سمجھتیں کہ جدوجہد ختم ہو چکی ہے؟" انھوں نے جواب دیا: "نہیں
بلکہ ہمیں یقین ہے کہ آخر میں تمھیں شکست ہوگی۔"[۱۸] شکستِ فاش کے بعد بھی اس قدر خود اعتمادی اس
انقلابی روح کی علامت تھی جسے قومی بغاوت نے بیدار کیا تھا۔

جب بغاوت کی راہنمائی کا سوال اٹھتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر موزمدار کے سر پر انگریز زمیندار
اور جاگیردار باغی راہنماؤں کے درمیان ناپاک معاہدوں کا ایسا بھوت سوار ہے کہ وہ بلا امتیاز تمام باغی
راہنماؤں کو ملامت کرتے ہیں۔ وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ بغاوت نے بعض ایسے بڑے راہنما

نا اقتدار قائم رکھنے کی تدبیر کی۔ مختلف نسلوں، قبیلوں، ذاتوں، مذہبوں اور مطلق العنان ریاستوں کا مجموعہ
جغرافیائی وحدت کے اعتبار سے ہندوستان کہلاتا ہے۔ اس کے ان مختلف اجزا کا باہمی اختلاف ہی
طانوی اقتدارِ اعلیٰ کی اصلی بنیاد بنی رہی۔ بعد میں اقتدارِ اعلیٰ کے حالات میں تبدیلی ہوئی ہے۔ سندھ
ر پنجاب کی فتح کے ساتھ انگریزوں کی ہندوستانی سلطنت نہ صرف قدرتی حدود تک پہنچ چکی تھی، بلکہ
د مختار دیسی ریاستوں کے آخری آثار بھی مٹائے جا چکے تھے۔

"اب یہ ایک حصے کی مدد سے دوسرے حصے پر حملہ نہ کرتی تھی بلکہ یہ سب کے سر پر سوار تھی
سارا ہندوستان اس کے قدموں پر تھا۔ فتح کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب یہ فاتح بن چکی تھی۔"[۲۳]

ایک اور مقالے میں مارکس نے ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کو یورپی استبدادیت قرار
جو ایشیائی استبدادیت پر مسلط تھی۔"[۲۴]

دیسی ریاستوں سے متعلق ایک اور مضمون میں مارکس پھر پُر مغز اور معنی خیز الفاظ میں اس
رتِ حال کا تجزیہ کرتا ہے جس نے انگریزوں کو ہندوستان پر فتح حاصل کرنے کے قابل بنایا اور
بالآخر ان کی حکومت کے خلاف بغاوت کا موجب بنی۔

"جب ناخواندہ برطانوی مہمانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر ایک بار قدم رکھ دیے اور
پر قبضہ جمانے کی ٹھان لی تو اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ والیانِ ریاست کے اقتدار کو جبر سے
زش کے ذریعے زائل کیا جائے۔ والیانِ ریاست کے سلسلے میں انگریزوں کو اس قسم کے حالات کا
نا تھا جیسے قدیم رومیوں کو ان کے اتحادیوں کے سلسلے میں تھا اس لیے وہ رومی سیاست دانوں
ش قدم پر چلے۔ ایک انگریز مصنف کے قول کے مطابق "حریفوں کو کھلا پلا کر تن و مند کرنے کا
تھا۔ جس طرح بیلوں کو پال پوس ... کرتے ہیں یہاں تک کہ وہ ذبح کیے جانے کے قابل ہو جاتے
قدیم روم کے طریقے سے ان کی رفاقت حاصل کر لینے کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی نے چینج ایلے
Alley ... Change) کے جدید ڈھنگ سے ان کا کام تمام کر دیا۔

"ان معاہدوں کو پورا کرنے کے لیے جو والیانِ ریاست نے کمپنی کے ساتھ کیے تھے انھیں انگریزوں
بھاری سود پر بڑی بڑی رقمیں قرض لینی پڑتیں۔ جب پریشانی انتہا تک پہنچ جاتی تو قرض خواہ
ہو جاتے،' پیچ کس دیا جاتا'، اور والیانِ ریاست اس بات پر مجبور ہو جاتے کہ یا تو وہ اپنے علاقے
طرح سے کمپنی کے حوالے کر دیں یا جنگ شروع کر دیں۔ پہلی صورت میں وہ اپنے غاصبین کے
خوار بن کر رہ جاتے اور دوسری صورت میں غداروں کی حیثیت سے گدی سے اتار دیے۔"

اس کے مجاہدین کے دلوں میں ہمت کی روح پھونکی، خوفناک جدوجہد کے لیے ایک تاریخی بنیاد ڈالی
اور اُسے ایک ایسا اخلاقی محرک عطا کیا جس کی وقعت میں مبالغہ کرنا ممکن نہیں۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی جد
نے، جس کی عظمت غلط بیانیوں کے باوجود بڑھتی گئی، ہندوستان میں برطانوی حکومت کے مفاد کو جتنا
پہنچایا اتنا خود بغاوت سے بھی نہ پہنچا ہوگا۔"[21]

یہ مسئلہ کہ آیا ۱۸۵۷-۵۹ء کی جدوجہد ایک فوجی شورش تھی یا قومی بغاوت، اس طرح سلجھ
ہے کہ اس جدوجہد سے وابستہ سیاسی، معاشی اور نظریاتی مسائل کی ماہیت اور حریفوں کے کردار کو
کے ساتھ پیش کیا جائے اور خلوصِ دل کے ساتھ ان کا تجزیہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ ایک معقول تاریخی جائزہ
کا تقاضا ہے کہ یہ صحیح طور پر بیان کیا جائے کہ کون کس کے ساتھ اور کس لیے لڑ رہا تھا۔ اس مقالے
کوشش کی گئی ہے کہ مذکورہ بالا طریقے سے اس بحث طلب مسئلے کی تحقیق کی جائے۔

۲۔ فرنگی راج کے خلاف

ایسٹ انڈیا کمپنی کی فتح ہند کی داستان ساری دنیا میں مشہور ہے۔ مارکس نے اسے ۱۸۵۳
میں ان معنی خیز الفاظ میں مختصراً بیان کیا:

ہندوستان میں انگریزوں کا اقتدار کس طرح قائم ہوا؟ مغلِ اعظم کے اقتدار کو مغل صو
نے، صوبیداروں کی قوت کو مرہٹوں نے اور مرہٹوں کی طاقت کو افغانوں نے نقصان پہنچایا اور
یہ سب ایک دوسرے کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھے تو انگریز بیچ میں آ دھمکے اور سب کو مغلوب
لیا۔ یہ ایک ملک ہے جہاں نہ صرف ہندو اور مسلمان ہیں بلکہ قبیلے قبیلے اور ذات ذات میں تفرقہ
یہ ایک سماج ہے جس کے ڈھانچے کی بنیاد ایک قسم کے توازن پر ہے جو اس کے افراد کے مابین منافر
اور آئینی علیحدگی کا نتیجہ ہے۔ ایسے ملک اور ایسے سماج کو بہرحال محکومی کا شکار ہونا تھا۔ اگر ہم ہندوستا
کی گذشتہ تاریخ سے ناواقف بھی ہوں تو کیا اس بیّن اور ناقابلِ تردید حقیقت سے انکار کر سکتے
کہ اس وقت بھی ہندوستان کو ہندوستانی ہی فوج کی مدد سے جو ہندوستان ہی کی دولت پر پلتی
انگریزوں کی غلامی کے چنگل میں جکڑ کر رکھا گیا ہے۔ ایسی صورت میں ہندوستان محکوم ہونے
بچ سکتا تھا۔"[22]

عظیم بغاوت شروع ہونے کے بعد ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء کو "دی نیویارک ڈیلی ٹریبیون"
مارکس نے اپنے ایک بلا دستخط مقالے میں یوں لکھا: "برطانیہ نے ڈیڑھ سو سال تک سلطنت

ہے۔ بغاوتِ ہند کے قدامت پسند برطانوی مورخ مالیسن کا بیان ہے: "الحاقِ اودھ کے لیے خواہ کوئی بھی جواز پیش کیا جائے یہ حقیقت ناقابلِ تردید ہے کہ جس طریقے سے اس پالیسی پر عمل کیا گیا اس کے پیشِ نظر یہ پالیسی نہ صرف مصالحت پیدا کرنے میں ناکام رہی بلکہ ہندوستان کا ہر طبقہ انگریزوں سے بیزار ہوگیا۔"[۲۸]

گبنس نے جو اس وقت لکھنؤ میں کمشنر مالیات تھا بعد میں اس علاقے میں قومی بغاوت کی رپورٹ تیار کی اور ان ہندوستانیوں کے بیانات قلمبند کیے جن کی اس کے ساتھ راہ و رسم تھی۔ ان میں سے ایک بیان میں یہ کہا گیا: "اسی طرح ہندوستان کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ ملکِ اودھ بادشاہ کا ہے۔ حکومت اس نے اچھے ڈھنگ سے کی ہو یا بُرے ڈھنگ سے لیکن اس نے کسی طرح بھی انگریزوں کے ساتھ وفاداری کا پیمان نہیں توڑا اور نہ ہی اس میں کوئی رخنہ ڈالا۔ اگر برطانوی سرکار اس بادشاہ کو تخت سے معزول کرسکتی ہے جو ہمیشہ اس کا وفادار رہا تو پھر کون سا خود مختار نواب یا راجہ محفوظ ہے؟"[۲۹]

زیادہ دور اندیش اینگلو انڈین سیاستدانوں نے برطانیہ کی اس جارحانہ اور ... تباہ کن پالیسی کے انقلابی نتائج کو صاف طور پر بھانپ لیا۔ مثال کے طور پر سر جان میلکم نے بہت پہلے متنبہ کر دیا تھا کہ "سرداروں کے موروثی حقوق اور ان کے پیرووں کی وفاداری سب کا خاتمہ ہوگیا ہے وہ رابطے اور تعلقات جو پہلے مجلسی امن و امان کی مضبوط ترین کڑیاں تھے چوٹیں کھا کر ٹوٹ گئے ہیں اور بے اطمینانی اور بغاوت کے عناصر میں بدل گئے ہیں۔"[۳۰]

کمپنی کی سرکار نہ صرف سیاسی جبر کی حکومت تھی ... لی امتیاز کا نمونہ تھی جو ہر ہندوستانی کی آنکھ میں خار بن کر کھٹکتی تھی اور بار ... یت تھی ... حکومت کا شروع ہی سے یہ خاصہ تھا اور اس نے ناگزیر نتائج پیدا کیے۔ شور جو ہندوستان ... پنی کے اقتدار کے قیام کے آغاز میں لکھا کرتا تھا اس کا بیان ہے کہ: "ہندوستانیوں کی ناپاک اور ذلیل کافروں سے زیادہ وقعت نہیں۔"[۳۱]

۱۷۸۰ء میں "سیر المتاخرین" کے مصنف نے تلخی کے ساتھ یہ قلمبند کیا کہ "انگریز شاذ و نادر ہی یہاں اگر ہم میں سے کسی کے ساتھ ملتے ہیں۔"[۳۲] "سیر المتاخرین" کے فرانسیسی مترجم نے لکھا کہ "ہندوستان میں ہر انگریز میں یہ رجحان نظر آتا ہے کہ وہ ہندوستانیوں کی ساری قوم کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں گویا یہ ایک بے جان شے ہے جسے بلا تامل اور حسب مرضی کام میں لایا جاسکتا ہے۔"[۳۳] ہندوستانیوں نے ان تمام ذلتوں کو گوارا کیا جو ایسے نسلی امتیاز کے رویے سے پیدا ہوتی ہیں۔

جاتے ۔ اس وقت ہندوستانی ریاستوں کا رقبہ ۶۹۹۹۶۱ مربع میل تھا اور آبادی ۶۳
تھی ۔ البتہ اب وہ برطانوی حکومت کے حلیف نہیں تھے بلکہ کئی قسم کی شرائط پر اور کئی طرح کے
اور حفاظتی نظام کے تحت اس کے متوسل تھے ۔ ان معاہدوں کی ایک مشترک بات یہ تھی کہ
ریاستیں دفاع، سفارتی تعلقات اور گورنر جنرل کی مداخلت کے بغیر اپنے باہمی تنازعوں
حق سے دست بردار ہو گئیں ۔

• جن شرائط کے تحت ان کی نام نہاد آزادی قائم ہے وہی ان کے مستقل
ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ان میں اصلاح کی اہلیت نہیں ہے ۔ عضوی ضعف ان کی
سرشت ہے جیسا کہ ہر اس وجود کے ساتھ ہوتا ہے جو دوسروں کے رحم و کرم پر جیتا
معاہدوں سے پیدا ہوئی برائیوں کی یہ صحیح عکاسی ہے ۔ جب ہم ماضی کی طرف دیکھتے ہیں
واضح ہو جاتی ہے کہ موجودہ صدی کے ابتدائی بیس تیس برسوں میں ہندوستان کے
پہنچے مارکس نے ان کے خدوخال کی واضح نشاندہی اس وقت کر دی تھی جب
رونما ہو رہے تھے ۔

ہم عصر برطانوی مصنفین میں جو زیادہ دور اندیش تھے انھوں نے بھی اس
دیکھ لی تھی جس کا تجزیہ مارکس نے اتنی وضاحت سے کیا ۔ مثلاً ولیم ہووٹ نے لکھا :

"ہندوستانی والیانِ ریاست کو ان کے علاقوں سے محروم کرنے کا جو طریقہ
زیادہ سے برتا جا رہا ہے اور وہ بھی حق اور مصلحت کی مقدس ترین دلائل کے ساتھ
ایسا نظام ہے جو روحانی ایذا رسانی سے زیادہ خوشنما اور شاندار ہے جس کی کوئی نظیر
اور پھر بقول گرانٹ ڈف : "ان کے پایہ تخت میں برطانوی ریذیڈنٹ کو
کی بربادی کا سبب تھا کیوں کہ ان افسروں کا ایک فرض تفرقہ پیدا کرنا تھا ۔"[۲۷]

ڈلہوزی کے عہدِ حکومت کے ساتھ بے اصول الحاق اور اونچے سے او
والیانِ ریاست کے وظیفوں میں تخفیف کی نئی جارحانہ پالیسی کا آغاز ہوا جس کی وجہ
میں ایک اضطراب کی لہر دوڑ گئی ۔ حقائق سے سبھی واقف ہیں ۔ الحاقِ اودھ کی مثال اس
بالخصوص اس ہلچل کو ظاہر کرتی ہے جو برطانیہ کی ناقابلِ تسکین جارحیت اور بے اصو
پالیسی نے سارے ملک میں پیدا کر دی تھی ۔

الحاق کی پالیسی کی ماہیت اور اس کے نتائج کو دیکھنے کے لیے اودھ کو

طبقے کا خاتمہ ہے۔ اِس نے اُس طبقے کو کلیتاً نیست و نابود کر دیا ہے۔ (سوال نمبر ۱۴۳) اس وقت وہ قدرتی طور پر اس سے غیر مطمئن ہیں۔ یہ آزردگی اس لیے نہیں ہے کہ یہ ایک غیر ملکی حکومت ہے بلکہ اس لیے کہ یہ ایسی حکومت ہے جس کے ساتھ ان کا کوئی مفاد وابستہ نہیں اور جس سے انھیں کسی چیز کی امید یا توقع نہیں ہے۔"[۴۷]

بغاوت کے دوران سر سید احمد خاں نے انگریزوں کی خدمت انجام دی اور اس کے فرو ہو جانے کے بعد اپنی مشہور کتاب The causes of the Indian Revolt (اسباب بغاوت ہند) لکھی جس میں انھوں نے لکھا: "ہندوستان کے باشندوں بالخصوص مسلمانوں کی بے اطمینانی کا ایک اور سبب ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں سے محروم رکھنا تھا۔ ابھی چند ہی سال ہوئے مسلمان اپنی حکومت کے تحت جلیل القدر عہدوں پر سرفراز تھے اور ان کی تمنا اور امید اب بھی ان کے دلوں میں باقی ہے۔ برطانوی حکومت کے تحت دنیا کی نگاہ میں وہ اپنی عزت بڑھانے کے آرزومند تھے لیکن ان کے لیے کوئی راستہ کھلا نہ تھا۔ اس حکومت کے ابتدائی ایام میں بے شک بلند رتبہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے کے لیے چنا گیا لیکن آہستہ آہستہ یہ دستور جاتا رہا۔"[۴۸]

چنانچہ اعلیٰ سرکاری ملازمتوں سے ہندوستانیوں کو محروم رکھنا ایک ہندوستان دشمن پالیسی تھی اور اس کے خلاف ہندوستان کے اعلیٰ طبقوں کی جائز بیزاری ایک اہم قومی عنصر تھا جو انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں کی بغاوت کا سبب تھا۔

اس پر طرہ یہ کہ جہاں تک ہندوستانی عوام کا تعلق ہے انھوں نے برطانوی نظام حکومت کو بدعنوانیوں میں مبتلا پایا کیوں کہ یہ غیر ملکی تھا۔

پرچرڈ "ہماری عدالتوں کی رشوت خوری اور ضمیر فروشی" کا شکوہ کرتا ہے اور اس نکتہ چینی میں وہ تنہا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کا قانونی ضابطہ جاہل کسان کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ مقدمہ کے لیے وہ وکیل نہ کر سکتا تھا۔ قدیم دستور کے مطابق "عدالت کے دروازے سب پر کھلے تھے اور غریب سے غریب کسان بھی اپنا دعویٰ بلا روک ٹوک پیش کر سکتا تھا۔" امیروں اور عیاروں کے ہاتھ میں عدالتیں جبر و ستم کا آلۂ کار بن گئیں۔ جھوٹا دعویٰ کرنے کے لیے جھوٹے گواہوں کو خریدا جا سکتا تھا اور جعلی دستاویزات تیار کی جا سکتی تھیں۔ صدر عدالت آگرہ کے ایک جج ریکس کا بیان ہے کہ "شمال مغربی صوبہ کے لوگ ہمارے ضابطہ دیوانی کو پسند نہیں کرتے" اور پسند نہ کرنے کی معقول وجہ ہے۔[۴۹] برطانوی حکمرانوں نے پنچایت کی قسم کے مقامی اداروں کو تمام انتظامی معاملات کے دائرے سے خارج کر دیا۔

اور بالآخر انھوں نے نسلی امتیاز پر مبنی غیر ملکی حکومت کے خلاف اپنی جدوجہد شروع کی۔" دی لندن ٹائمز" نے رسل کو نامہ نگار کی حیثیت سے بغاوت کی خبریں فراہم کرنے کے لیے بھیجا۔ بنارس کو جاتے ہوئے راستے میں اس نے دیکھا کہ "کسی بھی حالت میں کسی گورے کی گاڑی پر دوستانہ نگاہ نہیں ڈالی جاتی۔" آنکھ کی زبان پر کون شبہ کر سکتا ہے اور کس کو غلط فہمی ہو سکتی ہے؟ میں نے صرف اسی سے سمجھ لیا ہے کہ بعض اوقات بہت سے لوگ ہماری قوم سے ڈرتے بھی نہیں ہیں اور نفرت تو سب ہی کرتے ہیں۔"[۴۴]

استبداد اور نسلی امتیاز پر مبنی برطانوی حکومت کا ایک اور براہِ راست نتیجہ ہندوستان کے باشندوں کو ذمہ داری کے تمام اعلیٰ عہدوں سے محروم کرنا تھا۔

نظامِ حکومت میں ہندوستانیوں کے تقرر کی حمایت کرتے ہوئے سر تھامس منرو نے ۱۸۱۸ء میں لکھا، "غیر ملکی فاتحین نے ہندوستان کے اصلی باشندوں پر تشدد روا رکھا تھا اور اکثر جور و ستم ڈھایا تھا لیکن کسی نے ان کے ساتھ ایسا حقارت آمیز سلوک نہیں کیا تھا جیسا ہم نے کیا ہے۔ کسی نے تمام لوگوں کو یہ کہہ کر رسوا نہیں کیا تھا کہ یہ اعتماد کے قابل نہیں ہیں، دیانتداری سے عاری ہیں اور صرف اس لائق ہیں کہ انھیں وہاں کام پر لگایا جائے جہاں ان کے بغیر چارہ نہ ہو۔ ایک قوم جو ہماری محکوم ہو گئی ہے اس کی تذلیل میری نگاہ میں نہ صرف کم ظرفی ہے بلکہ ناعاقبت اندیشی بھی۔"[۴۵]

بمبئی کونسل کے ایک رکن کی روداد میں مایوسی اور بے اطمینانی کی لہر کو اور بھی زیادہ سنجیدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: "متعدد ممتاز دیسی افسر جو پرانے نظام کے درہم برہم ہونے سے بیکار ہو گئے ہیں سازشوں اور شکایتوں سے بے اطمینانی کے جذبے کو زیادہ شدت کے ساتھ قائم رکھنے اور وسیع تر علاقے میں پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔"[۴۶]

حکمران برطانوی طبقے کے زیادہ دانش مند لوگوں نے پہلے ہی اس صورتِ حال کے خطرے کو صاف صاف بھانپ لیا تھا۔ مثال کے طور پر ہم کچھ سوالات اور ان کے جوابات پیش کرتے ہیں جو پارلیمنٹری کمیٹی منعقدہ ۱۸۳۲ء کے سامنے کیے گئے۔

سوال نمبر ۱۳۸، صدر: کیا تم سمجھتے ہو کہ ہندوستان میں ہماری حیثیت کو کوئی مستقل خطرہ درپیش ہے؟

ہنری رسل: بارود خانہ بھرا ہے۔ اگرچہ فی الحال کسی چنگاری کے گرنے کی توقع نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۴۰، ہندوستان میں ہماری داخلی حکومت کی سب سے بڑی شرارت ہندوستانیوں کے معزز

اس واقعہ کی انقلابی اہمیت کو ہر جگہ تسلیم کیا گیا ہے۔ چارلس بال نے اس کی کیفیت کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے: "میرٹھ کے سپاہیوں نے فی الفور ایک قائد، ایک علم اور ایک نصب العین پالیا۔ غدر کو ایک انقلابی جنگ میں بدل دیا گیا۔" ۴۴

بہادر شاہ ایک سست طبع اور خستہ حال ضعیف تھے لیکن اس تاریخی جدو جہد میں اس سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ دہلی کے عظیم مغل خاندان کے مطلق العنان شہنشاہوں کے طویل اور غیر منقطع سلسلے کے حقدار وارث کی حیثیت سے بہادر شاہ کو ہندوستان کے روایتی خود مختار فرماں روا کے طور پر ہندوستان کے سیاسی نظام میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔ انگریزوں نے صورتِ حال کو اسی وقت سے سمجھا اور اس سے فائدہ اٹھایا جب لارڈ لیک نے ۱۵ ستمبر ۱۸۰۳ء کے دن دریائے جمنا کو پار کیا اور برطانوی فوجیں پہلی بار شہر دہلی میں داخل ہوئیں۔ اسی وقت یہ فیصلہ کیا گیا کہ مغل بادشاہ کو اسی وقار کے ساتھ برقرار رکھا جائے جو اسے حاصل ہے۔

دہلی میں برطانوی افسر مٹکاف کا بیان ہے: "اس پالیسی کو بہتر تصور کیا گیا کہ شہر میں دو عملی کو گوارا کیا جائے اور مغل خاندان کے نام نہاد وقار کو برقرار رکھا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ بادشاہ کی معزولی سے ہندوستان کے مسلمانوں کی ساری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔ یہ بات کند ترین ذہن پر بھی روشن تھی کہ دہلی میں حقیقی اقتدار نئی قوت کے ہاتھ میں تھا اگرچہ بظاہر لوگوں کی نگاہ میں بادشاہ ہی ہندوستان کا فرماں روا تھا۔ جب تک قدیم خاندان کا سایہ باقی ہے یہ عزت وجاہ کا سرچشمہ رہے گا اور صرف اسی کا حکم قابلِ احترام ہوگا۔ شہزادے اب بھی اسی خطاب سے سرفراز تھے جو بادشاہ نے انھیں عطا کیا تھا۔ ہر قسم کے مروجہ سکے موجودہ بادشاہ کے نام سے ہی جاری ہوتے رہے۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں کی گدی کے وارثوں کی منظوری کے لیے درخواست اب بھی اسی کی خدمت میں پیش کی جاتی اور جب وقتاً فوقتاً یہ درخواستیں رد ہو جاتیں تو ریزیڈنٹ کی خدمت میں اپیلیں بھیجی جاتیں تاکہ وہ مغل بادشاہ پر اپنا اثر ورسوخ ڈال کر اپنے سائلوں کی درخواستیں منظور کرائے۔ جب خطرناک فسادات بپا ہوتے، جیسا کہ بعد میں ہوئے تو برطانوی حکام سے پناہ کے لیے وہ بادشاہ کی طرف رجوع کرتے۔

"بادشاہ ہر توہین گوارا کرتا رہا اور آہستہ آہستہ اس نے از سرِ نو اقتدارِ اعلیٰ حاصل کر لیا۔ اس لیے گو ہندوستانیوں نے اپنے شہنشاہ کے لیے ایک ذلیل بادشاہ کا درجہ قبول کیا لیکن یہ امکان ہمیشہ موجود تھا کہ وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار دوبارہ حاصل کرے گا۔ اس لیے وہ انتظار کرنے پر قانع تھے جب

امن برقرار رکھنے، اپنے حقوق کی حفاظت کرنے اور حکومت کے تئیں اپنے فرائض انجام دینے کے لیے یہ روایتی انتظامی ادارے تھے۔ انگریزوں نے ایک الگ بھاڑے کے سپاہیوں کا پولیس محکمہ ان پر مسلط کر دیا۔

یہ مظاہرہ اسی نظام کے خلاف تھا کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کے لوگوں نے جب بھی ان کو موقع مل سکا، تھانے، کچہری، خزانے وغیرہ کو تباہ کر کے اپنی نفرت کا اظہار کیا۔

اگر اس بات کو ذہن میں رکھا جائے کہ انگریزی نظام ہندوستانی روایت کے منافی اور ہندوستانیوں کے مفاد کے لیے مضر تھا اور خود ہندوستانی اسے خصومت کی نگاہ سے دیکھتے تھے تو یہ نفرت آسانی کے ساتھ سمجھ میں آجاتی ہے۔ ہم عصر برطانوی افسر اس سے واقف تھے اور ان میں جو زیادہ سنجیدہ مزاج تھے وہ اس کیفیت پر پریشان تھے۔ انھوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے اندر یہ معاملہ اٹھایا۔ رسل نے بڑی صاف گوئی سے کام لیا جب اس نے کہا: "یہ نظام بنیادی طور پر انگریزی ہے، اس میں ہندوستانیت کا شائبہ بھی نہیں۔ نہ یہ ملک کے پرانے دستور کے ساتھ کوئی مطابقت رکھتا ہے اور نہ اس کے باشندوں کے خیالات و عادات کے ساتھ۔ ہندوستان کے لوگوں کو ہمارے نظام پر کوئی اعتماد نہیں۔ ہماری حکومت کو ان کے خیالات کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں۔ اگر دوسری ریاستوں کے لوگ جنھیں یہ فوائد حاصل نہیں ہماری حکومت میں منتقل ہو جائیں تو وہ اسے عظیم ترین مصیبت خیال کریں گے جو ان پر نازل ہو سکتی ہے۔"[۴۰] سر جان ملکم اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ ملک کے تمام طبقوں نے "سوائے ایک ایسے نظام کے کچھ نہ دیکھا جو اُن کے فوری زوال اور بالآخر تباہی کا سبب تھا۔"[۴۱] اس سے بہت پہلے شور نے صورتِ حال کو ان معنی خیز کلمات میں بیان کیا تھا "ہماری سلطنت ریت کے ایک جزیرے کی مانند ہے جسے کسی سیلاب نے اُبھارا ہو۔ نہ تو کوئی بند باندھے گئے ہیں اور نہ ہی کوئی درخت لگائے گئے ہیں جن کی جڑیں نیچے پھیل کر ایک دوسری کو جکڑ دیں۔"[۴۲] دیسی ریاستوں کو نیست و نابود کرنے والی ڈلہوزی کی حکومت کے دوران کرنل لو نے اپنی سرکاری یادداشتوں میں لکھا: "ہندوستان کے باشندے ہر لحاظ سے دنیا کے تمام باشندوں کی مانند ہیں۔ وہ اپنی عادات و رسوم کو غیر ملکیوں کی عادات و رسوم کی نسبت زیادہ پسند کرتے ہیں۔"[۴۳]

یہ میرٹھ کے باغی سپاہیوں کی عقلِ سلیم کا کرشمہ تھا کہ انھوں نے دریائے جمنا کو پار کیا، ہمارے قدیم ملک کے روایتی دارالسلطنت کو برطانوی غلامی کے جوئے سے آزاد کیا اور اکبر کے محروم وارث بہادر شاہ کے سر پر شہنشاہِ ہندوستان کا تاج رکھا۔

سوال کا فیصلہ ہوا۔"۴۶

"ریڈ پیمفلٹ" (Red Pamphlet) کا مصنف رقمطراز ہے: "تمام اودھ ہمارے خلاف آمادۂ پیکار تھا۔ نہ صرف باقاعدہ فوجیں بلکہ سابق بادشاہ کی فوج کے ساٹھ ہزار جوان، زمیندار اور ان کے نوکر چاکر اور دو سو پچاس قلعے جن میں سے بیشتر میں توپیں نصب تھیں، ہمارے خلاف سرگرم کار تھے۔ انھوں نے کمپنی کے راج کے مقابلے میں اپنے بادشاہ کی خود مختار متوازی حکومت قائم کر دی ہے اور اتفاقِ رائے سے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔ اُن پنشن خواروں نے بھی جو فوج میں ملازم رہے تھے ہماری مخالفت کا اعلان کر دیا ہے اور ان کا ایک ایک آدمی بغاوت میں شریک ہو گیا ہے۔"۴۷

چنانچہ اودھ میں انگریزوں کو جس چیز کا سامنا تھا وہ نہ صرف ایک مسلح، منظم اور عوامی بغاوت تھی بلکہ ایک علاقائی حکومت تھی جس کی بنیاد قدیم خاندان کی بحالی پر تھی اور جسے لوگوں نے مسلح سپاہیوں کی سرکردگی میں دیدہ دانستہ غیر ملکی کمپنی کی ظالمانہ سرکار کے مقابلے پر قائم کیا تھا۔

غیر ملکی مضرت رساں فرنگی راج سے ہمارے اجداد کی نفرت حبّ وطن کے جذبے کا اظہار تھی یہ آزاد اور خود مختار ہونے کے قومی عزم کا اظہار تھا کہ انھوں نے ۵۸-۱۸۵۷ء کے انقلابی جہاد میں جان جوکھم میں ڈال کر "فرنگی شیطان" کے ساتھ جنگ کی۔ یہ خود مختار قومی حکومت قائم کرنے کی عوامی خواہش کا اظہار تھا کہ انھوں نے معزول شدہ شہنشاہوں اور بادشاہوں کو ان کی پرانی گدیوں پر بحال کرنے کی کوشش کی۔ چونکہ اس وقت قومی بیداری محدود تھی اس لیے ہمارے باغی بزرگوں نے ماضی کی طرف نگاہ دوڑائی اور مغل بادشاہ، مرہٹہ پیشوا اور نواب اودھ کو حکمرانوں کی حیثیت سے بحال کیا لیکن یہ سمجھنا قطعاً غلط ہے کہ وہ پس ماندہ اور رجعت پسند تھے۔ اس وقت کے حالات میں وراثت سے محروم بادشاہوں، پیشواؤں اور نوابوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کے ذریعے ہی سے برطانوی غلبے کے خلاف وسیع ترین قومی اتحاد پیدا کیا جا سکتا تھا۔ کسی اور باب میں ہم یہ ثابت کریں گے کہ نئی زندگی پانے والے ہندوستانی عوام ہندوستان میں انگریزوں سے پہلے کی جاگیردارانہ شخصی حکومت کو بحال نہیں کر رہے تھے بلکہ بہادر شاہ، نانا یا نواب اودھ کے تحت انقلابی حکومتوں پر ایک نئی جمہوری مہر ثبت کر رہے تھے۔ غیر ملکی فرماں رواؤں پر اپنے حکمرانوں کو ترجیح دینا اور اپنے حکمرانوں کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کے ساتھ اپنے ڈھنگ سے اور اپنی قوت کے مطابق نپٹنے کی ہمت اور جسارت رکھنا ایک صحت مند قومی جذبہ تھا۔ ہو بہو یہی کام تھا جو ۱۸۵۷ء کے ہندوستانی باغی راہنماؤں نے کیا۔ البتہ وہ ایسے تصورات اور

یہ معلوم ہوا کہ انگریزوں کا ارادہ حقِ وراثت کو ختم کرنے اور شاہی کنبوں کو اِدھر اُدھر منتشر کرنے کا ہے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔

"انگریز ایک ایسے آتش فشاں پہاڑ پر ٹکے ہوئے تھے جو کسی بھی لمحہ ہلاکت خیزی کے ساتھ پھٹنے کو تیار تھا"[۴۵]

انیسویں صدی کے نصف اوّل میں مغل خاندان اب بھی ہندوستان کی خود مختار فرماں روائی کی علامت تھی۔ انگریز غاصبوں نے مغل بادشاہ کو اپنی حکومت کی آڑ کے طور پر نام نہاد بادشاہِ ہند کی حیثیت میں برقرار رکھا تھا۔ باغی سپاہیوں نے مطلب براری کے برطانوی ڈھنگ اور مغل بادشاہی کی برقراری کے انگریزی حربے کو انھیں کے خلاف استعمال کیا۔ پہلا کام جو انھوں نے کیا کہ انگریزوں کو اس روایتی نشان سے محروم کر دیا اور اسے انگریزوں کے خلاف جنگ کے مقصد کی تکمیل کی غرض سے خود استعمال کیا اور اس کے آزاد ہندوستان کے تاجدار ہونے کا اعلان کیا۔

آزاد دہلی روایتی مغل بادشاہ کے تحت ایک خود مختار ریاست کی علامت بن گئی۔ اگرچہ بعض بلند پایہ ہندوستانی مورخ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ برطانوی حکمرانوں نے اسی واقعہ کو اس صورتِ حال کا انتہائی خطرناک پہلو سمجھا۔

ہندوستان کے قدیم پایہ تخت میں یہ نئی صورتِ حال ہی یکے بعد دیگرے آنے والے تمام برطانوی سپہ سالاروں کے نام کیننگ کے ان تاکیدی احکام کا سبب تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو دہلی پر فیصلہ کن حملے کی تدبیر کی جائے۔ یہی سبب تھا کہ لارنس دہلی کو فتح کرنے کے لیے پنجاب سے تمام فوجوں، بہترین سپہ سالاروں اور افسروں کو نکال لایا۔ ایلگن کی اس رضا مندی کی بھی یہی وجہ تھی کہ تائی پنگز کے خلاف برطانوی جنگ کے لیے جو برطانوی فوجیں مخصوص تھیں ان تمام کو کیننگ کے حوالے کر دیا جائے اور وہ خود کلکتے چلا آئے تاکہ برطانوی فوج اور افسروں میں زیادہ اعتماد پیدا ہو۔

لکھنؤ میں بھی ایسا ہی ایک آزاد علاقائی ریاست کا مرکز قائم کیا گیا تھا۔ اس لیے یہ دو مقامات انقلابیوں اور انگریز شہنشاہیت پرستوں کے جنگی منصوبوں میں تدبیرِ جنگ کے اعتبار سے اہم ترین محاذ بن گئے۔ مٹکاف کا بیان ہے کہ "ہندوستان کے ہر اُس گوشے کی جہاں فوجی شورش ہوئی، اپنی مخصوص تاریخ تھی لیکن دہلی اور لکھنؤ سب سے زیادہ توجہ کے مرکز تھے۔ جب متواتر ایک رجمنٹ نے دوسری کے بعد بغاوت کی تو باغی فوجیں آہستہ آہستہ مختلف اطراف سے شمالی ہندوستان کے ان دو مرکزوں میں سے ایک کی جانب بڑھنے لگیں۔ فی الواقع دہلی میں ہی برطانوی اقتدارِ اعلیٰ کے

پے در پے نازل ہوئیں، وہ کتنی ہی پیچیدہ، اچانک اور تباہ کن رہی ہوں لیکن ان سب کا اثر سطحی تھا۔ انگلستان نے ہندوستان کا سماجی ڈھانچہ یکسر توڑ ڈالا ہے اور ابھی تک از سرِ نو تعمیر کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ پرانی دنیا کے کھونے اور اس کی جگہ نئی دنیا نہ پانے سے ہندوستان کی موجودہ خستہ حالی میں ایک قسم کی افسردگی کا رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ ہندوستان برطانیہ کے زیرِ حکومت اپنی تمام قدیم روایات اور اپنے ماضی کی تمام تاریخ سے محروم ہوگیا ہے۔ یہ برطانوی ناخواندہ مہمان ہی تھا جس نے ہندوستانی دستکاری ختم کی اور چرخہ تباہ کر دیا۔ برطانوی بھاپ اور سائنس نے ہندوستان کی سرزمین پر زراعت اور صنعت کا رشتۂ اتحاد منقطع کر دیا۔" ۴۹

مارکس نے اپنی ایک اور تصنیف میں اس مسئلے کو وسیع تر سطح پر پیش کیا: "چین اور ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کے تعلقات سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ نظام سرمایہ داری سے پہلے کے پیداوار کے قومی طریقوں کی اندرونی استواری اور مضبوطی نے غیر ملکی تجارت کے تباہ کن اثرات سے کس طرح مدافعت کی۔ یہاں طریقۂ پیداوار کی وسیع بنیاد چھوٹے پیمانے کی زراعت اور گھریلو صنعت کے اتحاد پر قائم ہے اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں مشترک ملکیت پر مبنی پنچایتیں بھی ہیں۔ چین میں بھی ابتدائی نظام اسی قسم کا تھا۔ ہندوستان میں انگریزوں نے حکمرانوں اور زمینداروں کی حیثیت سے چھوٹی چھوٹی اقتصادی تنظیموں کا شیرازہ بکھیرنے کی خاطر اپنے بلا واسطہ سیاسی اور معاشی اقتدار سے کام لیا۔ برطانوی تجارت ان تنظیمات پر انقلاب انگیز اثر ڈالتی ہے اور ان کو صرف اس حد تک پاش پاش کرتی ہے کہ اپنے سستے مال کے ذریعے ان کی کتائی اور بنائی کی صنعتوں کو تباہ کر دے جو اس اتحاد کا قدیم اور لازمی جزو ہیں۔" ۵۰

قدیم معاشی نظام کی اس بربادی کا اہم ترین پہلو زرعی تعلقات کے ساتھ وابستہ تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ ایک دور اندیش اینگلو انڈین سیاستداں سر تھامس منرو نے اپنی فراست کی بنا پر یہ پیش گوئی کی تھی: "ہندوستان میں جن کے اختیار میں زمین کے مالیہ کی تشخیص ہوتی ہے انھیں کے ہاتھوں میں ملک کے امن و امان کی باگ ڈور ہوتی ہے" ۵۱ ہمارے بندوبستِ آراضی کی جو بربادی انگریز حکمرانوں کے ہاتھوں ہوئی اس کا بہترین بیان کارل مارکس نے اپنے لاجواب طریقے سے یوں کیا ہے: "اگر کسی قوم کی تاریخ معاشیات میں ناکام، بیہودہ اور عملی طور پر رسوائے عالم تجربات کا پلندہ ہے تو وہ ہندوستان کے انگریزی نظام کی تاریخ ہے۔ بنگال میں انھوں نے انگریزی نظامِ آراضی کی بگڑی ہوئی نقل کی۔ جنوب مشرقی ہندوستان میں تھوڑی

خیالات نہ رکھتے تھے اور نہ ہی رکھ سکتے تھے جو ہندوستان کی قومی تحریکِ آزادی اور دوسری نوآبادیاتی تحریکات کو بیسویں صدی کے دوران میں حاصل ہوئے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کا جدید قومی آزادی کی تحریکات کے معیار سے جائزہ لینا تاریخی بے اصولی ہے اور ہر لحاظ سے سائنٹیفک طریقے کے منافی ہے۔

لکھنؤ میں برجیس قدر، والیِ لکھنؤ نے ایک اعلان جاری کیا جس میں یہ کہا گیا تھا: "تمام ہندو اور مسلمان جانتے ہیں کہ ہر انسان کو چار چیزیں عزیز ہیں: مذہب، عزت، جان اور مال۔ یہ چاروں چیزیں ملکی حکومت کے تحت ہی محفوظ ہوتی ہیں۔"[۴۸]

غرضیکہ مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہے کہ باغی راہنما کیوں برطانوی حکومت سے نفرت کرتے تھے اور کیوں انھوں نے اپنی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۷-۵۸ء کی بغاوت کا بنیادی مقصد ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی تباہی اور اس کی جگہ ہندوستانی حکومت کا قیام تھا۔ پہلا ایک تخریبی قدم تھا اور دوسرا جدوجہد کا تعمیری جز تھا۔ اگر اس سے یہ شورش قومی بغاوت کا رنگ اختیار نہیں کرتی تو اور کس چیز سے کرے گی۔

۳۔ ایک معاشی نظام کی بربادی

ہندوستان میں برطانوی فتح کا مطلب صرف یہ نہ تھا کہ اس پر غیر ملکی حکومت مسلط ہو گئی بلکہ اس سے بھی زیادہ بری بات یہ تھی کہ خود ہندوستان کے روایتی مجلسی نظام کو تباہ کیا گیا اور ایک نئے نظام کی جانب بڑھنے کے لیے راہ مسدود کر دی گئی۔ مارکس اس زمانے کا واحد مفکر تھا جس نے سائنٹیفک ڈھنگ سے اس المناک واقعے کا مطالعہ کیا۔ اس نے ہندوستان میں برطانوی شہنشاہیت پرستی کے کردار کو ایسے صحیح رنگ میں پیش کیا کہ بعد میں ہندوستانی علماء کی تحقیقات سے اس کے نتائج کی تصدیق ہوئی۔ اس تجزیے سے ہندوستانی محبِ وطن کو ہندوستان کی حقیقتِ حال کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملی اور ہندوستان کے قومی اندازِ فکر میں ترقی پسندانہ رجحان پیدا ہوا۔

۱۸۵۳ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید کے موقع پر برٹش پارلیمنٹ میں ہندوستان کی صورتِ حال پر بحث ہو رہی تھی تو مارکس نے اپنے ایک مقالے بعنوان "برٹش رول ان انڈیا" (British Rule in India) میں لکھا:

"خانہ جنگیوں، حملوں، انقلابات، فتوحات اور قحط کی جو بھی بلائیں ہندوستان کی سرزمین

بذریعہ ہبہ کا بے شک رواج تھا لیکن بہت کم اور وہ بھی فریقین کی خواہش اور رضامندی کے ساتھ عمل میں آتا تھا۔

"انگریزی حکومت کے شروع زمانے میں جائداد آراضی کی فروخت اس کثرت کے ساتھ ہوئی کہ سارا ملک تہ و بالا ہو گیا۔

"قرض کی ادائیگی کے لیے زمین کی فروخت کا رواج بھی نہایت قابلِ اعتراض ہے ساہوکاروں اور سود خوروں نے زمینداروں کو پیشگی رقم دے کر اس سے فائدہ اٹھایا ہے اور انھیں جائداد سے محروم کرنے کے لیے طرح طرح کی دغابازی اور شرارت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے دیوانی عدالتوں میں لاتعداد مقدمے دائر کیے ہیں، کچھ جھوٹے کچھ سچے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ عام طور پر پرانے زمینداروں کو بے دخل کر کے چپکے سے ان کی جائدادوں پر قابض ہو گئے ہیں۔ اس قسم کے مصائب نے ملک کے طول و عرض میں زمینداروں کو برباد کر دیا ہے۔

"برطانوی حکومت نے جو بندوبست مالیہ کا طریقہ نافذ کیا ہے وہ اس کے لیے نہایت قابلِ فخر ہے لیکن یہ سابقہ تشخیصات کی نسبت بھاری ہے۔ پہلے کاشتکار کی اصلی پیداوار کے خاص حصّے کی صورت میں مالیہ وصول کیا جاتا تھا۔ انگریزی سرکار نے جو لگانِ آراضی عاید کیے ہیں ان میں ناگہانی حادثات کی رعایت نہیں رکھی گئی ہے۔"[۵۶]

یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس زرعی انقلاب نے فی الواقع دیہات میں تمام طبقوں اور فرقوں کو بیگانہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر سین بجا فرماتے ہیں:

"صرف زمیندار اور تعلقدار ہی اپنے آبائی پیشوں سے محروم نہیں ہوئے، نئے قانون بیع نے کسان کو بھی یکساں طور سے پریشان کر دیا۔ وہ دائمی طور پر مقروض رہتا اور بنیا جو گاؤں کا ساہوکار تھا دیانتدار قرض خواہ نہ تھا۔ وہ بھاری سود وصول کرتا اور دغابازی سے ہرگز دریغ نہ کرتا۔ پہلے قرض دار اپنے جاگیردار آقاؤں کے زیرِ سایہ محفوظ تھے لیکن نئے قانون نے غیر ادا شدہ قرضوں کے عوض زمین کی فروخت کی اجازت دے دی اور کسان زمین کے ساتھ اپنا پیشہ بھی کھو بیٹھتا۔ نہ صرف مشترکہ مصیبت کی وجہ سے بلکہ سرپرستی اور وفاداری کے روایتی تعلقات نے بھی زمین سے بے دخل کیے گئے زمیندار اور کسان کو متحد کر دیا۔ زمیندار اپنے گاؤں میں رہتا تھا اور اگرچہ کسان اکثر اس کے ہاتھوں سختی جھیلتا لیکن پھر بھی مشکل کے وقت وہ اپنے آقا کی امداد اور ہمدردی پر بھروسہ رکھ سکتا تھا۔ بنیا البتہ باہر کا آدمی تھا۔ وہ کسان کے حقوقِ ملکیت اور اس کا قطعۂ زمین مالی منافع کی خاطر خرید لیتا

آراضی کی تقسیم کا ڈھونگ رچا۔ شمال مغرب میں انھوں نے حتی المقدور زمین کی مشترک مالک ہندوستانی گرام پنچایت کے ساتھ بھی کیا۔"۵۲

برطانوی اصلاحات کا مطلب گرام پنچایت کے نظام پر مبنی ہندوستانی زراعت کی روایتی بنیاد کو سراسر تباہ کرنا تھا۔ مارکس نے اس گرام پنچایت سسٹم کو ایک "ایسا سماجی نظام قرار دیا جو خاص خصوصیات رکھتا تھا۔ اسے دیہاتی نظام کہہ سکتے ہیں جس سے اس قسم کی ہر چھوٹی انجمن (پنچایت) نے آزاد تنظیم اور مخصوص زندگی کا رنگ پایا۔" ایک اور بدعت جو انگریزوں نے رائج کی وہ زمین کو نجی ملکیت قرار دینا تھا۔ دونوں بدعتوں کا مطلب ہندوستانی زراعت کی تباہی اور زمین داروں کی عام بے دخلی تھا۔

برطانوی شہنشاہیت پرستی کے نظریاتی مبلغوں نے اس اہم فرق کو جو برطانیہ کی زرعی پالیسی سے ظاہر تھا اور اس سے پیدا ہونے والے تباہ کن نتائج کو تسلیم کیا مثلاً سرجان اسٹریچی نے اپنی کتاب "انڈیا، اِٹس ایڈمنسٹریشن اینڈ پراگریس" (India, Its Administration and Progress) میں جس نے ایک پوری پشت کے لیے تعلیمی نصاب کا کام دیا، بیان کیا ہے: "ہماری پالیسی یہ رہی ہے کہ زمین کی نجی ملکیت کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ سابقہ حکومتوں نے ایسی ملکیت کے وجود کو کبھی تسلیم نہ کیا۔"۵۳

اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ ان پر قرض کا بوجھ ہماری حکومت سے پہلے کی نسبت اب زیادہ ہے کیوں کہ زمین کی نجی ملکیت کا حق دراصل ہم نے خود ہی پیدا کیا ہے۔ جب عملی طور پر ایسا کوئی حق نہ تھا تو نسبتاً کسی کی کوئی ساکھ بھی نہ تھی۔ جو کوئی زمیندار قرض لینے کا خواہاں ہوتا وہ موزوں ضمانت پیش نہ کر سکتا تھا اس لیے مقروضیت بہت کم تھی۔"۵۴

"اگر کوئی زمیندار مقررہ تاریخ پر مالیہ جمع نہیں کر پاتا تو اس سے اس کی وجہ نہیں پوچھی جاتی بلکہ اس کی جائداد نیلام کر دی جاتی ہے۔"۵۵

ماضی کے اس زرعی نظام کے بارے میں جو انگریزوں نے رائج کیا اور جس سے عوام میں اتنی بیزاری تھی، سرسید احمد خاں کی رائے جاننا مفید ہوگا۔ انگریز سرسید احمد خاں کو بہت دانش مند اور قابل منتظم سمجھتے تھے۔ انھیں بندوبست آراضی سے متعلق زندگی بھر کا ذاتی تجربہ تھا۔ اب میں ان کی کتاب "اسباب بغاوتِ ہند" سے چند اقتباس پیش کرتا ہوں۔

"سابقہ حکمرانوں کے عہد میں ملکیتِ آراضی کے حقوق کی خرید و فروخت، رہن اور انتقال

مجلس کے توسط سے کی جاتی تھی جو بندوبستِ آراضی کو بدلنے اور زمین پر صرف کاشتکاروں کا حق تسلیم کرنے کا منصوبہ باندھ رہی تھی۔

اٹھارویں صدی کے ابعد ہندوستان ایک صنعتی دیس بھی تھا اور خوش حال زراعتی ملک بھی۔ کرگھے پر بنے ہوئے ہندوستانی کپڑے اور دوسری ہندوستانی مصنوعات دنیا بھر میں مشہور تھیں اور ہندوستان کا مال ایشیا اور یورپ کی منڈیوں کو جاتا تھا۔ انگریزوں نے ہندوستان کی صنعت و حرفت کو تباہ کر دیا اور انھیں بالکل مختلف سمت میں ڈال دیا۔ ڈاکٹر ڈی۔ آر۔ گیڈ گل کا بیان ہے:

"یوں تو زوال اٹھارویں صدی کے اختتام پر ہی شروع ہو گیا تھا لیکن انیسویں صدی کے وسط میں یہ نمایاں طور پر ظاہر ہوا۔" ۶۰

انحطاط کا یہ عمل غیر ملکی حکومت کے قیام سے شروع ہوا۔ ہندوستان کے دیسی درباروں کے خاتمے کی وجہ سے جو مال کی مانگ کے بڑے مرکز تھے) غیر ملکی اثر و رسوخ کے زور سے تیز ہوا اور غیر ملکی مال کے مقابلے میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

شہری صنعت کے زوال سے زمین پر دباؤ ضرور بڑھ گیا لیکن اس لیے نہیں کہ لوگ شہروں سے ہجرت کر کے گاؤں کو جا رہے تھے (ایسا بالکل نہیں ہوا) بلکہ ان لوگوں کے رہ جانے کی وجہ سے جو عام حالات میں شہری صنعتوں میں جذب ہو جاتے۔" ۶۱

بنگال کی فتح کے بعد بنگال میں اور آگے چل کر سارے ہندوستان میں ہندوستان کو لوٹنے کے لیے تجارت کے جبری اور غیر مساوی طریقوں سے کام لیا گیا اور یہ ملک کی اقتصادی تباہی کا سبب ہوا۔ آر۔ پی۔ دت کا بیان ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کے حکمراں طبقہ بن جانے کے بعد کس طرح صورتِ حال میں ماہیتی تبدیلی ہونما ہوئی۔ کس طرح زرِ مبادلہ کے توازن کو سازگار بنانے اور کم سے کم قیمت پر زیادہ سے زیادہ مال حاصل کرنے کی غرض سے اقتدار کے ہتھکنڈوں کا روز افزوں استعمال ہونے لگا۔" ۶۲

اٹھارھویں صدی کے اختتام تک اور خاص کر ۱۸۱۳-۳۲ء تک ہندوستان کے بارے میں برطانوی پالیسی میں تبدیلی آچکی تھی۔ غیر مہذب لوٹ کے ایک دور اور ہندوستانی صنعت و حرفت کی باقاعدہ تباہی کے بعد برطانیہ کے دولت مند طبقے نے جس کا صنعتی انقلاب مکمل ہو چکا تھا، ہندوستان کو اپنے مال کی کھپت، خاص کر برطانیہ کے بنے کپڑے کی منڈی کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔ مارکس نے اس نمایاں تبدیلی کو محسوس کیا اور ۱۸۵۳ء کے دوران اپنے ایک مقالے

اس لیے بنیے اور کسان کے درمیان عام طور پر محبت یا وفاداری کا جذباتی رشتہ ممکن نہ تھا اور کسان اب بھی اپنے سابق جاگیردار آقا کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔"۵۷

وسطی ہندوستان میں صورتِ حال یکساں طور پر خراب تھی۔ ڈاکٹر لو جس نے وسطی ہندوستان میں سر ہیوگ روز کے ساتھ خدمت انجام دی، بیان کرتا ہے: "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جائدادوں کے پے درپے ضبط کیے جانے کی وجہ سے ان کے مدت سے دبے ہوئے جذبات اس حد تک بھڑک اٹھے ہیں کہ ان پر قابو پانا مشکل ہے۔" ایک بوڑھے دیہاتی کے حوالے سے وہ مزید بیان کرتا ہے: "صاحب! جنگلات، درخت، دریا، کنویں، تمام دیہات اور تمام مقدس شہر سرکار کی ملکیت ہیں۔ انھوں نے سب کچھ چھین لیا ہے۔ ہر چیز! بتائیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟"۵۸

اس پس منظر میں بہادر شاہ کے باغیانہ اعلان کی اہمیت نمایاں ہے:

"یہ ظاہر ہے کہ برطانوی سرکار نے لگان آراضی کی تشخیص کے وقت بھاری جمعات (ٹیکس) ٹھونس دیے تھے اور پھر مالگذاری کی عدم ادائیگی کی صورت میں جاگیرداروں کی جائدادیں نیلام کر کے انھیں رسوا اور تباہ کیا۔

" زمینداریوں سے متعلق مقدمہ بازیاں بھاری قیمت کے اسٹامپ اور عدالت کے غیر ضروری اخراجات کی وجہ سے مقدمہ باز کنگال ہوتے جا رہے ہیں۔ عدالتوں کی بدعنوانیاں زوروں پر ہیں اور مقدمے برسوں چلتے رہتے ہیں۔

"اس کے علاوہ زمینداروں کی جیب پر ہر سال اسکولوں، ہسپتالوں اور سڑکوں کے لیے چندوں کا بار پڑتا ہے۔ ایسی جبری وصولیاں بادشاہی حکومت میں قطعاً ممنوع تھیں بلکہ اس کے برعکس جمعات ہلکے ہوں گے۔ زمینداروں کی عزت و آبرو محفوظ تھی۔ ہر زمیندار اپنے علاقے میں خود مختار تھا۔ زمینداروں کے تنازعوں کا فیصلہ شرع اور شاستر کے مطابق جھٹ پٹ اور بلا خرچ ہو جاتا ہوگا۔ جو زمیندار اپنے آدمیوں اور روپے کے ساتھ اس جنگ میں شریک ہوں گے انھیں ہمیشہ کے لیے نصف لگان معاف کر دیا جائے گا۔ جو زمیندار صرف روپے کے ساتھ مدد کریں گے ان کا ایک چوتھائی لگان ہمیشہ کے لیے معاف کر دیا جائے گا۔ جو زمیندار انگریزوں کی حکومت کے دوران اپنی آراضی سے ناجائز طور پر محروم کیا گیا ہے اگر وہ بذاتِ خود جنگ میں شریک ہوگا تو اس کی زمینداری بحال کر دی جائے گی اور اُسے لگان کا چوتھا حصہ معاف کر دیا جائے گا۔"۵۹

بہادر شاہ کے اعلان میں صرف زمینداروں کا ذکر کیا گیا ہے، کسانوں کا نہیں۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے جس کی وضاحت ہم بعد کے کسی باب میں کریں گے۔ کسانوں کے مفاد کی حمایت

کماتا تھا۔ بنگال کے مارواڑی لکھ پتی طبقے کی وہی حیثیت تھی جو آگے چل کر شنگھائی کے یورپی تاجروں کے ایجنٹوں کو حاصل ہوئی۔ اس طاقتور طبقے کا ظہور جس کے اقتصادی مفادات غیر ملکی تاجروں کے مفادات کے ساتھ وابستہ تھے اور جنھیں مسلمانوں کی حکومت سے پیدائشی نفرت تھی ہندوستان اور ایشیا کی تاریخ میں بنیادی اہمیت کا واقعہ تھا۔"۶۵ کمپنی اور برطانوی تاجروں کے یہ ہندوستانی کارندے گماشتے اور بنیے کہلاتے تھے۔ انھوں نے غیر ملکی سرمایہ داروں کے نائب گماشتوں کی حیثیت سے کام کیا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں انگریز دوستی کا پارٹ ادا کیا۔

مذکورہ بالا صورتِ حال اور حکومت کی پالیسیوں کے بارے میں سمجھ دار ہندوستانیوں کا ردِ عمل کیا تھا؟

اہلِ حدیث کے بلند پایہ مسلمان عالم علامہ فضل حق خیر آبادی کے بیان کا حوالہ دینا مفید ہوگا انھوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں راہنما کا پارٹ ادا کیا اور عمر قید کی سزا پائی۔

"اقتدار حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ کھانے کی چیزوں پر پابندی لگا کر چارے اور غلے پر قبضہ کر کے اور کاشتکاروں اور کسانوں کو حقوقِ کاشت سے محروم کر کے نقد روپیہ دے کر لوگوں کے مختلف طبقات کو مطیع کیا جائے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ غریب لوگوں اور دیہاتیوں کو اناج کی خرید و فروخت میں کھلی چھٹی نہ ہو۔ اپنی قوم کے آدمیوں کو ترجیح دے کر وہ نرخوں کے گرانے بڑھانے پر اختیار رکھنا چاہتے تھے تاکہ بندگانِ خدا عیسائیوں کی اجارہ داری کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیں اور اپنی ضروریات کے لیے عیسائیوں پر انحصار رکھنے کے لیے مجبور ہو جائیں اور اس طرح عیسائیوں اور ان کے حامیوں کے مقاصد، ان کی دلی خواہشات اور آرزوئیں اور ان کے باطن میں پوشیدہ شرارتیں پایہ تکمیل کو پہنچیں۔"۶۶

اس پس منظر میں دہلی کے باغیوں کی طرف سے بہادر شاہ کی جاری کردہ اپیل معنی خیز تھی۔ اعلان میں تاجروں سے مدد کے لیے یوں التجا کی گئی:

"ظاہر ہے کہ کافر اور دغا باز برطانوی حکومت نے تمام نفیس اور قیمتی تجارتی اشیا پر اجارہ داری حاصل کر لی ہے مثلاً نیل، کپڑا اور دوسری سمندر پار سے درآمد ہونے والی چیزیں۔ لوگوں کے ہاتھ میں صرف معمولی چیزوں کا بیوپار رہ گیا ہے اور اس میں بھی انھیں منافع کے ایک حصے سے محروم رکھا گیا ہے جو وہ محصول اور اسٹامپ کی فیسوں وغیرہ کی شکل میں وصول کر لیتے ہیں۔ غرضیکہ لوگوں کی تجارت محض نام کی ہے ... کے علاوہ تاجروں کے منافع پر محصول، ڈاک ... پیشگی ...

میں لکھا:

"تجارت کی نوعیت یکسر بدل گئی ہے ۱۸۱۳ء تک ہندوستان زیادہ تر مال برآمد کرنے والا ملک تھا لیکن اب درآمد کرنے والا ملک بن گیا ہے اور یہ تبدیلی اتنی تیزی سے واقع ہوئی ہے کہ روپیہ کی شرح زرِ مبادلہ جو عام طور پر ۲/۶ فی روپیہ ہوتی تھی ۱۸۲۳ء ہی میں گر کر ۲/ فی روپیہ ہو گئی۔ ہندوستان جو قدیم زمانے سے دنیا کے لیے سوتی کپڑے کی صنعت کا مرکز تھا، اب انگریزی دھاگوں اور موٹے سوتی کپڑوں سے پاٹ دیا گیا۔ ایک طرف ہندوستان کی پیداوار کو انگلستان جانے نہ دیا جاتا، اور اگر جانے بھی دیا جاتا تو نہایت کڑی شرطوں پر، دوسری طرف برطانوی مصنوعات برائے نام محصول پر بکثرت درآمد ہونے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی سوتی ململ جو کبھی دنیا بھر میں مشہور تھی اس کی صنعت ناپید ہو گئی۔"۶۳

ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسی نے آزاد تاجر طبقے کو بھی تباہ کیا اور صنعت کاروں اور دستکاروں کو بھی۔ پروفیسر رام کرشن مکرجی نے اس عمل کو یوں بیان کیا ہے:

"اس مادی دنیا سے ہندوستانی کاری گروں کے اخراج کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تاجر طبقے کی تباہی کا بھی عمل شروع ہوا۔ ہندوستان کی پیداوار کی اجارہ داری انگریزوں کے ہاتھوں میں جانے کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی تاجروں کا زندہ رہنا محال ہو گیا۔ صرف وہی لوگ اس پیشے کو جاری رکھ سکتے تھے جو کمپنی کی کٹھ پتلی بننے پر رضامند تھے یا اس کے ملازموں کی جو ہندوستان میں اندرونی نجی تجارت کرتے تھے یا ان پرائیویٹ انگریز تاجروں کی جو اس غرض سے ہندوستان میں رہتے تھے ورنہ انھیں کوئی نیا ذریعہ معاش تلاش کرنا پڑتا۔ جن اشیا کے انگریز اجارہ دار تھے ان کی براہ راست خریداری ہندوستانی تاجروں کے لیے نہ صرف ممنوع تھی بلکہ کمپنی کے کارندے اور ملازم ایسا مال ہندوستانی تاجروں پر بازار سے زیادہ قیمت پر ٹھونستے تھے۔"۶۴

آزاد تاجر طبقہ ایک حد تک صنعت کار طبقے کا بھی کام دیتا تھا لیکن اجارہ دار ایسٹ انڈیا کمپنی نے اسے نیست و نابود کر کے ہندوستانی معیشت کے ایک بہت اہم طبقے کو تباہ کر دیا جو اس کا حریف ہو سکتا تھا۔

اس واقعے کے ایک اور پہلو کا کے۔ ایم۔ پانیکر نے یوں تجزیہ کیا ہے: "ہندوستان کے بڑے بڑے ساحلی علاقوں میں یورپی تجارتی مراکز کے قیام کے ساتھ ایک طاقتور ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ پیدا ہو گیا تھا جس کا غیر ملکی تاجروں کے ساتھ قریبی رابطہ تھا اور جو ان کے ساتھ تجارت کر کے بھاری منافع

یہ نہیں ہے۔ ۱۸۵۷ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کا خاتمہ ہوا تو اس نے ہندوستان کے نام سات کروڑ روپے کے قرضے کی بھاری رقم نکال دی۔ اس اثنا میں انھوں نے ہندوستان سے سُود کے علاوہ پندرہ کروڑ روپیہ سے زیادہ خراج وصول کر لیا تھا جو مالی نقطۂ نظر سے ایک ناجائز خراج تھا۔ انھوں نے جنگِ افغانستان، جنگِ چین اور ہندوستان سے باہر دوسری جنگوں کے اخراجات ہندوستان پر ڈال دیے اس لیے انصاف کی رو سے ہندوستان پر کوئی قرضہ نہیں تھا جب کمپنی کی حکومت ختم ہوئی۔ اس کا سرکاری قرضہ ایک فرضی قصہ تھا۔ جو رقمیں ہندوستان سے وصول کی گئیں ان میں سے دس کروڑ روپے کی کافی بڑی رقم اس کے حق میں نکلتی تھی"۔۷۰

منٹگمری مارٹن نام کا ایک انگریز ہندوستانی لوگوں کے ساتھ ہمدردی رکھتا تھا۔ اس نے ۱۸۳۸ء میں لکھا تھا: "برطانوی ہندوستان پر تیس لاکھ پونڈ کا یہ سالانہ بوجھ تیس سالوں میں بارہ فی صدی سود مرکب کی شرح سے (عام ہندوستانی شرحِ سود) بہتر کروڑ انتالیس لاکھ ستانوے ہزار نو سو سترہ پونڈ کی کثیر رقم بن گئی یا کم شرح پر بیس لاکھ پونڈ پچاس سالوں میں آٹھ ارب چالیس کروڑ پونڈ بنتا ہے۔ ایسے مستقل اور روز افزوں بار سے تو انگلستان بھی جلد کنگال ہو جاتا۔ ہندوستان پر اس کا کتنا ناگوار اثر پڑا ہوگا جہاں ایک مزدور کی روزانہ اُجرت دو تین پنس ہو"۔۷۱

اس نے مزید کہا: "پچاس سال تک متواتر ہم ہندوستان سے بیس ۔۔۔ تیس لاکھ اور بعض اوقات چالیس لاکھ پونڈ ہر سال نکالتے رہے ہیں۔ یہ کثیر رقم برطانیہ عظمیٰ کو اس لیے بھیجی گئی ہے کہ تجارتی سٹہ بازی کے خساروں کو پورا کیا جائے، قرضوں کے سود ادا کیے جائیں۔ محکمۂ داخلہ کے عملے کو قائم رکھا جائے اور جن انگریزوں نے ہندوستان میں زندگی بسر کی ہے ان کی جمع کی ہوئی دولت کو انگلستان میں لگایا جائے۔ میرے خیال میں از ... سوجھ بوجھ کے بیے یہ ناممکن ہے کہ ہندوستان جیسے دور دراز ملک کو تیس چالیس لاکھ پونڈ کے مستقل سالانہ ... کے بُرے اثرات سے کلیتاً بچا سکے جب کہ یہ رقم کسی بھی شکل میں اسے واپس نہیں دی جاتی"۔۷۲

پروفیسر رام کرشن مکرجی نے اور زیادہ وضاحت کے ساتھ یہ بات کہی: "اس خراج کی مکمل تصویر اس سے کہیں زیادہ رقم کو ظاہر کرتی ہے جس کا ذکر مارٹن نے ۱۸۳۸ء میں کیا۔ اگرچہ ۱۸۵۵ء، ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء تین برسوں میں چونسٹھ لاکھ چھتیس ہزار تین سو پینتالیس پونڈ کی فاضل درآمد ظاہر ہوتی ہے (اس لیے نہیں کہ غیر ملکی حکمرانوں نے اپنی پالیسی بدل لی تھی بلکہ اس لیے کہ ہندوستان میں کچھ برطانوی سرمایہ ریلوے بنانے اور ملک کو تیار کرنے میں لگایا گیا تاکہ برطانوی صنعتی سرمایہ اس

وغیرہ کے لیے چندوں کا بار پڑتا ہے۔ ان تمام رعایاتِ خصوصی کے باوجود کسی شبہے کے اشارے یا شکایت پر تاجر قید کر لیے جاتے ہیں اور رسوائی کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔

"جب بادشاہی حکومت قائم ہو جائے گی تو تمام مذکورہ بالا عیارانہ دستور ختم کر دیے جائیں گے اور بلا استثنا ہر چیز کی تجارت، بری ہو یا بحری، ہندوستان کے ملکی تاجروں پر کھول دی جائے گی اور وہ سرکاری دخانی کشتیوں اور گاڑیوں سے اپنا مال مفت لے جا سکیں گے۔ جن تاجروں کے پاس اپنا سرمایہ نہیں ہے ان کی مدد سرکاری خزانے سے کی جائے گی۔ اس لیے ہر تاجر کا فرض ہے کہ وہ جنگ میں حصہ لے اور آدمیوں اور روپے کے ساتھ بادشاہی سرکار کی کھلم کھلا یا خفیہ مدد کرے جیسا کہ اس کی حالت اور مفاد کا تقاضہ ہو اور برطانوی حکومت کے تئیں وفاداری ترک کرنے کی قسم کھائے۔"[٦٧]

اعلان میں اہلِ حرفہ سے ان الفاظ میں اپیل کی گئی:

"یہ ظاہر ہے کہ فرنگیوں نے ہندوستان میں انگریزی چیزوں کو رواج دے کر جولاہوں، روئی دھننے والوں، بڑھئیوں، لوہاروں اور موچیوں وغیرہ کو بیکار کر دیا ہے اور ان کے تمام پیشوں پر قبضہ کر لیا ہے یہاں تک کہ ہر قسم کا دستکار بھکاری بن کے رہ گیا ہے لیکن بادشاہی حکومت کے عہد میں صرف ملکی دستکار ہی بادشاہوں، راجاؤں اور امیروں کی ملازمت میں لیے جائیں گے۔ یہ یقیناً ان کی خوش حالی کی ضمانت ہوگی۔ اس لیے ان دستکاروں کو انگریزوں کی ملازمت ترک کر دینا چاہیے اور جنگ میں مصروف مجاہدین کی مدد کرنی چاہیے تاکہ وہ دنیاوی اور ابدی سعادت کے حقدار بنیں۔"[٦٨]

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کے معاشی اور سیاسی عمل دخل نے ہمارے ملک کی ساری دولت نچوڑ لی۔ اسے ہندوستان کے معاشی مورخین نے اقتصادی نکاس کا نام دیا ہے۔ اب ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے عین پہلے کی حالت کا مشاہدہ کریں گے۔

ایک نام نہاد "ہندوستانی قرضہ تھا جسے کمپنی نے ہندوستان میں اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے، مہموں اور جنگوں کے ذریعے اپنے اثر و رسوخ کو اور بڑھانے، انگلستان میں حصہ داروں کو بھاری منافع دینے، ۱۷۶۹ء سے برطانوی سرکار کو خراج ادا کرنے اور انگلستان کے مقتدر اشخاص کو رشوتیں دینے پر صرف کیا گیا تھا۔"[٦٩] یہ ہندوستانی قرضہ کیوں اور کیسے وجود میں آیا اس سلسلے میں آر۔ سی۔ دت نے یہ خیال ظاہر کیا ہے: "اس ملک (انگلستان ۱۹۰۳ء) میں یہ ایک عام غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ تمام ہندوستانی قرضے سے مراد وہ برطانوی سرمایہ ہے جو ہندوستان کی ترقی میں لگایا گیا ہے۔ اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے سرکاری قرضے کی بابت

۳۔ مذہبی پہلو

۱۸۵۷ء کی بغاوت میں مذہب کو بڑا دخل تھا۔ برطانوی سیاستدانوں اور وقائع نگاروں نے اس پہلو کو بڑھا چڑھا کر اور غلط رنگ میں پیش کیا تاکہ وہ اپنے اس نظریے کو ثابت کر سکیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت رجعت پسندانہ، احیائے روایت کی حامی اور ان ترقی پسندانہ اصلاحات کے خلاف تھی جو وہ ہندوستانی سماج میں نافذ کر رہے تھے۔ انگریزی تعلیم پانے والے روشن خیال ہندوستانیوں کی پہلی پشت نے اس شہنشاہیت پرستانہ نظریے کو بلا چون و چرا قبول کر لیا کیوں کہ انھوں نے قدیم رجعت پسندانہ مذہبی اثرات کے باعث نقصان اٹھایا تھا۔ ایک صحیح تاریخی نظریے کا تقاضا ہے کہ ہم نہ اس تاریخی مرحلے کو بھولیں جس پر ہندوستانی سماج ۱۸۵۷ء سے عین پہلے پہنچ چکا تھا، نہ ان نظریاتی قدروں کو جو اس سماج کا معمول ہیں اور نہ ان نظریاتی صورتوں کو جو ہندوستانی لوگ اپنی آرزوؤں کو دے سکتے تھے۔

ہندوستانی جاگیردارانہ سماج کا شیرازہ انیسویں صدی کے وسط میں تیزی سے بکھر رہا تھا اور غیر ملکی فاتح ہماری کمزوریوں کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنا الّو سیدھا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ ہمارے ملک پر ایک پر جوش اور منظم معاشی، سیاسی اور نظریاتی حملہ کر رہے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ جس سے ہندوستان کے تمام طبقے دوچار تھے، یہ تھا کہ ہندوستان کو ہندوستانیوں کے لیے محفوظ کیا جائے اور اسے فرنگیوں کے چوطرفہ حملوں سے بچایا جائے۔ اس وقت کی تاریخی صورتِ حال میں روایتی؛ مذہبی و تمدنی تصورات لازمی طور پر غیر ملکی حکومت کے خلاف ہندوستان کی نظریاتی جدوجہد کا اہم جزو تھے۔ تاریخ کے اپنے مطالعے اور اپنی قسمت کو از سر نو بنانے کی خاطر لوگوں کی پشت ہا پشت کی جدوجہد کی بنا پر مارکس اس نتیجہ پر پہنچا تھا:

"لوگ اپنی تاریخ بناتے ہیں لیکن اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہتے ہیں۔ وہ اسے ایسے حالات کے تحت نہیں بناتے جن کا انھوں نے خود انتخاب کیا ہو یا جو ماضی کی دین ہوں۔ تمام مردہ پشتوں کی روایت زندہ لوگوں کے دماغ پر بوجھ بن کر سوار رہتی ہے اور عین اس وقت جب وہ اپنے اندر اور گرد و پیش کی چیزوں میں انقلاب لانے یا کوئی ایسی چیز پیدا کرنے میں مصروف ہوتے دکھائی دیتے ہیں جس کا پہلے کوئی وجود نہ تھا تو انقلابی بحران کے عین اس دور میں وہ ماضی کی روحوں کو بے تابی کے ساتھ بلاتے ہیں اور ان سے نام، جنگ کے نعرے اور ملبوسات مستعار لیتے ہیں تاکہ وہ اس قدیم بھیس اور مانگی ہوئی زبان میں تاریخ عالم کے نئے منظر کو پیش کریں۔"[۷۵]

سے استفادہ کرسکے) لیکن کمپنی کی حکومت کے آخری دور کے چوبیس سالوں کے دوران یعنی ۳۵-۱۸۳۴ء سے ۵۸-۱۸۵۷ء تک کل خراج جو ہندوستان سے مصارف محکمہ داخلہ اور ہندوستان کے فاضل برآمد کی شکل میں وصول کیا گیا پندرہ کروڑ اٹھارہ لاکھ تیس ہزار نو سو نواسی پونڈ تک پہنچ گیا۔ اس سے تریسٹھ لاکھ پچیس ہزار آٹھ سو چھہتر پونڈ کی سالانہ اوسط نکلتی ہے جو اس مدت میں جمع کیے گئے۔ سالانہ لگان آراضی کے لگ بھگ نصف کے برابر ہے۔"[۴۳]

یہ ایک ایسی بھیانک حقیقت تھی جو ہندوستان کی صدیوں پرانی تاریخ میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ بقول مارکس "اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جو مصیبت انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان پر نازل ہوئی ایسی انتہائی اور شدید قسم کی مصیبت ہندوستان نے پہلے کبھی نہ اٹھائی تھی۔"[۴۴]

انگریزوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے عہد میں ہندوستان کے معاشی نظام کو سراسر درہم برہم کردیا۔ انھوں نے قدیم بندوبست آراضی کو تہ و بالا کردیا۔ انھوں نے ملک کی صنعت وحرفت کو پاش پاش کردیا۔ ہندوستان کی معیشت کے ان دو شعبوں کے درمیان رابطے کو منقطع کردیا۔ ہمارے ملک کی دولت کو باقاعدگی کے ساتھ نکال کر اپنے ملک میں لے گئے اور ہماری معیشت کی پیداوار کے سرچشموں کو خشک کردیا۔ ہندوستانی سماج کے ہر طبقے نے اس نئے غارت گر کے ہاتھوں سختی جھیلی۔ زمینداروں کو ان کی زمین سے بے دخل کردیا گیا اور کسان کنگال ہوگئے۔ تاجروں کے شہری متوسط طبقے کا بحیثیت ایک آزاد جماعت کے نام ونشان مٹ گیا۔ اہل صنعت وحرفت اپنے تخلیقی پیشوں سے محروم ہوگئے۔ ملک کے معاشی نظام اور اس کے ہر طبقے کی بے مثال تباہی کا قدرتی نتیجہ ایک عظیم سماجی انقلاب کی صورت میں رونما ہوا اور یہ ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت تھی۔ برطانیہ کی سراسر تباہ کن پالیسی نے اس کی حکومت کے خلاف ایک وسیع عوامی بغاوت پیدا کی۔

البتہ ہندوستانی سماج کے اندر ان تخلیقی قوتوں اور طبقوں نے ابھی نشوونما نہیں پائی تھی (درحقیقت برطانیہ کی ابتدائی پالیسی نے ان کی پہلی کونپلیں ہی تباہ کردی تھیں) جو اس انقلاب کی فتح کے موجب ہوتے۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور اس کی ناکامی تاریخی طور پر دونوں ناگزیر واقعات تھے لیکن یہ بھی تاریخ کا ایک تقاضا تھا جس کے بعد نئے حالات رونما ہوئے (ان کا ہم بعد میں تجزیہ کریں گے) جن سے ہندوستانیوں کی جدید قومی تحریکِ آزادی پیدا ہوئی اور وہ نئی سماجی قوتیں ابھریں جو اس کی فتح کی موجب ہوئیں۔

بولا تھا۔ اس مسئلے کی کئی برسوں تک پوری پوری چھان بین جاری رہی۔ کے اعتراف کرتا ہے کہ، "اس میں کوئی شک نہیں کہ کارتوسوں کی تیاری میں گائے کی چربی استعمال کی گئی۔" لارڈ رابرٹس کا بیان ہے: "حکومتِ ہند کی دستاویزات میں مسٹر فارسٹ کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ کارتوسوں کی تیاری میں جو چکنا کرنے والی چیز استعمال کی گئی وہ واقعی قابلِ اعتراض اجزا یعنی گائے اور سؤر کی چربی سے مرکب تھی اور کارتوسوں کی ساخت میں فوجیوں کے مذہبی تعصبات سے ایسی لاپروائی کا اظہار کیا گیا جسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔"[۷۸]

بقول مالیسن: "چربیلا کارتوس ایک معمولی واقعہ تھا۔ یہ تو محض ایک دیا سلائی تھی جس سے سرنگ پھٹ گئی جو مدت سے تیار ہو رہی تھی۔" اور بھی زیادہ راز فاش کرنے والا چارلس بال ہے: "ڈسرائیلی نے کارتوسوں کی چربی کا معاملہ یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ کسی کو بھی یقین نہیں کہ یہ شورش کا اصلی سبب ہے یہی کارتوس جن کے بارے میں سپاہیوں نے اعلان کیا تھا کہ ان کے استعمال سے ان کی ذات مٹ جاتی ہے ہمارے خلاف لڑتے ہوئے انھوں نے بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرنے میں کوئی تامل نہ کیا۔"[۷۹]

یہ شک کہ برطانوی سرکار ہندوستانی لوگوں کو عیسائی بنانے پر تلی ہوئی ہے دور دور تک پھیل گیا۔ ہم ایک ہم عصر مسلمان مجتہد کے بیان کا حوالہ دیتے ہیں: "انھوں نے طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے کام لے کر مختلف مذاہب (سوائے عیسائیت کے) کو نیست و نابود کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور انتہائی کوشش کی۔ انھوں نے قصبوں اور شہروں میں مدرسے قائم کیے تاکہ بچوں اور اَن پڑھ بالغوں کو اپنے دین اور اپنی زبان کی کتابیں پڑھائیں۔ انھوں نے علم و ادب کے مراکز اور مدرسے اور پاٹھ شالائیں جو قدیم زمانے میں قائم کی گئی تھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔"[۸۰]

ہندوستانیوں کے شکوک کلیتہً جائز تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹرس کے چیرمین مسٹر مینگلز نے ۱۸۵۷ء میں پارلیمنٹ سے (House of Commons) میں کہا "خدا نے انگلستان کو ہندوستان کی وسیع سلطنت عطا کی ہے تاکہ ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے تک مسیح کا جھنڈا فاتحانہ انداز میں لہرائے۔ ہر ایک کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا چاہیے تاکہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے شاندار کام کو جاری رکھنے میں کسی بھی وجہ سے لیت و لعل نہ ہو۔"[۸۱]

ان شہادتوں سے ظاہر ہے کہ عیسائی مبلغوں کی سرگرمیوں میں تشویشناک اضافہ ہوا۔ لندن سے مذکورہ بالا ہدایت کے ساتھ برطانوی مشنریوں نے ہندوستان میں جس جوش سے کام کیا اس کو ریورنڈ کینیڈی نے صاف صاف بیان کیا ہے: "خواہ کیسی ہی مصیبتیں ہم پر نازل ہوں، جب تک

یہ کہنا بالکل صحیح نہیں کہ جو بڑی بڑی اصلاحات نافذ کی گئیں مثلاً ستی کی رسم کا انسداد، بیوہ کی دوبارہ شادی وغیرہ ان کے لیے انگریز حکراں ذمہ دار تھے۔ صرف سیاسی پروپیگنڈے کی غرض سے ہی انگریز وقائع نگاروں نے بعد میں اس چیز کا دعویٰ کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اصلاحات جن کی مدت سے ضرورت تھی خود ہندوستانی مصلحین شروع کر چکے تھے۔

انیسویں صدی کے آغاز تک برطانوی حکمراں اس قدر مغرور اور اقتدار کے نشے سے مدہوش ہوگئے تھے کہ حکومت کے ضابطوں میں جان بوجھ کر ہندوستانی رسوم کو نظر انداز کرتے اور حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیتے۔ ہندوستانی عوام اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ سب کچھ انھیں آہستہ آہستہ عیسائی بنانے کا منصوبہ ہے۔ مثال کے طور پر جیلوں میں مشترک کھانا۔ زیادہ سنگین ایکٹ نمبر ۲۱ ۱۸۵۰ء تھا جس کی رو سے مذہب بدلنے والے اپنی آبائی جائداد کے وارث بن سکتے تھے۔ اس ردعمل کو جو اس قانون سے پیدا ہوا اور جس طرح اس قانون نے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا کام آسان تر کر دیا اس کو سر سید احمد خاں نے یوں بیان کیا ہے:

"قانون ساز مجلس اس الزام سے بری نہیں ہے کہ اس نے مذہبی معاملات میں مداخلت کی ہے۔ ۱۸۵۰ء کے قانون نمبر ۲۱ سے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو یقیناً نقصان پہنچتا ہے۔ عام خیال ہے کہ یہ قانون اس مقصد سے پاس کیا گیا تھا کہ لوگوں کو بہکا کر عیسائی بنایا جائے۔ ہندو مذہب جیسا کہ معلوم ہے، دوسرے مذہب والوں کو ہندو مت قبول کرنے کی اجازت نہیں دیتا اس لیے اس قانون سے ہندوؤں کو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ اگر کوئی آدمی اسلام قبول کرتا ہے تو وہ اپنے دین کی شرع کی رو سے اس جائداد کی وراثت سے محروم ہو جاتا ہے جو دوسرے مذہب والا اس کے لیے چھوڑ مرے۔ اس لیے اس قانون سے کوئی نومسلم بھی فائدہ نہ اٹھا سکتا تھا۔ البتہ اس سے ایسے آدمیوں کو بڑے فائدے پہنچتے جو عیسائی بنتے۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قانون نہ صرف لوگوں کے مذہب میں مداخلت کرتا ہے بلکہ تبدیلِ مذہب کی زبردست ترغیب دیتا ہے۔"[۷۶]

قدیم روایات میں یہ مداخلت فوجیوں پر بھی اثرانداز ہوئی۔ ذات پات کی نشانیوں کے استعمال کی ممانعت کر دی گئی۔ انھیں سمندر پار کرنے اور غیر ممالک میں جا کر برطانیہ کی جنگوں میں لڑنے پر مجبور کیا گیا اور سب سے زیادہ خطرناک چربی دار کارتوسوں کا استعمال تھا۔ برطانوی سپہ سالاروں اور سیاستدانوں نے اس بات سے غصّے کے ساتھ انکار کیا کہ گائے یا سؤر کی چربی استعمال کی گئی ہے جس پر ہندوؤں اور مسلمانوں کو اعتراض ہے۔ بعد میں یہ ثابت ہو گیا کہ انھوں نے جان بوجھ کر جھوٹ

آگیا ہے کہ ملک میں صرف ایک ہی دین ہو اس لیے مناسب ہے کہ ہم سب عیسائی بن جائیں؛ یہ کہنے میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اس گشتی خط کے پہنچنے پر تمام لوگوں کی آنکھوں میں خوف سے اندھیرا چھا گیا اور آخر ایسا نظر آتا تھا گویا ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ وہ چلا کر کہنے لگے کہ وہ گھڑی جس کا مدت سے ڈر تھا آ پہنچی۔ سب سے پہلے سرکاری ملازموں کو عیسائی بنانے کا منصوبہ تھا اور اس کے بعد عوام کو۔ کہتے ہیں کہ یہ خط سرکار کے حکم سے لکھا گیا لیکن جلد ہی بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر نے اس کے بارے میں سُنا تو اس نے ایک اعلان جاری کیا جس سے لوگوں کے دلوں کو تسکین ہوئی اور کچھ وقت کے لیے شکوک دب گئے۔ تاہم یہ عارضی تسکین تھی۔ لوگوں کا اب بھی یہ خیال تھا کہ حکومت نے یہ سارے منصوبے عارضی طور پر ترک کیے ہیں اور جوں ہی حالت سنبھلی ان کو از سرِ نو شروع کر دے گی۔"[۸۵]

انگریزی تعلیم کے اجرا کا سبب بھی ہندوستان میں یورپی سائنس کو رائج کرنے اور روشن خیال طبقہ پیدا کرنے کی نیک خواہش نہ تھی بلکہ اس کا سیدھا تعلق انگریزی تعلیم کے حامیوں میں نئے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کے مقصد کے ساتھ تھا۔ مثال کے طور پر ۱۲ر اکتوبر ۱۸۳۶ء کو میکالے نے اپنی ماں کے نام ایک خط میں لکھا: "یہ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر ہماری تعلیم کے منصوبے پر عمل کیا جائے تو بنگال میں تیس سال کے بعد ایک بھی بُت پرست نہ رہے گا۔"[۸۶]

ڈاکٹر آر۔ سی۔ موزمدار کا بیان ہے: "تینوں پریذیڈنسیوں کی اعلیٰ ترین عدالتوں نے یہ حکم جاری کیا کہ نوجوان ناتجربہ کار مذہب بدلنے والے ہندوؤں کو بجائے ان کے والدین کے زیرِ سرپرستی رکھنے کے ان کی مرضی کے خلاف مع بیویوں کے جبراً انھیں مشنریوں کے حوالے کر دیا جائے۔ ایک موقع پر لوگوں نے عدالت کا محاصرہ کر لیا اور اس جج کو ہلاک کر کے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جس نے ایسا فیصلہ صادر کیا اور صورتِ حال پر قابو پانے کے لیے فوج کو بلانا پڑا۔ اس واقعے پر رائے زنی کرتے ہوئے ایک ہندوستانی نے ۳۰ر اپریل ۱۸۵۷ء کو "دی ہندو پیٹریٹ" (The Hindu Patriot) کے نام اس مضمون کا ایک خط لکھا کہ "ایسا واقعہ، نہ کہ ملکی پریس کی پھیلائی ہوئی دس ہزار افواہیں، ساری قوم کو اپنے حکمرانوں سے منحرف کرنے کو کافی ہے۔"[۸۷]

اس لیے یہ بخوبی واضح ہے کہ برطانوی حکمران محض شہنشاہیت پسندانہ مقاصد کی خاطر ۱۸۵۷ء سے برسوں پہلے سے عوام کو بڑے پیمانے پر عیسائی بنا کر ہندوستان کے قومی تمدن کو مٹانے پر تُلے ہوئے تھے۔ ہندوستانی عوام نے بھی اور ہندو مسلمان فوجیوں نے بھی سر پر منڈلاتے ہوئے اس خطرے کو بلا لحاظ کسی نقطۂ نظر کے بھانپ لیا۔ خواہ یہ سر سید احمد خاں ہوں یا بہادر شاہ، خواہ کلکتے

ہندوستان میں ہماری سلطنت قائم ہے ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارا سب سے بڑا کام ملک میں عیسائیت کی اشاعت ہے۔ جب تک کنیا کماری سے ہمالیہ تک سارا ہندوستان دینِ عیسوی قبول نہ کرلے اور جب تک ہندومت اور اسلام کو رد نہ کردے ہماری کوششیں استقلال کے ساتھ جاری رہنا چاہیے۔"[۸۲]

اس مخالفانہ روش اور اس کے سبب فرنگی مشنریوں کی مخربِ اخلاق اور مخربِ قومیت سرگرمیوں سے جو ہندوستانی ردِ عمل پیدا ہوا اس کا ریورنڈ کینیڈی خود جائزہ لیتا ہے اگرچہ اس نے جو کچھ خود سنا اور لکھا اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا: "میرا ایک آشنا مولوی جس کی بظاہر میرے ساتھ گہری دوستی تھی بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ اس وقت میں اس کے ساتھ تھا میں نے پوچھا: "مرنے سے پہلے تمھاری آخری خواہش کیا ہے؟" اس سوال پر وہ بہت مایوس اور غمگین نظر آیا، بولا: "یقین جانیں، میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں دو فرنگیوں کو بھی قتل نہ کیا۔" ایک اور موقع پر ایک معزز اور عالم ہندو نے دلیری کے ساتھ کہا "ہم چاہتے ہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ اور ہماری قومی حکومت قائم ہوجائے تاکہ ہم اپنے آباواجداد کی رسوم کو جاری رکھ سکیں۔"[۸۳]

مشنریوں کا تبلیغ کا کام نہ صرف متشدد، جارحانہ اور دور دور تک پھیلا ہوا تھا بلکہ اسے سرکار کی حمایت بھی حاصل تھی۔ سید احمد کا بیان ہے: "بعض ضلعوں میں مشنریوں کے ساتھ تھانے کے سپاہی شامل ہوجاتے اس صورت میں مشنری صرف اپنی کتابوں کی تعلیمات کی وضاحت پر ہی قناعت نہ کرتے بلکہ دوسرے مذاہب کے پیروؤں اور مقدس مقامات پر دل آزار اور غیر موزوں زبان میں حملے کرتے اور سننے والوں کے جذبات کو اس قدر مشتعل اور مجروح کرتے کہ بیان نہیں ہوسکتا۔ اس طرح لوگوں کے دلوں کی گہرائی میں بے اطمینانی کے بیج بھی بوئے گئے۔"[۸۴]

لارڈ کیننگ کی تبلیغی سرگرمیوں کی سرپرستی اور ان کے فنڈ میں کثیر رقموں کے چندے عام طور سے مشہور تھے اور دور دور تک ان کا چرچا تھا۔ سب سے زیادہ بدنام مسٹر ایڈمنڈ کے خط کی مشہور داستان ہے۔ اس کے بارے میں سید احمد خاں کا بیان ہے:

"جب یہ تمام بیزاریاں انتہا کو پہنچ چکی تھیں ۱۸۵۵ء میں مسٹر ایڈمنڈ کا ایک خط اچانک شائع ہوا جو علی الاعلان کلکتے سے مشتہر کیا گیا۔ اس کی نقل حکومت کے تمام بڑے بڑے افسروں کو بھیجی گئی۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ 'اب تمام ہندوستان ایک حکومت کے تحت ہے۔ ٹیلی گراف نے ملک کے تمام حصوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ملا دیا ہے گویا ایک ہوگئے ہیں۔ ریلوے نے ان کو ایک دوسرے کے اس قدر قریب کردیا ہے کہ گویا تمام قصبات ایک ہوگئے ہیں۔ اب وقت

۱۸۵۷ء میں اس کا حسب ذیل ترجمہ شایع ہوا:

اے شترو سنہار کا! (دشمن کو نیست و نابود کرنے والی دیوی کا نام)
بہتان تراشوں کا منھ بند کر دے
چغل خوروں کو ہڑپ کر جا اور پاپیوں کا ناش کر دے
اے مات چنڈی! انگریزوں کو ہلاک کر دے، ان کا ستیاناس کر دے
دشمنوں کو بچ کر نہ جانے دے، نا ہی ان ظالموں کے
بیوی بچوں کو، اے سنہار کا!
شنکر پر کرپا کر۔ اپنے بندوں کی مدد کر!
دھرم کی پکار سن!
او متھالکا! بھرشٹوں کو کھا جا
دیر نہ کر
ابھی ان کو نگل جا
اور جلدی سے
اے گھور متھالکا۔!

دہلی کے محاصرے کے دوران انگریز ایجنٹوں نے بار بار کوشش کی کہ ہندو مسلم متحدہ جہاد کو ہندو مسلم خانہ جنگی میں بدل دیں تاکہ بھائی بھائی کی جان لے۔ ۱۸۵۷ء کے ماہ مئی میں انگریز ایجنٹوں نے جہاد کے نام پر ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کے کان بھرنے شروع کر دیے اور اس معاملے کو بہادر شاہ کے روبرو پیش کیا گیا۔" بادشاہ نے جواب دیا ایسا جہاد ناممکن ہے اور ایسا خیال انتہائی بیہودگی ہے کیوں کہ پوربیے سپاہیوں میں اکثریت ہندوؤں کی ہے اس کے علاوہ ایسے فعل سے خانہ جنگی پیدا ہوگی اور نتیجہ افسوسناک ہوگا۔ مناسب یہ ہے کہ تمام طبقات میں باہمی ہمدردی موجود ہو، ہندو افسروں کا ایک وفد یہ شکایت کرنے کے لیے پہنچ گیا کہ ہندوؤں کے خلاف جہاد کی تلقین کی جا رہی ہے۔ بادشاہ نے جواب دیا: جہاد انگریزوں کے خلاف ہے، میں نے ہندوؤں کے خلاف اس کی ممانعت کر دی ہے۔" ۹۰

اس طرح ہمارے باغی آبا و اجداد نے غیر ملکی غلبہ کے خلاف ایک متحدہ انقلابی جدوجہد کو منظم کرنے اور جاری رکھنے کے لیے مذہب سے کام لیا۔ ۱۸۵۷ء کے تاریخی حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ

کاروتن خیال بنگالی یا بٹھور کا نانا صاحب۔ چنانچہ اگر ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں مذہبی پہلو کو بڑا دخل تھا تو یہ قوم پرستی کا ایک جُز تھا۔ ہندوستانی عوام نے اپنے مذاہب کی حفاظت کے لیے ہتھیار اٹھائے اور وہ نہ صرف اپنے مذہب کے تحفظ بلکہ اپنی طرزِ زندگی اور قومیت کو بچانے کے لیے بھی لڑ رہے تھے۔ البتہ ہندوستانی سماج میں کئی رجعت پسندانہ خصوصیات بھی تھیں لیکن ان کو بدلنے کا صحیح طریقہ صرف یہ تھا کہ ہندوستانی لوگ خود اس کی کوشش کریں۔

صرف اسی پر بس نہیں۔ ہمارے باغی بزرگوں نے انقلابی جدوجہد کو بڑھانے کے لیے مذہب سے کام لیا۔ مذہب کے سبب انھوں نے اپنے اوسان خطا نہ ہونے دیے بلکہ انھوں نے فرنگیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے مذہب سے تقویت حاصل کی۔

دہلی میں شاہی اجازت کے ساتھ ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکسایا گیا کہ وہ اپنے مذہب کے نام پر متحد ہو کر جہاد کریں "اس وقت دہلی اور میرٹھ میں موجود فوجی افسر تمام ہندوؤں اور مسلمانوں، ہندوستان کے شہریوں اور خادموں کو سلام دعا بھیجتے ہیں: سبھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ان دنوں تمام انگریزوں نے یہ مذموم منصوبے باندھے ہیں کہ ـــ پہلے تمام ہندوستانی فوج کے مذہب کو مٹایا جائے اور پھر لوگوں کو جبراً عیسائی بنایا جائے۔ اس لیے ہم اپنے مذہب کی خاطر متحد ہو گئے ہیں اور ہم نے ایک بھی کافر زندہ نہیں چھوڑا۔ اسی لیے ہم نے دہلی کے شاہی خاندان کی حکومت کو از سرِ نو قائم کر دیا ہے۔ ایک بہت بڑا خزانہ اور سیکڑوں بندوقیں ہمارے ہاتھ لگی ہیں۔ اس لیے مناسب ہے کہ جو فوجی اور جو لوگ عیسائی بننا پسند نہیں کرتے وہ متحد ہو جائیں اور جرأت سے کام لیتے ہوئے ان کافروں کا خاتمہ کر دیں۔" ۸۸

لکھنؤ کی شکست کے بعد جب اودھ میں جدوجہد ماند پڑ گئی اور باغی مدافعت میں جنگ کر رہے تھے اور اکثر لڑائیوں میں ہار رہے تھے تو انگریز گرفتار شدہ سپاہیوں سے پوچھتے تھے: "تم بغاوت میں کیوں شامل ہوئے؟" ان کا جواب یہ ہوتا تھا: "ہمارے مذہب کا تقاضا ہے کہ انگریزوں کو قتل کیا جائے۔ اس کا انجام انگریزوں اور تمام سپاہیوں کی تباہی ہوگا اور پھر واللہ اعلم!" ۸۹

گونڈ قبائل کا راجہ انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے ناگپور میں رہتا تھا۔ اس نے ایک روایتی سنسکرت ستوتر کو جو دیوی کی پوجا میں گایا جاتا ہے انگریزوں کے خلاف ایک بھجن میں بدل دیا تھا۔" دی لنڈن ٹائمز" (The London Times) مورخہ ۱۳ اکتوبر

"سپاہی کا کردار خواہ کتنا ہی ذلیل ہو، یہ انگلستان کے ہندوستان میں اپنے ہی کردار کا گھناؤنا عکس ہے۔ نہ صرف سلطنتِ شرقی کے قیام کے دور میں بلکہ مدت کی مستحکم حکومت کے دوران میں بھی۔

"چونکہ جیریکو کی مانند دہلی آندھی کے سخت جھونکوں کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا اس لیے جان بُل کو انتقام کے نعرے بلند کرنے پڑے تاکہ وہ یہ بھول جائے کہ اس کی اپنی سرکار ہی اس فتنہ پردازی کے لیے ذمہ دار ہے جس کو اس حد تک بڑھنے دیا گیا۔" ۹۱

اس مقالے کے ابتدائی حصوں میں انگریزوں کے خلاف اس شدید نفرت کا کچھ تصور پیش کیا گیا ہے جو سو سالہ حکومت کے دوران انگریزوں نے اپنی بداعمالیوں سے ہندوستانیوں میں پیدا کی۔ وہ نفرت ۱۸۵۷ء کی جدوجہد میں پھوٹ پڑی۔ مسز کوپ لینڈ کی لکھی ہوئی ایک داستان میں اس جذبے کو ہندوستان کے دیہاتی محاورے میں بیان کیا گیا ہے جس نے باغی سپاہیوں میں ایک نئی روح پھونکی "ایک افسر نے جو قیدیوں کے مقدمات کی سماعت کر رہا تھا ایک سپاہی سے پوچھا: 'تم عورتوں اور بچوں کو کیوں قتل کرتے ہو؟' اس آدمی نے جواب دیا: 'جب تم کسی سانپ کو ہلاک کرتے ہو تو اس کے بچوں کو بھی مار ڈالتے ہو'۔" ۹۲

باغیوں کے راہنما عورتوں اور بچوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کو پسند نہیں کرتے تھے اور مجموعی طور پر وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے۔

خیرآباد کے علامہ فضل حق جنگ سے متعلق اپنے "رسالہ" میں بیان کرتے ہیں "باغی سپاہیوں میں ایسے بھی لوگ تھے جنھوں نے شرمناک حرکتیں کیں اور حد سے بڑھ کر زیادتیاں کیں اور مظالم ڈھائے، بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کیا۔ انھوں نے عورتوں کو قتل کر کے ذلت اور رسوائی پائی اور بچوں کو ہلاک کر کے وہ بدنام اور خوار ہوئے۔" ۹۳

اودھ میں بغاوت سب سے زیادہ پھیلی اور کمال عروج کو پہنچی۔ برطانوی مورخ فارسٹ لوگوں کی انسان دوستی اور ضبطِ نفس کی یوں داد دیتا ہے: "فوجیوں نے غدر کیا اور لوگوں نے وفاداری ترک کی لیکن انتقام کسی نے نہیں لیا اور نہ ہی ظلم و ستم کیا گیا۔ بہادر اور مضطرب آبادی نے حکمران طبقے کے پناہ گزینوں کے ساتھ (سوائے چند مثالوں کے) بے حد مہربانی کا سلوک کیا۔ اودھ کے جاگیرداروں نے اپنے بدبخت آقاؤں کے ساتھ برتاؤ میں بڑی خوش خلقی اور جوانمردی سے کام لیا۔" ۹۴

جدوجہد کی نظریاتی صورت مذہبی رنگ اختیار کرے۔ کسی اور چیز کی توقع رکھنا مصلحت کے منافی اور غیر معقول ہوتا۔

۴۔ شہنشاہیت پرستوں کی دہشت انگیزی

تاریخ ہندوستان پر انگریزوں کی درسی کتابوں میں صرف "باغیوں کے مظالم" کی داستان بیان کی گئی ہے عورتوں کی بے حرمتی، بچوں کا قتل وغیرہ۔ لیکن حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی ساورکر اور دوسرے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی ابتدائی پشت نے خود برطانوی ماخذوں سے ہندوستانی لوگوں پر انگریزوں کے بے مثال مظالم کی داستان فاش کرنی شروع کر دی۔ ۲۹-۱۹۲۰ء کی تحریک عدم تعاون کے دوران ۱۸۵۷ء کے برطانوی دہشت انگیزی کو جلیانوالہ باغ کے ساتھ مربوط کیا گیا تاکہ لوگ بیدار ہوکر ۱۸۵۷ء کے ہمارے آباواجداد کی نسبت زیادہ بہادری اور اتحاد کے ساتھ جدوجہد کریں۔ اس کے بعد ایڈورڈ تھامپسن کی تصنیف "دی ادر سائڈ آف دی میڈل" (The other side of the medal) شایع ہوئی جس میں یہ نظریہ پیش کرنے کی کوشش کی گئی کہ مظالم دونوں طرف سے ڈھائے گئے جنھیں بھول جانا ہی بہتر ہے۔

سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ کیا طرفین کو ایک ہی سطح پر رکھا جا سکتا ہے۔ کیا لوگوں کو غلام بنانے والوں کے جرائم کو مجاہدینِ آزادی کی غلطیوں اور زیادتیوں کے برابر سمجھا جا سکتا ہے؟ دونوں معاملے مختلف ہیں۔

برطانوی اخبارات ہندوستانیوں کی وحشیانہ خباثتوں اور مظالم کی داستانوں سے بھرے پڑے تھے اور یہ اس مہم کا جزو تھیں جو ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ برطانوی فوجی بھیجنے، اسبابِ بغاوت پر سنجیدہ بحث کو روکنے اور ہندوستانی مسئلے کے مناسب حل کو ڈھونڈنے کے لیے شروع کی گئی۔ اس نامعقول فضا میں مارکس نے اس مسئلے کو صحیح تاریخی رنگ میں پیش کیا۔

"انسان کی تاریخ میں مکافات بھی کوئی چیز ہے اور تاریخی مکافات کا یہ قاعدہ ہے کہ اس کا آلہ کار خود جابر کی طرف سے بیشتر آتا ہے نہ کہ مظلوم کی طرف سے۔ پہلی چوٹ جو فرانس کی شاہی حکومت پر پڑی وہ امرا کی طرف سے تھی نہ کہ دیہاتیوں کی طرف سے۔ ہندوستانی بغاوت کاشتکاروں کی طرف سے شروع نہیں ہوئی جنھیں انگریزوں نے شدید اذیت دی اور ننگا کر کے رکھ دیا بلکہ اُن سپاہیوں کی طرف سے جن کو ملبوس کیا گیا، کھلایا پلایا گیا، تھپکی دی گئی، موٹا تازہ کیا گیا اور لاڈ سے بگاڑا گیا۔

جس کی رو سے دہلی میں عورتوں اور بچوں کے قاتلوں کی زندہ چمڑی ادھیڑنے، جسم میں میخیں ٹھونک کر ہلاک کرنے اور آگ کی نذر کرنے کا اہتمام ہو۔ ایسے مظالم ڈھانے والوں کو صرف پھانسی دینا دیوانگی ہے۔ کاش! میں دنیا کے اس حصے میں ہوتا اور حسبِ ضرورت قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتا۔"[۹۸]

فوجی عدالت کے قوانین اور قواعد وضوابط کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ "جب افسر فوجی عدالت کی کارروائی میں شرکت کے لیے جاتے تو وہ سوگند کھاتے کہ وہ قیدیوں کو پھانسی دیں گے خواہ وہ قصوروار ہوں یا بے قصور۔ اگر کوئی شخص اس اندھا دھند انتقام کے خلاف دم مارنے کی جرأت کرتا تو اس کے غضب ناک ساتھی فوراً واویلا مچا کر اسے خاموش کر دیتے۔ جن اشخاص کو سرسری سماعت کے بعد موت کی سزا دی جاتی پھانسی سے پہلے جاہل پرائیوٹ (فوجی) ان کی ہنسی اڑاتے اور ان کو اذیت دیتے جب کہ تعلیم یافتہ افسر دیکھتے رہتے اور اظہارِ تحسین کرتے۔"[۹۹]

دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے جو کچھ کیا ایک مصیبت زدہ باغی راہنما نے اپنے بیان میں اس کی یوں تصویر کھینچی ہے:

"پھر عیسائیوں نے اعلیٰ عہدیداروں اور رئیسوں کو قتل کیا جو گردونواح اور بستیوں میں رہتے تھے۔ پھر انھوں نے اُن کی آراضی، جائداد، مکانات، محلات، مال و دولت، اسلحہ اور سامان، گھوڑے اور ہاتھی اور اونٹ اور اونٹنیاں، سب کچھ ضبط کر لیا۔ تب انھیں مع اہل و عیال و اطفال ہلاک کر دیا۔ اگرچہ وہ ان کی رعایا بن چکے تھے اور خوف اور امید کے سبب ان کی اطاعت قبول کر چکے تھے۔ پہلے انھوں نے جتنا بھی سونا چاندی قیدیوں کے قبضے میں تھا، لوٹ لیا۔ پھر بستر کی چادریں، کپڑے، تہبند اور پائجامے بھی چھین لیے۔ اس کے بعد انھیں اپنے افسروں کے پاس بھیج دیا جنھوں نے انھیں پھانسی یا گردن زدنی سے موت کی سزا دی۔ کیا جوان، کیا بیمار، کیا شریف کیا کمین، کوئی بھی ان ہلاکت خیزیوں سے نہ بچا۔ اس طرح ان لوگوں کی تعداد جن کے سر کاٹے گئے یا پھانسی دی گئی ہزاروں تک پہنچ گئی۔"[۱۰۰]

انگریز کے ہاتھوں دہلی کی غارت گری کے بارے میں لارڈ ایلفنسٹن نے سر جان لارنس کو یوں لکھا: "دہلی کا محاصرہ ختم ہونے کے بعد ہماری فوج نے جو ظلم و ستم ڈھایا وہ حد درجہ جگر خراش ہے۔ دوست اور دشمن کی تمیز کیے بغیر ہمہ گیر انتقام لیا جا رہا ہے۔ جہاں تک لوٹ مار کا تعلق ہے ہم نے یقیناً نادر شاہ کو بھی مات کر دیا ہے۔"[۱۰۱] قیصر التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ "دہلی میں پھانسی پانے والوں کی تعداد ستائیس ہزار تھی۔"[۱۰۲]

جن انگریز عورتوں کو نانا صاحب نے کانپور میں مقید رکھا ان کی بے حرمتی کی داستان بہت مشہور ہے۔ ۱۸۵۷ء کے سرکاری مورخین کے اور مالیسن نے خود اس کا بھانڈا پھوڑا ہے: "جور وستم کی نفاستیں، ناقابلِ بیان خباثت، جو اس وقت کے بعض رسائل کے مطابق المناک قتلِ عام کے ساتھ منسوب کی گئیں وہ کسی مشتعل تخیل کی من گھڑت کہانیاں تھیں جن پر بلا کسی تحقیق کے یقین کر لیا گیا اور جن کو بغیر سوچے سمجھے مشتہر کر دیا گیا۔ نہ تو کسی کے ہاتھ پاؤں کاٹے گئے اور نہ کسی کی بے حرمتی کی گئی۔ یہ ان سرکاری افسروں کا بیان ہے جنھوں نے جون اور جولائی کے قتلِ عام کے حالات کی انتہائی تن دہی کے ساتھ چھان بین کی ہے۔" ۹۵

دہلی کے بارے میں بھی جھوٹی خبریں اڑائی گئیں مثلاً یہ کہ انگریز خواتین کو سڑکوں پر برہنہ حالت میں چلنے پر مجبور کیا گیا۔ ان کی کھلم کھلا بے حرمتی کی گئی۔ ان کی چھاتیاں کاٹ دی گئیں بلکہ کمسن لڑکیوں کو بھی نہ چھوڑا گیا وغیرہ وغیرہ۔ گورے عیسائی پادری گلا پھاڑ پھاڑ کر ان کہانیوں کا ڈھنڈورا پیٹنے والے تھے۔ محکمۂ جاسوسی کے افسرِ اعلیٰ سر ولیم میور کی تحریری رپورٹ ہے کہ "خواہ کتنی ہی ستم رانی اور خونریزی ہوئی ہو، جہاں تک میرے مشاہدات اور تحقیقات کا تعلق ہے عورتوں کی بے حرمتی کی کہانیوں کا کوئی خاطر خواہ ثبوت نہیں ملا۔" ۹۶

جہاں ہندوستانیوں کی دہشت انگیزی کے قصے زیادہ تر فرضی تھے وہاں انگریزوں کی درندگی نے لارڈ کیننگ کو بھی پریشان کر دیا۔ ۲۴ دسمبر ۱۸۵۷ء کو گورنر جنرل کی کونسل کی کارروائی میں مندرجہ ذیل سرکاری یادداشت موجود ہے: "...... نہ صرف تمام قسم کے مجرموں کو بلا امتیاز پھانسیاں دی گئیں بلکہ ان کو بھی جن کے جرائم نہایت مشکوک تھے۔ دیہات کی لوٹ اور آتش زنی کے عام واقعات رونما ہوئے جس کے سبب گناہ گار اور بے گناہ دونوں نے بلا لحاظ عمر و جنس اندھا دھند سزا پائی اور بعض حالتوں میں جان بھی گنوائی۔ اس سے وہ بڑے بڑے فرقے بھی بگڑ گئے جو پہلے حکومت کے مخالف نہ تھے۔ کھیتی باڑی موقوف ہو گئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قحط کا خطرہ سر پر منڈلانے لگا۔ آخر کار سرکاری افسروں کی کارروائیاں اس افواہ کا موجب ہوئیں کہ حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کے قتلِ عام کا منصوبہ باندھ رہی ہے۔" ۹۷

۱۸۵۷ء کے دوران نازیوں کی سی جو ذہنیت برطانوی حلقوں میں پھیلی ہوئی تھی اُسے "غدر کے سورما" جنرل نکلسن کے الفاظ میں نہایت خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اپنے ایک دوست ایڈورڈس کو جس نے اس دور میں شہرت حاصل کی اس نے لکھا: "ایک ایسا قانون تجویز ہونا چاہیے

کیا ہے۔ آم کے درخت سولی کا کام دیتے تھے اور باقی تختۂ دار کا۔ اس جنگل کے انصاف کے شکار ہندسہ 8 کی شکل میں پھانسی کی رسی سے لٹکتے رہ جاتے گویا دل لگی کا سامان ہیں: ۱۰۶

انگریزوں کے مظالم اس حد تک پہنچ گئے کہ برطانیہ کی قومی زندگی میں حریت پسند عناصر کو خود برطانیہ کے خاص شہری حقوق کی فکر پڑ گئی۔ سر چارلس ڈلک نے "گریٹر برٹین" (Greater Britain) میں لکھا: "جو لوگ اس حقیقت پر شک کرتے ہیں کہ ہندوستانی فوجی ملازمت فوجیوں کو انسانی زندگیوں سے لاپروا، جائداد کے حقوق سے غافل اور انسانی شان کو خاک میں ملانے والے بنا دیتی ہے، اُن کو شاید وہ خطوط یاد نہیں جو انھیں ۱۸۵۷ء میں پہنچے۔ ایسے ایک خط میں ایک اعلیٰ فوجی افسر نے کانپور پر چڑھائی کے دوران یہ اطلاع بھیجی: "آج خوب شکار ہاتھ آیا۔ باغیوں کی صفائی کر دی!" اس بات کو ذہن میں رکھیں کہ جن نام نہاد باغیوں کو پھانسی دی گئی یا توپوں سے اُڑایا گیا انھوں نے ہتھیار نہیں اٹھائے تھے بلکہ دیہاتیوں کو شک میں پکڑ لیا گیا تھا۔ اس فوج کشی کے دوران دیہات کو نذرِ آتش اور بیگناہوں کا قتلِ عام کرتے وقت ایسے مظالم ڈھائے گئے جن پر خود محمد تغلق بھی شرمسار ہوتا۔ یہ کہنا کہ ایسے شرمناک اعمال کا سلسلہ ہماری گھریلو آزادیوں کے حق میں زہرِ قاتل ثابت نہ ہوگا، تاریخ کو جھٹلانا ہے۔" ۱۰۷ —

پنڈت نہرو نے نسلی برتری کے خبط کے مسئلے کو صحیح رنگ میں پیش کیا ہے۔ کیوں کہ ہمارے باغی آباواجداد کو بھی اس سے سابقہ پڑا اور بعد میں ہم بھی اپنی آزادی کی جدوجہد کے تمام عرصے میں اس سے دوچار رہے: "ہم ہندوستانی برطانوی حکومت کے آغاز سے ہی نسلی امتیاز کی تمام صورتوں سے آشنا ہیں۔ اس حکومت کا تمام تر نظریہ ہیرن واک اور آقائی نسل کا تصور تھا اور اسی پر حکومت کی بنیاد تھی۔ درحقیقت آقائی نسل کا تصور شہنشاہیت پرستی کی جبلت میں پایا جاتا ہے۔ اس پر مکروفریب کا کوئی پردہ نہیں تھا بلکہ حکمرانوں نے اس کا واضح زبان میں اعلان کیا۔ زبان کی نسبت ان کے عمل میں اس کا شدید تر اظہار تھا۔ نسل بہ نسل اور سال بہ سال ہندوستان کے ساتھ بحیثیت ایک قوم کے اور ہندوستانیوں کے ساتھ بطور افراد کے توہین، تذلیل اور حقارت کا سلوک روا رکھا گیا۔" ۱۰۸

ہندوستان میں بعض بلند رتبہ سیاستدان اور مورخ ایسے بھی ہیں جو ماضی کو بھول جانے کی تلقین کرتے ہیں اور یہ تاکید بھی کہ صدسالہ یادگار کے دوران میں ان مظالم کا ذکر نہیں چھیڑنا چاہیے۔ اس کا مطلب نہ صرف تاریخ سے آنکھیں موڑنا ہے بلکہ خود اپنی تاریخ اور تجربے سے

جو کچھ دہلی میں ہوا اس کو ایک ہم عصر انگریز نے یوں بیان کیا ہے: "میں نے دہلی کی گلیوں میں چلنا پھرنا ترک کر دیا ہے کیوں کہ کل جب ایک افسر اور میں خود بیس جوانوں کے ایک دستے کو گشت کے لیے باہر لے گئے تو ہم نے چودہ مردہ عورتوں کو دیکھا۔ ان کے شوہروں نے ان کے گلے کاٹ دیے تھے اور انھیں شالوں میں لپیٹ کر لٹا دیا تھا۔ ہم نے وہاں ایک آدمی کو پکڑا جس نے ہمیں بتایا کہ ان عورتوں کو اس ڈر سے قتل کیا گیا ہے کہ کہیں یہ انگریزوں کے چنگل میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ پھر اس نے ان کے خاوندوں کی لاشیں ہمیں دکھائیں جنھوں نے نیک ترین کام کیا اور بعد میں خودکشی کر لی۔"[۱۰۳]

"دی ہسٹری آف دی سیج آف دہلی" (The History of the Siege of Delhi) میں، جو ایک افسر کی تصنیف ہے جس نے محاذِ جنگ پر خدمت انجام دی تھی، تفصیل کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ انگریز افسروں نے انبالہ سے دہلی آتے ہوئے راستے میں کیا کچھ کیا: "قلیل مدت میں سیکڑوں ہندوستانیوں کو فوجی عدالت کے روبرو پھانسی کی سزا دی گئی۔ جب ان کے لیے پھانسی کی مچانیں نصب کی جا رہی تھیں تو انھیں انتہائی وحشیانہ اور ظالمانہ طریقوں سے اذیت دی گئی۔ ان کے سروں سے بالوں کے گچھے کے گچھے نوچے گئے۔ ان کے جسموں کو سنگینوں سے چھیدا گیا۔ پھر ان کو ایسا کام کرنے پر مجبور کیا گیا جس سے بچنے کے لیے وہ موت یا اذیت کی کوئی وقعت نہ سمجھتے تھے۔ غریب اور مسکین ہندو دیہاتیوں کے منہ میں برچھیوں اور سنگینوں کے ساتھ گائے کا گوشت ٹھونسا گیا۔"[۱۰۴]

لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریز فاتحین نے کس طرح فوجی اور غیر فوجی قصوروار اور بے قصور کو یکساں ذبح کیا ان میں سے ایک نے اسے یوں بیان کیا ہے: "لکھنؤ پر قبضہ کرنے کے وقت ــــ اندھا دھند قتلِ عام کا سماں ـــ کسی قسم کی تمیز روا نہ رکھی گئی۔ جو بدبخت ہماری فوج کے ہاتھ لگ جاتا اس کا کام تمام کر دیا جاتا۔ کوئی سپاہی ہو یا اودھ کا دیہاتی اس میں کوئی مضائقہ نہ تھا۔ اس سے کوئی سوال پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر اس کی چمڑی کالی ہوتی تو پھر کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ رسّی کا ایک ٹکڑا اور درخت کی شاخ یا دماغ میں سے گزرتی ہوئی بندوق کی ایک گولی بدبخت خبیث کی زندگی کو جلد ختم کر دیتی۔"[۱۰۵]

جو واقعات دیہات میں بنارس، الٰہ آباد اور کانپور کے درمیان اس علاقے پر جنرل نیل کی چڑھائی کے دوران رونما ہوئے انھیں کے اور مالیسن نے مذکورہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"رضاکار جلادوں کے گروہ ضلعوں میں گھومنے لگے اور اس موقعے پر شوقیہ جلادوں کی کمی نہ تھی۔ ایک بھلا مانس ڈینگ مار رہا تھا کہ اس نے ماہرِ فن کے انداز میں کتنے ہی افراد کا کام تمام

۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک حصے کے طبقاتی مفاد انگریزی حکومت کے خلاف قومی مفادات کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے اور انھوں نے قومی بغاوت میں سرگرم حصہ لیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان میں حقیقی معذوریاں اور سخت کوتاہیاں نہیں تھیں جن کے سبب قومی بغاوت نے بڑی زک اٹھائی لیکن جو اصلی پارٹ ایک طبقے نے فوجی بغاوت میں ادا کیا اس پر نکتہ چینی کو اس پارٹ کی قدر و قیمت کے اندازے کے ساتھ غلط ملط نہیں کرنا چاہیے

یہ کہنا صحیح نہیں کہ جاگیرداروں نے کبھی بھی تاریخ میں مطلق وطن پرست کا پارٹ ادا نہیں کیا۔ ہم روسی سیاستدانوں اور مورخوں کی مصلحت پسندی کو سراہتے ہیں جب وہ ان روسی جاگیردار جرنیلوں اور راہنماؤں کے حبِ وطن پر فخر کرتے ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں نپولین کا مقابلہ کیا۔ ہم پولینڈ کے لوگوں کی وطن کی آزادی کے حق میں اور اس کی تقسیم کے خلاف اس جدوجہد کی تعریف کرتے ہیں جس کی راہنمائی پولینڈ کے جاگیرداروں نے کی۔ ہم اٹلی کے لوگوں کی اپنی مادرِ وطن کی آزادی اور اس کے اتحاد کے لیے بہادرانہ اور مستقل جدوجہد کی بھی تعریف کرتے ہیں جس کی راہنمائی نہ صرف میزنی اور گیری بالڈی جیسے انقلابی جمہوریت پسندوں نے کی بلکہ جس میں کونٹ کیوور اور بادشاہ پیڈمونٹ نے بھی اپنا پارٹ ادا کیا۔ ہم دوسرے ملکوں کے جاگیرداروں کی وطن پرستی کے تو قائل ہیں لیکن اپنے ملک کے جاگیرداروں کی وطن دوستی کو تسلیم نہیں کرتے۔

صرف اس صورت میں کہ جب ہم باغی جاگیردار راہنماؤں کے قطعی وطن پرستانہ پارٹ کا اعتراف کریں تب ہی ہم ان کی قوتِ عمل اور شدید کمزوری کا تنقیدی جائزہ لے سکتے ہیں جو انھوں نے بغاوت کے اہتمام اور اس کی راہنمائی میں داخل کی۔ صرف ایسے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے ہی ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت اور بعد کی قومی ترقی کے دوران جاگیردار محبِ وطن کے پارٹ کو باقاعدہ طور پر سمجھنے کے قابل ہوں گے۔

اب ہم ایک بار پھر مثال کے طور پر اودھ کی اس تصویر کا جائزہ لیتے ہیں جو زیادہ تر ہم عصر برطانوی وقائع نگار چھوڑ گئے ہیں۔

رسل کے مندرجہ ذیل بیان سے بیگم اودھ، تعلقداروں، سپاہی دیہاتی مجاہدوں اور باغی سپاہیوں کے کارناموں اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوسرے دور کے ان کے باہمی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔

"خیال یہ ہے کہ فوجی سپاہیوں کی اکثریت لکھنؤ کے اندر ہی ہے لیکن وہ اس خوبی کے ساتھ جنگ نہیں کریں گے جیسا کہ اودھ کے توڑے دار بندوق چلانے والے جو اپنے نوجوان بادشاہ

کچھ سیکھنے سے انکار کرنا ہے۔

۱۸۵۷ء میں ہمارے آباؤ اجداد نے سختیاں جھیلیں اور اپنا خون بہایا۔ بعد کی پشتوں نے جدوجہد کو جاری رکھا اور ضروری قربانی کرتے رہے۔ آزادی کے بعد اگر ہم اپنے ماضی کے تجربات کو بھول جائیں اور برطانوی شہنشاہیت پرستی کو بجائے اپنے قدیم دشمن کے ایک نیا دوست سمجھنے لگیں تو ہم نہ تو ہندوستان کی آزادی کے تحفظ کے قابل ہوں گے اور نہ جدوجہد میں مصروف ایشیا اور افریقہ کی نوآبادیاتی قوموں کے تئیں ہندوستان کا فرض ادا کرسکیں گے۔

۵۔ ناکامی کیوں؟

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی ناکامی کے اسباب نے برطانوی اور ہندوستانی مورخین کو پریشان کر رکھا ہے۔ اولین برطانوی مورخین نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ بغاوت اس لیے ناکام ہوئی کہ باغی نہ تو اچھی طرح منظم تھے اور نہ ہی متحد۔ وہ کام کے فوجی راہنما پیدا نہ کرسکے۔ ہندوستانی مورخوں نے اس مسئلے پر زیادہ گہری نظر ڈالی ہے اور بغاوت کی ناکامی کو ہندوستانی باغی لیڈروں کی سیرت کے ساتھ وابستہ کیا ہے کیوں کہ وہ قدامت پرست اور جاگیردار تھے۔ اس وقت کے ہندوستانی راہنماؤں کی جائز نکتہ چینی کی بنا پر بعض ہندوستانی مورخ بغاوت کی قومی خصوصیت سے ہی انکار کرنے پر مائل ہیں بلکہ نظریاتی اور غیر تاریخی زبان میں باغی راہنماؤں پر تنقید کرتے ہیں۔

ڈاکٹر سین جنھوں نے حکومتِ ہند کے لیے ۱۸۵۷ء کی تازہ ترین سرکاری تاریخ لکھی ہے اور ڈاکٹر آر۔ سی مزمدار جنھیں یہی کام پہلے تفویض کیا گیا تھا لیکن بعد میں انھوں نے خود اپنی کتاب تصنیف کی، دونوں کم و بیش تاکید کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ باغی راہنماؤں میں کوئی بھی حبِ وطن کے خالص جذبے سے متاثر نہ تھا بلکہ خود غرضی غالب تھی۔

ہم پہلے یہ ثابت کرچکے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے آغاز میں برطانوی حکمران جن سیاسی اور معاشی پالیسیوں پر عمل کر رہے تھے وہ ایسی تھیں کہ چوٹی کے ہندوستانی حکمران سے مفلس ترین کسان اور دستکار تک ہندوستانیوں کا ہر فرقہ ان کی حکومت کا مخالف ہوگیا۔ ایسے حالات میں اگر ہندوستانی جاگیرداروں کا ایک طبقہ عوامی مسلح بغاوت میں شریک ہوگیا جس کا ہر لحاظ سے مسلمہ مقصد انگریزوں کو وطن سے نکالنا تھا تو واقعی انھوں نے ایک بے غرض محبِ وطن کا کام کیا۔ اس سے انکار کرنا تاریخی واقعیت پسندی کو ترک کرنا ہوگا اور خالص ذاتیت کے نقطۂ نظر کو اختیار کرنا ہوگا۔

کی تمام جائداد کا واحد مالک بنا دیا لیکن شروع سے ہی اس نے ہمارے ساتھ انتہائی نفرت کا اظہار کیا ہے۔ اس قسم کی دوسری مثالوں سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ زمینداروں اور راجاؤں کی بغاوت کا سبب ہماری حکومت اور ان کا ذاتی نقصان نہیں تھا۔"[11]

جو کچھ اوپر بیان کیا گیا ہے وہ داستان کا روشن پہلو ہے۔ دربارِ اودھ میں حکومت کے معاملات کی انجام دہی اور کہانی کے تاریک پہلو کو ایک فاضل وطن دوست اور عینی شاہد، جاگیردار عالم علامہ فضل حق نے بیان کیا ہے۔ ان کا بیان بغاوت کے آخری مرحلے کی داستان ہے جب باغی ہار رہے تھے اور انگریز جیت رہے تھے۔

"نواب کی سرکار کے تمام افسر اور ریاست کے وزیر نکمے، ڈرپوک، بزدل، احمق اور بے ایمان تھے۔ وہ نہ تو دانشمند تھے اور نہ ہی قابلِ اعتبار۔ ان میں اَن پڑھ، آرام طلب بدتمیز، غل غپاڑہ کرنے والے، کاہل اور کمزور لوگ شامل تھے۔ ان کے علاوہ ان میں خوشامدی، طفیلی اور چاپلوس بھی تھے۔ وہ اپنے عہدو پیمان توڑ دیتے اور ایمان کے عوض کفر قبول کرتے۔ وہ بگلے بھگتوں کا کام کرتے۔ عیسائیوں کی پاسداری شروع کردی، ان کے ساتھ مل گئے اور ان کی فتح حاصل کرنے میں مدد کی۔"[11]

مذکورہ بالا اقتباس میں صاف اور ناشائستہ زبان میں اس اخلاقی کمزوری کا بیان ہے جو ایک جاگیردار دربار اور راہنماؤں پر غالب تھی۔ بغاوت کے دوران اودھ کے جاگیردار راہنماؤں کی کارگزاری کا جائزہ لیتے ہوئے جو تصویر سامنے آتی ہے، حسب ذیل ہے: بغاوت کے پہلے مرحلے کے دوران تعلقدار اور زمیندار چند ایک کے سوا، بغاوت میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے مجموعی طور پر زیادہ سرگرم حصہ نہ لیا۔ وہ انتظار کر رہے تھے اور دیکھ رہے تھے کہ کون سا فریق فتح پاتا ہے۔ بغاوت کا دوسرا مرحلہ لارڈ کیننگ کے مارچ ۱۸۵۸ء کے اعلان کے ساتھ شروع ہوتا ہے جس کی رو سے سوائے چھ مخصوص تعلقداروں کے سب کی زمینیں ضبط کرلی گئیں۔ زمیندار متحد ہو کر بدل وجان عوامی بغاوت میں کود پڑے۔ لکھنؤ کی شکست کے بعد بغاوت کے تیسرے مرحلے کے دوران جوں جوں یہ زیادہ واضح ہوتا گیا کہ انگریز جیت رہے ہیں یہ جاگیردار راہنما تو ہی دشمن کے ساتھ صلح جوئی کرنے لگے اور یکے بعد دیگرے برطانوی حکمرانوں کی اطاعت قبول کرنے لگے بلکہ بادشاہ بیگم نے بھی جس نے اکثر محبِ وطن کا پارٹ ادا کیا تھا، اپنا وکیل برٹش ہائی کمانڈ کی خدمت میں بھیجا جب کہ خود اپنے باقی فوجیوں اور مددگاروں کے ساتھ نیپال کی طرف پسپا ہوگئی۔ جاگیرداروں کی وطن پرستی ریاکارانہ تھی۔

برجیس قدر کے ساتھ ہیں اور جنھیں بجا طور پر اپنے ملک اور بادشاہ کے وطن پرست مجاہدینِ جنگ کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ریذیڈنسی کے محاصرے کے دوران سپاہی کبھی کبھی ایسی دلیری کے ساتھ آگے نہ بڑھے جیسے زمیں دار رنگروٹ اور نرجیب بیگم بڑی ہمت اور قابلیت کا مظاہرہ کرتی ہے۔ اس نے تمام اہلِ اودھ کو مشتعل کر دیا ہے تاکہ وہ اس کے بیٹے کے مفادات کی حمایت کریں اور امرا نے اس کے ساتھ وفاداری کی سوگند کھائی ہے۔ بظاہر ہم اس کے حلالی ہونے پر باور نہیں کرتے لیکن زمیندار جو اصلیت سے بہتر واقف ہیں برجیس قدر کو بلا تامل قبول کرتے ہیں۔ کیا سرکار ان لوگوں کو باغی قرار دے گی یا معزز دشمن؟ بیگم ہمارے خلاف دائمی جنگ کا اعلان کرتی ہے۔ ان رانیوں اور بیگموں کی بلند ہمتی سے ظاہر ہے کہ وہ اپنے حرم میں حد درجہ دماغی استعداد واقعی حاصل کرتی ہیں۔ بہر حال وہ سازشوں میں ضرور ماہر ہیں۔ مردوں کے دلوں پر غلبہ کے لیے ان کی جد و جہد انھیں ذہین بنا دیتی ہے" ۱۰۹

لارڈ کیننگ نے بھی اس مسئلے پر بحث کی کہ آیا زمیندار اور تعلقدار صرف اپنے محدود طبقاتی مفاد سے متاثر تھے یا اس معاملے نے بڑھ کر قومی درد کا رنگ اختیار کیا اور قومی بغاوت کا سبب ہوا۔ سر جیمز اوٹرام کے جواب میں اس نے لکھا: "معلوم ہوتا ہے تم یہ خیال کرتے ہو کہ اودھ کے راجہ اور زمیندار اس لیے باغی ہوئے ہیں کہ انھیں ہماری لگان آراضی کی تشخیص سے ذاتی طور پر نقصان پہنچا ہے، لیکن گورنر جنرل کی رائے ہے کہ اس پر کافی غور و خوض کی ضرورت ہے۔ شاید ہی کوئی جاگیر دار اتنی کامل نفرت ظاہر کر سکتا تھا جتنی کہ چندا بھنجا اور گونڈا کے راجاؤں نے ظاہر کی۔ ان میں سے پہلے سے ہم نے ایک بھی گاؤں نہیں لیا۔ صرف یہی نہیں بلکہ اس کا خراج بھی کم کر دیا گیا تھا۔ دوسرے کے ساتھ بھی ایسا ہی فیاضانہ سلوک روا رکھا گیا۔ تیسرے کے چار سو دیہات میں صرف تین لے لیے گئے تھے اور راجہ کے عوض اس کے خراج میں دس ہزار روپے کی کمی کر دی گئی تھی۔

"حکمرانوں کی تبدیلی سے کسی کو نو پاڑہ کے نوجوان راجہ سے زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ جونہی انگریزی عملداری شروع ہوئی ہم نے اُسے دس ہزار گاؤں عطا کیے اور دوسرے تمام دعوی داروں کو نظر انداز کر کے اس کی ماں کو اس کا سرپرست مقرر کیا۔ لیکن شروع سے ہی لکھنؤ میں اس کی فوج ہمارے خلاف لڑ رہی ہے۔ راجہ دھرا نے بھی ان تبدیلیوں سے بے حد فائدہ اٹھایا لیکن اس کے اپنے آدمیوں نے ہی کپتان ہرسے پر حملہ کیا۔ اس کی بیوی کو گرفتار کر لیا اور اسے لکھنؤ بھیج کر جیل میں قید کر دیا۔

"ہم نے اشرف بخش خاں تعلقدار کو جو اپنے سابق آقا کے ہاتھوں جور و ستم سہتا تھا، فوراً اس

کے ساتھ کوچ کرنے سے روکتی۔ وہ راتیں سو کر اور دن بدمستی میں گزار دیتے۔ جب وہ جاگتے اور ہوش میں آتے تو حیران و پریشان ہوتے۔"[۱۱۳]

برطانوی مورخ، افسر اور جاسوس احمد اللہ کے اس حقیقت افروز بیان کی تصدیق کرتے ہیں۔

۱۶ مئی کے دن چونی لال نے اپنے روزنامچہ میں یہ قلم بند کیا کہ احسن اللہ کا انگریزوں کے نام ایک خط باغی سپاہیوں کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ انگریز شہر کا محاصرہ کیے ہوئے تھے۔ اس خط میں سپاہیوں کو ملعون ٹھہرایا گیا اور دہلی پر قبضہ کرنے کے لیے انگریزوں کی مدد کا وعدہ کیا گیا بشرطیکہ وہ زینت محل کے بطن سے بہادر شاہ کے بیٹے مرزا جواں بخت کو ولیعہد تسلیم کرنا منظور کریں۔ سپاہی غضب ناک ہو کر محل کے گرد جمع ہو گئے۔ تند و تیز زبان استعمال کی گئی اور سخت غل غپاڑہ مچایا۔ بادشاہ کی وفاداری کی ضمانت کے طور پر، انھوں نے احمد اللہ کے سر اور زینت محل کی حراست کا مطالبہ کیا۔

گریتھڈ نے جو لیفٹنٹ گورنر شمال مغربی صوبجات کے پولیٹکل ایجنٹ کی حیثیت میں دہلی فیلڈ فورسز (Delhi Field forces) کے ساتھ وابستہ تھا اپنے ایک خط مورخہ ۲۳ اگست میں لکھا:

"بادشاہ کی چہیتی بیگم، زینت محل، جن کی ایک اہم سیاسی اہمیت تھی، کی طرف سے ایک قاصد آیا۔ اس نے بادشاہ پر اپنا اثر ڈالنے کی پیش کش کی تاکہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔"[۱۱۳]
۱۹ اگست کو پھر گریتھڈ نے لکھا: "شہزادوں سے مجھے خطوط ملنے شروع ہو گئے ہیں۔ وہ اعلان کرتے ہیں کہ ہمیں تمھارے ساتھ ہمیشہ دلبستگی رہی ہے اور ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی کیا خدمت کر سکتے ہیں۔"[۱۱۴] مورخہ ۶ اگست کے اپنے ایک خط میں گریتھڈ نے سر ولیم میور کو اطلاع دی کہ "ملکات کو بادشاہ کی طرف سے ایک خط ملا ہے جس میں اس نے اس کی مزاج پرسی کی ہے۔ یہ راہ و رسم پیدا کرنے کا جاگیر دارانہ شائستہ طریقہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ"

تمام شہادت فراہم کرنے کے بعد ڈاکٹر سین دربار کے اندر کی غدار منڈلی کی پیش کش کے بارے میں اس نتیجہ پر پہنچتا ہے: "تدبیر سادہ تھی۔ اگر برطانوی حکام بادشاہ کی سابقہ پنشن اور حقوق خصوصی کی ذمہ داری قبول کر لیں اور جنگ سے پہلے کی حالت بحال کر دیں تو اس کے طرف دار لکڑی کے پل کو تباہ کرنے، رسالہ کو اپنے ساتھ ملانے، ان کی مدد سے پیادہ فوج کو مغلوب

جب انقلاب کی لہر عروج پر تھی تو وہ بڑھتے ہوئے عوامی دباؤ سے متاثر ہوئے اور غیر ملکی حکومت سے عام قومی منافرت میں شریک ہو کر انھوں نے قطعی وطن پرستانہ پارٹ ادا کیا۔ لیکن جب وہی لہر اترنے لگی اور عوام کی انقلابی قوتوں میں انتشار پیدا ہونے لگا تو جاگیردار طبقے کی اصلی اخلاقی کمزوری ظاہر ہو گئی۔ انھوں نے بزدلوں یا غداروں کا کام کیا۔ طبقے کی حیثیت سے جاگیرداروں نے دُہرا پارٹ ادا کیا جو نہ تو خالص وطن پرستی کا تھا اور نہ یکسر خود غرضی اور غداری کا۔

جس طرح رانی جھانسی، کنور سنگھ، تانتیا ٹوپے اور مولوی احمد اللہ جاگیردار محبانِ وطن شجاعت، دلاوری اور وفاداری کے پُتلے تھے اسی طرح زوال پذیر جاگیردارانہ نظام کی تمام کمزوریاں مثلاً خود غرضی، بزدلی اور غداری دہلی کے جاگیردار راہنماؤں میں نمایاں تھیں۔

یہ علامہ فضل حق کے بیان سے بہ خوبی ظاہر ہے جس کا شہنشاہ اور اس کے دربار سے گہرا تعلق تھا۔ اس کی قدرے تفصیل قابلِ ذکر ہے۔

"اس (بہادر شاہ) کا ایک اپنا وزیر (حکیم احسن اللہ) تھا اور عملہ بھی۔ وہ کافی بوڑھا اور ناتجربہ کار تھا لیکن اپنی بیگم (زینت محل) اور وزیر کے اشاروں پر چلتا تھا۔ وزیر مذکور حاکم اعلیٰ تھا اور درحقیقت عیسائیوں کا دوست تھا اور ان سے بے حد محبت رکھتا تھا اور ان کے مخالفوں کا سخت دشمن تھا۔ شہنشاہ کے خاندان کے بعض افراد کا بھی یہی حال تھا۔ کچھ تو اس کے مقرب تھے اور اس کے تخت کے نزدیک اور اس کے معتمد تھے۔

"وہ خود اپنی رائے سے کوئی احکام جاری نہ کرتا اور بھلائی اور بُرائی میں تمیز نہ کر سکتا۔ وہ بظاہر یا خفیہ طور پر کسی چیز کا فیصلہ نہ کر سکتا اور نہ ہی کسی کے ساتھ برائی یا بھلائی کرنے کے قابل تھا۔

"بہادر شاہ نے اپنے بعض بیٹوں اور پوتوں کو فوج کے افسر مقرر کیا لیکن وہ احمق، بے ایمان اور بزدل تھے۔ وہ دیانتدار اور دانشمند اشخاص سے نفرت کرتے۔ انھوں نے کبھی معرکہ آرائی نہ دیکھی تھی اور نہ ہی انھیں تلواروں اور نیزوں کی ضرب کا کوئی تجربہ تھا۔ وہ اپنی صحبت اور صلاح مشورے کے لیے تچے شہدے آدمیوں کا انتخاب کرتے۔ یہ ناتجربہ کار لوگ عیش و عشرت میں محو اور حرام کاری کے سیلاب میں غرق تھے۔ وہ افلاس زدہ تھے جو اچانک دولت مند ہو گئے تھے۔ جب امیر ہو گئے تو عیاشی کی زندگی بسر کرنے لگے۔ فوج کو رسد بہم پہنچانے کے بہانے سے انھوں نے بڑی بڑی رقمیں لوگوں سے اینٹھ لیں۔ جو کچھ لوگوں سے حاصل کیا وہ خود ہڑپ کر گئے۔ مشہور رنڈیاں ان کو باغی فوجوں کی راہنمائی سے غافل کر دیتیں اور داشتاؤں کے ساتھ ان کی صحبت ان کو رات کے وقت فوج

حکمران تھا۔ سر تھامس منرو نے گورنر جنرل کے نام ایک خط میں اس نظام کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: "اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ہر ریاست کی سرکار کو کمزور اور سخت گیر بناتا ہے، سماج کے اعلیٰ طبقات میں جذبۂ غیرت کو مٹاتا ہے اور تمام قوم کو خوار اور کنگال کر دیتا ہے۔ ہندوستان میں ناقص حکومت کا عام علاج محل کے اندر خاموش انقلاب یا خونریز بغاوت یا غیر ملکی فتح ہے لیکن انگریزی فوج کی موجودگی علاج کے ہر امکان کو ختم کر دیتی ہے کیوں کہ یہ فوج والیِ ریاست کی گدی کو ہر بیرونی اور اندرونی دشمن سے محفوظ رکھتی ہے۔"[۱۱۹]

اب ہم کسی قدر ٹھوس طریقے سے اور خود برطانوی مصنفین کے بیانات سے اس بات کی تحقیق کرتے ہیں کہ والیانِ ریاست نے کس طرح ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران انگریزوں کو بچایا۔

حیدر آباد جنوبی ہند کا دروازہ تھا لیکن نظام عملی طور سے انگریز غاصبوں کے ساتھ تھا۔ نارٹن نے تسلیم کیا: "اگر حیدر آباد باغی ہو جاتا تو ہم لگ بھگ سارے دکن اور جنوبی ہندوستان میں بغاوت سے نہ بچ سکتے تھے۔"[۱۲۰]

والیانِ راجستھان نے جو خاندانی نجابت اور شاندار فوجی روایات کا دعویٰ کرتے تھے، قومی بغاوت کو دبانے کے لیے اپنے فوجی دستے انگریزوں کے حوالے کر دیے۔ انھوں نے اپنی رعایا کی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا اور باقی ہندوستان کی امیدوں پر بھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد میں شامل ہوں گے۔ مالیسن کا بیان ہے کہ "اگر راجپوتانہ باغی ہو جاتا تو یہ سمجھنا مشکل ہے کہ آگرہ کس طرح مقابلے پر ڈٹا رہتا اور دہلی کے محاذ پر کس طرح ہماری فوج کے پاؤں جمے رہتے۔"[۱۲۱]

وسطی ہندوستان میں گوالیار کو نہایت اہم مقام حاصل تھا۔ راجہ سندھیا پر عوام کا بڑا دباؤ پڑا لیکن اس نے اس کی مزاحمت کی۔ "ریڈ پمفلٹ" (Red Pamphlet) کا گمنام مصنف لکھتا ہے: "اگر سندھیا اپنے بے تاب فوجیوں کی قیادت کرتا اور اپنے قابل اعتماد مرہٹوں کو ساتھ لے کر میدانِ کارزار کی طرف کوچ کر دیتا تو ہمارے لیے نہایت تباہ کن نتائج پیدا ہوتے۔ وہ کم از کم بیس ہزار فوجی ہمارے محاذ کے غیر محفوظ مقامات پر لے آتا۔ آگرہ اور لکھنؤ فوراً ہاتھ سے نکل جاتے ہیولاک الہ آباد میں گھر کر رہ جاتا۔ یا تو وہ قلعہ محصور ہو جاتا یا باغی اس سے کنارہ کشی کر کے بنارس کے راستے سے کلکتہ کی طرف کوچ کرتے۔ وہاں ان کو روکنے کے لیے کوئی فوجی دستے نہ تھے اور نہ ہی کوئی قلعہ بندیاں تھیں۔"[۱۲۲] انس کا بیان ہے کہ "سندھیا کی وفاداری نے ہندوستان کو ہمارے لیے بچا لیا۔"[۱۲۳]

کرنے اور انگریزوں کو شہر کے اندر داخل کرنے کی تدبیر کریں گے لیکن انگریزوں کی فوجی حالت بہت بہتر ہوگئی تھی اس لیے انھوں نے ان تجاویز پر توجہ دینے سے انکار کر دیا۔[۱۵]

اعلیٰ حلقوں کی ان ہمہ گیر غدارانہ سرگرمیوں کا اثر باقی آبادی پر یہ پڑا کہ ان میں افراتفری پیدا ہوگئی اور پست ہمتی پھیلنے لگی۔ اس سے باغی سپاہیوں کی بلند حوصلگی کو سخت دھکا لگا۔ انگریز افسر اس صورتِ حال سے باخبر تھے۔ "باغی سپاہیوں کا اپنے راہنماؤں پر اعتماد جاتا رہا اور باغی سپاہی پریشانی اور ہچکچاہٹ کے ساتھ ہم سے دوچار ہوتے ...."[۱۶]

اوپر ہم نے ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک طبقے کی کارگزاری کی وضاحت کی ہے یعنی وراثت سے محروم اور بے دخل کیے گئے طبقے کی۔ جاگیرداروں کا ایک اور طبقہ تھا جو کم اہم نہیں تھا یہ ہندوستان کے والیانِ ریاست تھے۔ انگریز دشمنی کا جذبہ اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ تمام ہندوستانی درباروں میں بھی سرایت کر گیا تھا۔ ہر دربار میں ایک منظم منڈلی تھی جو قومی بغاوت کو عملی امداد دینے کی حامی تھی۔ بقول ساورکر بیشتر والیانِ ریاست نے "مشکوک پارٹ ادا کیا۔"[۱۷] انس اسے "عدم مزاحمت"[۱۸] کا نام دیتا ہے یعنی انھوں نے انگریزوں کے تئیں رسمی وفاداری کا وطیرہ اختیار کیے رکھا اور جب انگریزوں نے ان کی ریاست سے روپیہ اور مسلح فوج کی امداد حاصل کی تو وہ خاموش رہے گویا رضامند ہیں لیکن درحقیقت یہ موقع محل کا جائزہ لینے میں مصروف تھے۔ والیانِ ریاست کے ایک اہم طبقے نے البتہ شروع سے ہی عملی طور پر دل و جان سے انگریزوں کا ساتھ دیا۔ جوں ہی انقلاب کا پانسہ پلٹا سبھی نے انگریزوں کے تئیں وفاداری کے اظہار میں جلدی کی۔

بغاوت پھوٹنے کے بعد برطانوی سرکار کو والیانِ ریاست کی وفاداری کا یقین نہ تھا اس لیے انھوں نے ان پر نگرانی کی نگاہ رکھی۔ ریذیڈنٹوں نے ان کی عملی امداد حاصل کرنے یا کم سے کم ان کو بے حرکت رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ باغی بے تابی کے ساتھ منتظر تھے کہ والیانِ ریاست مع اپنی رعایا کے ان کے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ تدبیر جنگ میں ان کا اہم مقام تھا اور اس جدوجہد کے حشر کا فیصلہ کرنے میں ان کا پارٹ قطعی اہمیت رکھتا تھا۔

کون سی چیز تھی جس نے والیانِ ریاست کو قوم کا ساتھ دینے سے عاری کر کے رکھ دیا اور ملک کی زندگی میں اس نازک گھڑی کے موقعے پر انھیں برطانوی اقتدار سے چپٹائے رکھا؟ اس کا جواب ان مضر معاہدات معاونت میں ہے جس کے شکار وہ پہلے ہی ہو چکے تھے۔ ان معاہدات کی رو سے ہر ریاست میں کمپنی کے فوجی دستے تعینات تھے اور برطانوی ریذیڈنٹ یا ایجنٹ ہی اصلی

البتہ دیسی ریاستوں کے عوام ابھی جاگیرداروں کے سیاسی اثر و رسوخ کے تحت تھے اور والیِ ریاست کی راہنمائی کے منتظر تھے۔ اس طرح والیانِ ریاست اپنے ماتحت لوگوں کی بیزاری کو دبا سکتے تھے اگرچہ یہ کبھی کبھی مقامی شورشوں کی صورت میں پھوٹ پڑتی تھی جنھیں آسانی کے ساتھ دبا دیا جاتا۔ اس طرح ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران ہندوستان کے والیانِ ریاست نے برطانوی راج کو بچالیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مورخین کے ایک طبقے نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ یہ کوئی قومی بغاوت نہ تھی کیوں کہ سارا ہندوستان اس میں شریک نہیں ہوا تھا اور ایک خاص علاقے کے اندر یہ محدود تھی۔ اب ہم مسلمہ حقائق کو ملاحظہ کرتے ہیں:

شمالی ہندوستان کا بیشتر حصہ اس وسیع علاقے میں شامل تھا جہاں بغاوت رونما ہوئی یعنی دہلی، اودھ، روہیلکھنڈ۔ بندھیلکھنڈ، آگرہ پر مشتمل شمال مغربی صوبجات اور بہار کا بہت سا حصہ۔ فیجٹ کا بیان ہے: "یہ یاد رکھنا چاہیے کہ بغاوت زدہ اضلاع فرانس، آسٹریا اور پرشیا کے مجموعی رقبے کے برابر تھے اور آبادی میں ان سے بھی زیادہ۔

بغاوت کی وسعت اور کمال عروج کا کچھ اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ اس وقت بنگالی فوج کے عملہ میں باقاعدہ شامل رسالے کی ہر رجمنٹ بے قاعدہ رسالے کی اٹھارہ میں سے دس رجمنٹیں اور فوج پیادہ کی چوہتر میں سے تریسٹھ رجمنٹیں فردِ ملازمین سے قطعاً اور کلیتہً غایب ہوگئیں۔"[۱۲۸]

بغاوت کے اس خطے سے باہر وسیع علاقے میں یعنی پنجاب، راجپوتانہ، مہاراشٹر، حیدرآباد، بہار کے قبائلی علاقوں اور بنگال میں سپاہیوں کے غدر، مقامی بغاوتیں اور انگریزوں کے خلاف سرگرم سازشیں بپا ہوئیں۔

برطانوی غلبے کے خلاف ہندوستانی جدوجہد کے تاریخی تصوّر میں جس بات پر زور دینے کی ضرورت ہے وہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی حدبندی اور تنگی نہیں ہے بلکہ اس کی تندی و تیزی، وسعت اور گہرائی ہے۔ سرزمینِ ہند پر انگریزوں کے خلاف لڑی گئی تمام سابقہ جنگوں سے ۱۸۵۷ء کی بغاوت نمایاں طور پر الگ حیثیت رکھتی ہے۔

پہلی خصوصیت اس علاقے کی وسعت ہے جس میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پھیلی اور اس سے وسیع تر وہ ہمدردی اور اتحادِ عمل ہے جو اسے حاصل ہوا۔ تمام برطانوی اور ہندوستانی مورخ اور وقائع نگار یکساں طور پر اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ہندوستان

پٹیالہ اور جھیند کے راجاؤں اور کرنال کے نواب نے اپنے تمام وسائل انگریزوں کے حوالے کردیے اور اپنے رنگروٹوں کے ساتھ انگریزوں کے بڑے اڈے انبالہ سے دہلی تک سڑک کو کھلا رکھنے کا کام سنبھال لیا۔ اس طرح پنجاب سے باغی پایۂ تخت کے انگریز محاصرین کو کمک پہنچنا ممکن ہوگیا۔

اخباری اطلاعات پڑھنے کے بعد مارکس نے اپنے روزنامچہ میں قلمبند کیا: "سندھیا انگریز کتوں کا وفادار ہے! لیکن اس کے فوجی نہیں۔ راجہ پٹیالہ پر تُف! وہ فوجیوں کے بڑے بڑے دستے انگریزوں کو کمک کے طور پر بھیج رہا ہے!"[۱۲۴]

البتہ نئی انقلابی ذہنیت دیسی ریاستوں میں سرایت کرچکی تھی۔ بالخصوص ان کے فوجیوں میں جنھوں نے عملی طور پر باقی ہندوستان کے سپاہی بھائیوں کی مثال کی پیروی کی۔ مہاراجہ اندور کے فوجیوں نے بغاوت کردی اور انگریزوں کو ریاست سے نکل جانے پر مجبور کردیا۔ انتہائی ڈرامائی واقعہ اس وقت رونما ہوا جب رانی جھانسی اور تانتیا ٹوپے گوالیار پہنچے۔ سندھیا کے فوجی ان سے مل گئے اور سندھیا اپنے مٹھی بھر وفادار پیروؤں کے ساتھ بچ کر آگرہ کے برطانوی قلعے کی جانب بھاگ گیا۔ مہارانا اودے پور کے فوجی جو آگرہ کی حفاظت کے لیے بلوائے گئے تھے، معلوم ہوا کہ وہ "سازباز کا شکار ہوئے ہیں۔"[۱۲۵] جے پور کے فوجیوں کو "متھرا اور گوڑگاؤں میں امن و امان بحال کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ انھوں نے فرنگی پناہ گیروں کی حفاظت کرنے پر تو رضامندی کا اعلان کیا لیکن جارحانہ جنگ کرنے سے انکار کردیا۔"[۱۲۶] رسالہ بھوپال نے اسی قصے کو دہرایا۔ "کوٹاہ کنٹنجنٹ نے جسے آگرے کی حفاظت کے لیے بلایا گیا تھا بغاوت کردی۔ بھرت پور رسالہ فرار ہوگیا اور کرولی کے جوان نمک حرام ثابت ہوئے۔"

جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے اس سے مالیسن اس نتیجہ پر پہنچا: "یہ صاف طور پر ثابت ہوگیا ہے کہ جب اہل مشرق کا مذہبی جنون ابھرتا ہے تو پھر ان کا راجہ بھی جسے وہ باپ کا درجہ دیتے ہیں اور بعض اُسے خدا کہہ کر خوش ہوتے ہیں، وہ بھی انھیں اپنے اعتقادات سے منحرف نہیں کرسکتا۔"[۱۲۷] جسے انگریز شہنشاہیت پرست مورخ مذہبی کٹرپن قرار دیتا ہے۔ وہ ایک نئے شعور کا آغاز، انگریز دشمنی کا قومی جذبہ، اور روایتی جاگیردارانہ وفاداریوں کا خاتمہ تھا۔ ان کا راجہ اب ان کا "باپ" نہ رہا اور نہ ان کا خدا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے دوران جب والیانِ ریاست انگریزوں کے تئیں وفاداری کا وعدہ کر رہے تھے ان کے فوجی ان سے منہ موڑ لیتے اور اپنے ملک سے اپنی وفاداری کا ثبوت دیتے۔

کرنے میں انگریز کامیاب ہو گئے۔ مرہٹوں میں پیشواؤں کے وارث نے بغاوت کی لیکن مرہٹے راجے جنوب میں نظام کے ساتھ اور شمال میں مغلوں کے ساتھ ذاتی رقابتیں اور دیرینہ عداوتیں رکھتے تھے۔ راجپوتانہ کے راجاؤں کے دلوں میں پہلے مغلوں کے اور بعد میں مرہٹوں کے غلبہ کی گذشتہ تلخ یادیں تھیں۔ اس کے علاوہ اب وہ انگریزوں کے چنگل میں تھے۔

ہمارے جاگیرداروں کے نفاق سے متعلق ماضی کی تاریخی یادوں نے ملک کے بیشتر حصّوں کے لوگوں کو پست کر دیا اور ہندوستانی والیانِ ریاست نے جاگیردارانہ ذاتی عناد کے زیرِ اثر انگریز غاصبین کی مدد کی نہرو نے بحث کے ماحصل کو اختصار کے ساتھ یوں بیان کیا ہے۔ "بغاوت نے انگریزوں کی حکومت کے انجر پنجر ڈھیلے کر دیے اور بالآخر اسے ہندوستانیوں کی مدد سے دبایا گیا۔"[130]

جس طرح یہ ایک حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت برطانوی حکومت کے خلاف سب سے بڑی قومی شورش تھی اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کو ہندوستانیوں کے خلاف لڑا کر اسے دبانے کے قابل ہوئے۔ "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" انگریزوں کی روایتی پالیسی تھی اور انھوں نے ۱۸۵۷ء کے دوران اس سے تباہ کن اثر کے ساتھ کام لیا۔ فچٹ بغلیں بجاتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے "یہ ساری داستان برطانوی قوم کی شہنشاہی ذکاوت کا کیا خوب مظاہرہ ہے۔ بقول ہاڈسن، جو خود اس شاندار ڈرامے میں نہایت ممتاز اداکار تھا " وہ قوم جس نے پنجاب جیسے بڑے ملک کو ہندوستانی (پوربیا) فوج کے ساتھ فتح کیا! پھر مفتوح سکھوں کی قوت کو اسی فوج کو مغلوب کرنے میں استعمال کیا جس نے انھیں رام کیا تھا۔ جس نے پشاور پر برسوں لڑ کر قبضہ جمائے رکھا حالاں کہ افغان قبیلوں نے سخت مزاحمت کی تھی۔ پھر جب وہ ان رجمنٹوں سے اچانک محروم ہو گئے جنھوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا اور انھوں نے بغاوت کر دی تو انھیں بے ہتھیار کرنے اور دبانے میں بلا تامل انھیں قبیلوں سے کام لیا۔ وہ قوم جو اتنا کچھ کر سکتی ہے بے شک اس کی قسمت میں دنیا پر حکومت کرنا لکھا ہے!"[131]

النس اس حقیقت کو زیادہ مدبرانہ زبان میں پیش کرتا ہے اور اس حکمتِ عملی کو بیان کرتا ہے جس کے ساتھ برطانوی سیاستدانوں نے ۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستانی زندگی کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ "صرف ہماری موجودگی ہی قدیم ہلاکت خیز جنگوں اور ان کے ساتھ وابستہ ہولناکیوں سے تحفظ کی ضمانت تھی۔ ان ہولناکیوں کی روایتیں اور یادیں ابھی تازہ تھیں۔"[132]

اس سوال کو پیش کرنا ضروری ہے کہ انگریز ہندوستانیوں کے نفاق سے کیوں کر فائدہ اٹھا سکے؟ اس کا جواب ہندوستان میں بحیثیت مجموعی اور مختلف سماجی طبقات کے سیاسی

میں انگریزوں کے خلاف مسلح جدوجہد میں عظیم ترین متحدہ محاذ تھا جو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس کے علاوہ اس جنگ اور برطانیہ کے خلاف دوسری جنگوں میں ماہیتی فرق ہے۔ سابقہ جنگوں میں ایک قلمرو کے لوگ جو اکثر ایک ہی قوم کے ہوتے تھے تن تنہا لڑتے تھے۔ مثلاً بنگالیوں نے پلاسی کی لڑائی اکیلے ہی لڑی یہی حال کرناٹک، مرہٹہ، سکھ اور سندھ کی جنگوں کا تھا۔ وسیع تر متحدہ محاذ کی ابتدائی کوششیں ناکام ہوگئی تھیں لیکن ۱۸۵۷ء کے دوران مختلف ذاتوں، قبیلوں، قوموں اور مذہبوں کے لوگوں نے جو الگ الگ عملداریوں میں رہتے تھے مل کر بغاوت کی تاکہ برطانوی راج کو ختم کیا جائے۔ یہ ہندوستانیوں کا بے نظیر اتحاد تھا۔ اپنے زمانے کے سب سے زیادہ دور اندیش مفکر مارکس نے اس نئی حقیقت پر یوں روشنی ڈالی ہے۔

"اس سے پہلے ہندوستانی فوج میں کئی بار غدر ہوا لیکن یہ بغاوت مخصوص اور مہلک کیفیتوں کے سبب امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب فوجی رجمنٹوں نے اپنے فرنگی افسروں کو قتل کیا ہے۔ ہندو اور مسلمان اپنی باہمی کدورتوں کو ترک کر کے اپنے آقاؤں کے خلاف متحد ہوئے ہیں۔ جن ہنگاموں کی ابتدا ہندوؤں سے ہوئی ان کا عملی انجام یہ ہوا کہ ایک مسلمان شہنشاہ کو دہلی کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔ بغاوت صرف چند علاقوں تک محدود نہیں رہی"[۱۲۹]

جس طرح ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے مذکورہ بالا مثبت پہلو پر زور دینا ضروری ہے اسی طرح یکساں طور پر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے منفی پہلو کو بیان کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ کون کون سے فیصلہ کن علاقے اور ہندوستانیوں کے طبقے تھے جو قومی بغاوت میں شریک نہ ہوئے اور کس طرح بعضوں کو برطانوی فریق کی حمایت پر اکسایا گیا۔ اس میں متعدد اسباب کو دخل تھا لیکن ہم صرف سب سے بڑے یعنی قومی پہلو کا مطالعہ کریں گے۔

گورکھوں اور سکھوں نے انگریزوں کے طرفدار ہو کر فیصلہ کن پارٹ ادا کیا۔ انگریزوں نے نیپال کی جنگ ہندوستانی فوج کی مدد سے لڑی تھی۔ رانا جنگ بہادر نیپال کو رانا شاہی کے مرکزی نظام حکومت کے تحت لا رہا تھا۔ انگریزوں نے اُسے ایک مستقل امدادی رقم اور ترائی کے وسیع علاقے دینے کا وعدہ کیا۔ وہ انتقام کی آڑ میں اودھ کو فتح کرنے کے لیے گورکھا فوج کو نیچے لے آیا۔

مغلوں سے متعلق سکھوں کی تلخ تاریخی یادیں ابھی تازہ تھیں۔ تھوڑے سے ابتدائی تامل کے بعد خالصہ فوج کے بیکار فوجیوں اور سکھ راجاؤں اور سرداروں کے نوکروں چاکروں کو بھرتی

۶۔ جاگیرداری کی بحالی

باغیوں کا مقصد کیا تھا؟ وہ کس قسم کا سیاسی اور سماجی نظام ہندوستان میں قائم کرنا چاہتے تھے؟ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے صحیح جائزے کا مدار مذکورہ بالا سوال کے صحیح جواب پر ہے۔ اس سے یہ فیصلہ کرنے میں مدد ملے گی کہ آیا یہ بغاوت رجعت پسندانہ تھی یا ترقی پسندانہ؟

یہ حیرت کا مقام ہے کہ اس سوال پر نہ صرف برطانوی اور بعض بلند رتبہ ہندوستانی مورخین میں اتفاقِ رائے ہے بلکہ کچھ صفِ اوّل کے ہندوستانی سیاسی راہنماؤں میں بھی۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی رائے اس طرح پیش کی ہے: "اصل میں یہ جاگیرداروں کی شورش تھی۔ جاگیردار سرداروں نے اور ان کے پیروؤں نے اس کی قیادت کی۔ دور دور تک پھیلے ہوئے انگریز دشمنی کے جذبے نے اس کی مدد کی۔۔۔۔ ہاری ہوئی بازی یعنی نظام جاگیرداری کے لیے جدوجہد کرنے سے آزادی حاصل نہ ہو گی۔"[۱۳۴]

ڈاکٹر موزمدار اس نتیجے پر پہنچتا ہے: "۱۸۵۷-۵۸ء کی خونریزی اور مصائب ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا پیش خیمہ نہیں تھے بلکہ زمانۂ وسطیٰ کے فرسودہ طبقۂ امرا اور مرکز گریز نظامِ جاگیرداری کے نزع کا درد و کرب تھا۔"[۱۳۵]

سرکاری مورّخ ڈاکٹر سین وزیرِ اعظم کے نقطۂ نظر کی اصلاح اور مزید وضاحت پیش کرتا ہے: "برطانوی حکومت نے نادیدہ طور پر ایک سماجی انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ انھوں نے عورتوں کی بعض مجبوریاں رفع کر دی تھیں۔ انھوں نے قانون کی نگاہ میں انسانوں کی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی تھی۔ انھوں نے کسان اور نیم غلام مزدوروں کی حالت سنوارنے کی کوشش کی تھی۔ بغاوت کے راہنما اگر جیتتے تو رجعت پسندانہ اقدام کر کے وہ نئی اصلاحات پر پانی پھیر دیتے۔ نئے نظام کو ختم کر دیتے اور پچھلے دنوں کی یاد تازہ کرتے جب ایک عام آدمی امیر کے مقابلے میں یکساں انصاف کی توقع نہ کر سکتا تھا۔ جب اسامی تعلقدار کے رحم و کرم پر تھا اور جب چوری کی سزا میں ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جاتے تھے۔ غرضیکہ وہ انقلاب کے پہیے کو الٹا چلانا چاہتے تھے۔"[۱۳۶]

اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانوی حکومت اگرچہ غیر ملکی تھی ایک سماجی انقلاب پیدا کر رہی تھی اور ۱۸۵۷ء کے راہنما اگرچہ وہ آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کر رہے تھے درحقیقت

شعور پر منحصر ہے۔

کسان انگریز کا مخالف تھا لیکن اس کی نظر گاؤں تک محدود تھی۔ اس کی سیاسی واقفیت اس ریاست کے معاملات سے آگے نہ بڑھتی جس میں وہ روایتی راجہ کے تحت رہتا تھا۔

ملک کی سیاسی اور نظریاتی رہنمائی ابھی جاگیردار حکمران طبقات کے ہاتھ میں تھی۔ انگریز دشمنی کے عام جذبے میں وہ دوسروں کے ساتھ شریک تھے لیکن وہ اپنے جاگیردار حریفوں سے زیادہ ڈرتے تھے۔ وہ ایک زوال پذیر طبقہ تھا۔ ان کی تاریخی یادیں ماضی کی جاگیردارانہ پھوٹ اور خانہ جنگیوں تک محدود تھیں۔ انھیں ایک متحد اور آزاد ہندوستان کا تصور نہ سوجھ سکتا تھا۔

ان دنوں حبِ وطن سے مراد اپنے علاقے کی محبت تھی جس پر اس کا روایتی حکمران راج کرتا تھا ہندوستان کا تصور بطور ایک مشترک وطن کے ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس کی راہ میں نہ صرف جاگیردارانہ تاریخی یادیں حایل تھیں بلکہ اس کی مادی بنیادیں ابھی نہیں پڑی تھیں یعنی ریلوے، ٹیلیگراف جدید تعلیم کا یکساں طریقہ وغیرہ۔

ہندوستان کا تصور ایک مادرِ وطن کی حیثیت سے بعد میں پیدا ہوا اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے قابلِ قدر تجربے نے اس کی ترقی میں مدد دی۔ "دی لنڈن ٹائمز" (The London Times) نے اس نئے نظریے کا ٹھیک ذکر کیا ہے "۱۸۵۷-۵۸ء کی بغاوت کا ایک بڑا نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر حصے کے باشندے ایک دوسرے سے آشنا ہو گئے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جنگ کا سیلاب نیپال سے امنڈتا ہوا گجرات کی حدود تک اور راجپوتانہ کی صحراؤں سے نظام کے علاقوں کی سرحدوں تک جا پہنچا ہے۔ ایک ہی طرح کے لوگ سارے ہندوستان کی سرزمین کو تاخت و تاراج کر رہے ہیں اور اپنی تحریک کو قومی رنگ دے رہے ہیں۔ الگ تھلگ ریاستوں کے حقیر مفادات، جہالت جس کے زیرِ اثر ایک چھوٹی سی ریاست کے باشندے دوسری ریاست کے آداب و رسوم سے بے خبر رہتے، یہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ سارے ہندوستان میں پبلک معاملات کی زیادہ یکساں سوجھ بوجھ نے لے لی ہے۔ اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں کوئی قومی جذبہ بیدار نہیں ہوا تھا تو بھی ہم اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ بغاوت کو دبانے کے لیے ہماری کوششوں نے ایک نئے پودے کے بیج بو دیے ہیں اور اس طرح آنے والے برسوں میں لوگوں کی طرف سے زیادہ سرگرم جدوجہد کی بنیاد پڑ چکی ہے۔"[۱۳۳]

گوشت پوست کا ایسا جُز بن چکی تھی کہ جب شورش کے اولین آثار مئی ۱۸۵۷ء میں نمودار ہوئے تو لارڈ کیننگ نے فوراً یہ سوچنا شروع کیا کہ آیا اس کی پشت پر ہندو ہیں یا مسلمان۔ کے اس نئی صورتحال کی الجھن اور اہمیت کو بیان کرتا ہے جس سے برطانوی حکمران دوچار تھے۔ "لیکن ماہ اپریل کے خاتمے سے پہلے لارڈ کیننگ پر یہ ظاہر ہو گیا ہو گا کہ جن ایشیائی نسلوں کو ہمارے تحفظ اور قوت کا بڑا وسیلہ سمجھا گیا تھا اب ان کی مخالفت کے سبب کسی چیز کی توقع نہیں رہی۔ مسلمان اور ہندو کھلم کھلا ہمارے خلاف متحد تھے۔"[۱۳۸]

البتہ برطانوی افسروں نے ہمت نہ ہاری بلکہ ہندو مسلم تفرقات کو برانگیختہ کرنے کی پالیسی پر ثابت قدم رہے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں سر ہنری لارنس نے لکھنؤ سے لارڈ کیننگ کو لکھا: "میں دونوں فرقوں کے مابین جذبات کے اختلافات پر نظر رکھوں گا۔" لیکن فرقہ وارانہ منافرت پیدا نہ ہو سکی۔ ایچسن افسوس کے ساتھ تسلیم کرتا ہے: "اس موقعہ پر ہم مسلمان کو ہندو کے خلاف نہ لڑا سکے۔"[۱۳۹]

باغی راہنما پوری طرح انگریزوں کی اس تفرقہ انگیز چال سے آگاہ تھے۔ احیائے اسلام کے حامی علامہ فضل حق نے لکھا: "انگریزوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ اپنے حیلوں اور دھوکے کی چالوں سے انقلابی قوتوں میں انتشار پیدا کیا جائے، مجاہدوں کی طاقت کو بے اثر کیا جائے اور ان کی بیخ کنی کی جائے، اور ان میں پھوٹ ڈال کر انھیں تتر بتر کر دیا جائے۔ اس باب میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔"[۱۴۰]

جدوجہد کی کامیابی کے لیے باغی راہنماؤں نے دیدہ ودانستہ ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ بہادر شاہ، فوجی لیڈروں، فاضل علما اور شاستریوں نے اعلان اور فتوے جاری کیے جن میں یہ تاکید کی گئی کہ ہندو مسلم اتحاد وقت کا تقاضا ہے اور سب کا فرض۔ جو علاقے برطانوی حکومت سے آزاد ہو گئے ان میں باغی راہنماؤں نے جو کام سب سے پہلے کیا وہ گاؤکشی کی ممانعت کا حکم اور اس کا نفاذ تھا۔ باغی راہنماؤں کی اعلیٰ ترین سیاسی اور فوجی تنظیم میں ہندو اور مسلمان نمائندوں کی تعداد برابر تھی۔[۱۴۱] جب بہادر شاہ نے سمجھا کہ وہ حکومت کے معاملات کا انتظام نہیں کر سکتا تو اس نے جے پور، جودھ پور، بیکانیر اور الور کے راجاؤں کو لکھا کہ "اگر آپ انگریزوں کو نیست و نابود کرنے کے مقصد سے متحد ہو جائیں تو میں برضا و رغبت شہنشاہی اقتدار آپ کے ہاتھوں میں سونپ دوں گا۔"[۱۴۲] دہلی میں ایک باغی سکھ رجمنٹ نے ایک مسلمان سپہ سالار کے تحت فوجی خدمت انجام دی۔[۱۴۳] ایسی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

ایک جوابی انقلاب لا رہے تھے۔ پھر ہمیں حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستانیوں نے برطانوی حکمرانوں کو ہندوستان چھوڑ جانے پر کیوں مجبور کیا؟ ان سے یہ تقاضا کیوں نہ کیا کہ وہ مزید سو سال یہاں ٹھہریں تاکہ سماجی انقلاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں اور سماجی مساوات کا نظام ہمارے لیے تعمیر کریں!

یہ نظریہ کہ برطانوی سرکار کے ترقی پسندانہ اقدام کے مقابلے میں باغیوں کا رویہ رجعت پسندانہ تھا نہ نیا ہے اور نہ طبع زاد بلکہ اتنا ہی قدیم ہے جتنا لارڈ کیننگ، اور ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے پہلے مسلم الثبوت برطانوی مورخ کے کے بقول: "لارڈ کیننگ نے بلاشبہ یہ دیکھا کہ شورش سے پہلے چند سالوں کے دوران انگریزوں نے ہندوستان میں اپنے یقینِ محکم سے متاثر ہو کر کسی قدر شدید جوش کے ساتھ کوشش کی تھی کہ وہ ہر چیز کو اپنے خیال کے سانچے میں ڈھالیں۔ قدامت پرست اس جدت کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے اور متواتر جدت طرازیوں پر غضبناک ہو گئے۔"[۱۳۷]

برطانوی سیاستدانوں اور مورخوں کا وطیرہ تو ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے جب وہ قدیم وضع اور جدید وضع کے مقابلے کا نظریہ پیش کرتے ہیں اور وہ اپنے طرزِ عمل کو ترقی پسندانہ اور باغیوں کے مقصد کو رجعت پرستانہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ہندوستانی راہنما اور مورخ اسی نظریہ کا بار بار ذکر کرتے ہیں تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ظاہر کو حقیقت سمجھ رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی راہنمائی ہندوستانی جاگیرداروں نے کی (لیکن صرف انہوں نے ہی نہیں) لیکن وہ کوئی کارنامے انجام دینے والے نہ تھے نہ ہی ہندوستان کے مقدر کے مختارِ کل۔ اس جدوجہد کے دوران عوام کی سماجی قوتیں بھی بروئے کار تھیں جن کے ساتھ نئے خیالات اور عوامل بھی آئے۔ حیف کا مقام ہے کہ ڈاکٹر موزمدار، ڈاکٹر سین اور پنڈت نہرو نے ان پر نہ تو توجہ کی اور نہ انھیں کوئی وقعت دی۔ اگر ہم غور اور سنجیدگی کے ساتھ ان کا مطالعہ کریں تو یہ نتیجہ ناگزیر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران عوامی قوتیں بہت سرگرم تھیں۔ ان کی آرزوئیں معقول تھیں اور ہندوستان میں رجعت پسندانہ جاگیرداری کی بحالی کو روکنے کے خیالات ان کے دماغ میں روشن تھے۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کا ایک قطعی عظیم کارنامہ جس کا ہندوستانی قومی تحریک بجا فخر کے ساتھ دعویٰ کر سکتی ہے، وہ انگریزوں کے حیلوں چالوں کے خلاف جدوجہد کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھنے اور ہندو مُسلم اتحاد پیدا کرنے کی نیک کوشش اور اس کو قائم رکھنے کی متواتر سعی ہے۔

ہندو مُسلم تفرقے سے فائدہ اٹھانے کی پالیسی ہندوستان میں برطانوی نمائندوں کے

اور سیاسی اثر و رسوخ کمزور تر ہوتا۔ جاگیر دارانہ قوتیں جس قدر [illegible]
کے امکانات کم تر رہ جاتے۔ ہر قسم کی عوامی اور قومی جدوجہد کی یہی منطقی [illegible] نتیجہ تھیں۔ ان کا ایک عام دعویٰ
کے آخری دور میں جاگیردارانہ قوتیں کلیتہً عریاں اور کمزور ہو کر رہ گئیں۔ عوامی قوتیں [illegible] لوگ پوری طرح
بیدار اور منظم نہ تھیں کہ ان پر غالب آئیں اور جدوجہد جاری رکھیں۔ اصل میں جو کچھ [illegible] فوج نے بغاوت
فتح کی تھی نہ کہ جاگیردارانہ نظام کی بحالی۔ جب اگلی پشت میں جدید قومی تحریک شروع ہوئی تو ۱۸۵۷ء
جدوجہد سے ہندو مسلم اتحاد کی شاندار میراث حاصل کی گئی اور اگلی دو پشتوں نے برطانوی غلبہ کے
خلاف ہندو مسلم متحدہ محاذ کے تصور کو زیادہ جمہوری پروگرام کا رنگ دیا۔

برطانوی فریق نے بھی اس تاریخی واقعے سے عبرت حاصل کی۔ فارسٹ "انٹروڈکشن ٹو اسٹیٹ
پیپرز ۵۸-۱۸۵۷ء" (Introduction to State Papers) میں لکھتا ہے:

"ان بہت سے اسباق میں جو مورخ کو ہندوستان کے غدر سے ملتے ہیں کوئی بھی سبق
اس تنبیہہ سے زیادہ اہم نہیں کہ ہم ایک ایسے انقلاب سے دوچار ہو سکتے ہیں جس میں برہمن اور شودر
ہندو اور مسلمان ہمارے خلاف متحد ہو سکتے ہیں اور یہ فرض کر لینا قرینِ مصلحت نہیں کہ ہمارے مقبوضات
میں امن اور استحکام کا اس بات پر انحصار ہے کہ براعظم میں مختلف مذاہب کے فرقے آباد ہیں۔ غدر ہمیں
یاد دلاتا ہے کہ ہماری عملداری ایک ایسی پتلی پرت پر قائم ہے جسے سماجی تغیرات اور مذہبی انقلابات کی
زبردست قوتیں کسی بھی وقت پارہ پارہ کر سکتی ہیں۔"[۱۴۸]

۷۔ باغی سپاہی فوج

ایسٹ انڈیا کمپنی کی باغی سپاہی فوج نے نہ صرف ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو شروع کیا بلکہ اس
کی تنظیم اور قیادت میں اہم اور قطعی پارٹ ادا کیا۔

اس وقت کے حالات میں اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا کہ یہ قومی بغاوت ہندوستانی
سپاہیوں کی طرف سے شروع کی جاتی۔ مارکس نے جو اس وقت واقعات کو قلم بند کر رہا تھا اس
کی اہمیت کو فوراً بھانپ لیا۔ "یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کی اطاعت کا مدار دیسی
فوج کی وفاداری پر ہے۔ اس فوج کی بھرتی کے ساتھ برطانوی حکومت نے مزاحمت کا پہلا عام
محاذ منظم کر دیا جو ماضی میں کبھی ہندوستانیوں کو حاصل نہ ہوا تھا۔"[۱۴۹]

ہندوستانی سپاہی فوج کی اپنی شکایات تھیں جو اِس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ یہ ایک غیر ملکی حکومت

البتہ ان دنوں لوگوں پر مذہبی نظریے کا غلبہ تھا۔ روایتی ہندو مسلم تفرقہ موجود تھا۔ ہندو اور مسلمانوں میں احیائے مذہب کے نظریات بھی پائے جاتے تھے۔ وہابیوں کا سب سے زیادہ اثر و رسوخ تھا۔ باغیوں کے ڈیرے میں برطانوی جاسوسی منڈلی یعنی ففتھ کالم نے ہندو مسلم اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے لیے نعرۂ جہاد بلند کیا۔" بادشاہ کے حضور میں عرضداشتیں پیش کی گئیں کہ کل ۲۲ مئی رمضان کا آخری دن ہے اس لیے بادشاہ سلامت ہندوؤں کے خلاف جہاد کے احکام صادر فرمائیں۔ بادشاہ نے ڈنکے کی چوٹ پر یہ اعلان جاری کیا کہ ہندو مسلمان آپس میں کوئی جھگڑا نہ کریں۔ تمام ہندوؤں نے جان کے خوف سے اپنے مکانات بند کر لیے۔"[۱۴۴] ۲۰ مئی کو ہندو افسروں کا ایک وفد پہنچا اور شکایت کی کہ ہندوؤں کے خلاف جہاد کی تلقین کی جا رہی ہے: بادشاہ نے جواب دیا: "جہاد انگریزوں کے خلاف ہے۔ میں نے ہندوؤں کے خلاف اس کی ممانعت کر دی ہے۔"[۱۴۵]

جب عید کا تیوہار آیا تو بادشاہ نے احکام جاری کیے کہ کوئی گائے ذبح نہ کی جائے۔ اگر کوئی مسلمان ایسا کرے گا تو توپ سے اڑا دیا جائے گا۔ انگریزوں کے دوست "حکیم احسن اللہ خاں نے اس حکم پر اعتراض کیا اور کہا کہ میں مولویوں سے مشورہ کروں گا۔ یہ سن کر بادشاہ بہت غضبناک ہوا۔ دربار کو موقوف کر دیا اور اپنے دیوانِ خاص میں چلا گیا۔ جنرل بخت خاں نے شاہی احکام کے مطابق ڈھنڈورا پٹوا دیا کہ شہر میں گاؤکشی منع ہے۔"[۱۴۶]

ڈاکٹر موزمدار کا یہ بیان درست نہیں کہ "فرقہ وارانہ تعصب کی جڑیں اتنی گہری تھیں کہ صرف اعلان میں مذکور نیک خواہشات کی برکت سے اس کی بیخ کنی کرنا ممکن نہ تھا۔"[۱۴۷] فرقہ وارانہ فساد کے جو کچھ اکا دکا واقعات رونما ہوئے ڈاکٹر موزمدار ان کی اہمیت میں مبالغہ کرتا ہے۔ اصلی اہمیت تو اس حقیقت کی ہے کہ برطانوی ایجنٹ بہت کم فرقہ وارانہ فساد برانگیختہ کر سکے اور باغی راہنما بحیثیت مجموعی جدوجہد کے دوران ہندو مسلم متحدہ محاذ کو کامیابی کے ساتھ قائم رکھنے کے قابل تھے۔

اس مسئلے کا ایک اور بہت اہم پہلو ہے۔ اس ہنگامے کے نتیجہ کا فیصلہ کرنے میں ہندو مسلم اتحاد کو بڑا دخل تھا۔ برطانوی فریق اس سے باخبر تھا اور انہوں نے اس اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور انتہائی کوشش کی۔ ہندوستانی بھی اس سے آگاہ تھے اور انہوں نے اس کی وقعت کو قائم رکھنے اور سمجھنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ لیکن بذاتِ خود یہ مسئلے کا بجز محرک بیان ہوگا۔ باغیوں کے لشکر میں جس قدر زیادہ ہندو مسلم اتحاد ہوتا اسی قدر جدوجہد زیادہ طویل ہوتی۔ اسی قدر عوامی قوتوں کو پیش پیش رہنے کے زیادہ مواقع ملتے اور جاگیردارانہ قوتوں کا نفوذ باقی

سی فتوحات انگریزوں کو حاصل ہوئی تھیں وہ سراسر ہماری جواں مردی کا نتیجہ تھیں۔ ان کا ایک عام دعویٰ تھا کہ ہماری مدد سے ہی انگریزوں نے ہندوستان کو برما سے کابل تک فتح کیا ہے۔ لوگ پوری طرح جانتے تھے کہ سرکار کا انحصار ہندوستانی فوج پر ہے۔ اس لیے جب انھیں معلوم ہوا کہ فوج نے بغاوت کردی ہے تو لوگوں نے فسادات بپا کر دیے۔ اب ان پر سرکار کا کوئی رعب نہ تھا۔"[۱۵۲]

ایسی ہندوستانی فوج جو ہندوستانی کسانوں سے طبقۂ عام سے بھرتی کی گئی تھی اپنے تجربہ کی بنا پر اس نتیجے پر پہنچی کہ اگر پہلے اس نے ہندوستان کو فتح کرنے میں انگریزوں کی مدد کی تھی تو اب اُسے ہندوستان کو انگریزوں کے جوئے سے آزاد کرانے کے لیے لوگوں کی قیادت کرنا چاہیے۔ ایسی فوج ہندوستانی جاگیردار راہنماؤں کی حاشیہ بردار نہیں ہو سکتی تھی بلکہ اس نے انقلابی جدوجہد کی رفتار اور ترقی پر اپنا نقش ثبت کیا۔

جنرل بخت خاں فوج میں نئی اسپرٹ کا ترجمان تھا۔ وہ بریلی برج میں توپخانے کا معمولی رسالدار تھا۔ بریلی کو آزاد کرانے اور وہاں باغی حکومت قائم کرنے کے بعد اس نے پورے بریگیڈ کے ساتھ دہلی کی طرف کوچ کیا۔ دارالخلافہ میں حقیقی جاگیردارانہ بدنظمی اور انتہائی ابتری پھیل گئی۔ باغی سپاہیوں نے اس میں مداخلت کا فیصلہ کیا اور بخت خاں کو اپنا نمائندہ بنا کر بہادر شاہ کے حضور میں بھیجا۔ جیون لال ۲ جولائی کو اپنے روزنامچے میں قلمبند کرتا ہے:

"انضباطِ عامّہ نافذ کرنے کے لیے محمد بخت خاں نے افواج کے سپہ سالارِ اعظم کی حیثیت میں اپنی خدمات پیش کیں۔ بادشاہ نے دوستی کا ہاتھ تھام لیا۔ فوجوں میں واپس آکر بخت خاں نے صوبیداروں کو آگاہ کیا کہ بادشاہ نے میری خدمات، وفاداری اور اطاعت کو قبول کر لیا ہے۔ محمد بخت خاں کو ایک ڈھال، ایک تلوار اور جنرل کے لقب سے سرفراز کیا گیا۔ اسے تمام افواج کا سپہ سالارِ اعظم مقرر کیا گیا۔ ایک اعلان جاری کیا گیا جس میں تمام کمان افسروں کو حاضر ہونے کا حکم صادر کیا گیا تاکہ وہ محمد بخت خاں سے ہدایات حاصل کریں۔ محمد بخت خاں نے بادشاہ کو آگاہ کیا کہ اگر کسی شہزادے نے شہر کو لوٹنے کی کوشش کی تو اس کے کان اور ناک کاٹ دیے جائیں گے۔ بادشاہ نے جواب دیا: 'تمھیں کلی اختیارات حاصل ہیں، جو تم ٹھیک سمجھو کرو۔'"[۱۵۳]

ہندوستان کی قومی تاریخ میں یہ ایک انوکھا اور بے مثال واقعہ تھا۔ یہ باغی ہندوستانی فوج تھی جو اس مغل بادشاہ کو شرائط پیش کر رہی تھی۔ جسے اس نے کچھ دیر پہلے شہنشاہِ ہندوستان بنا کر اس کے سر پر تاج رکھا تھا۔ یقیناً یہ ایسی فوج نہیں تھی جیسی کہ اکبر یا اورنگ زیب کی تھی

کی بھاڑے کی فوج تھی۔ ان کی شکایات نہ صرف مذہبی رسم و رواج میں مداخلت سے متعلق تھیں بلکہ تنخواہ، بھتے وغیرہ سے متعلق معاشی شکایتیں بھی تھیں۔ سب سے بڑھ کر ان کے نسلی امتیاز کی شکایت تھی جس کی وجہ سے انھیں بلالحاظ قابلیت اور تجربے ہر اہم معاملے میں انگریزوں کی نسبت ادنیٰ سمجھا جاتا تھا۔

صرف یہی نہیں کہ ہندوستانی فوج کی اپنی شکایات تھیں اور وہ ہندوستانی لوگوں کی سب سے زیادہ منظم قوت تھی بلکہ آخر وہ تھے تو ہندوستانیوں کی اولاد اور اس حیثیت سے وہ برطانوی راج کے اسی طرح شکار تھے جیسے دوسرے ہندوستانی۔

بحیثیت ایک طبقے کے ہندوستانی سپاہی کسان تھے اور بنگالی فوج کی اکثریت " اودھ کے دیہات سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی لیے وہ ہندوستان کے دیہاتی گھرانوں کے مصائب سے اچھی طرح واقف تھے۔ الحاقِ اودھ کے بعد اپنے وطن کی آزادی کھونے سے باقی ہندوستانی فوج کی نسبت بنگالی فوج میں قومی ذلت کے سوال کا زیادہ سخت اور تیز ردعمل ہوا۔

سپاہیوں کا ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ وہی تعلق تھا جو پیٹ کے بچے کا اپنی ماں کے رحم کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے دلوں سے برطانوی آقاؤں کی عزت جاتی رہی۔ وہ جنگ کے اعتبار سے اپنی وقعت اور قوت سے آگاہ ہو رہے تھے۔ سکھ اور افغان جنگوں کے دوران سپاہی نے نہ صرف یہ دیکھ لیا تھا کہ انگریز ناقابلِ تسخیر نہیں ہیں بلکہ وہ برطانوی فوجیوں اور افسروں کی کمزوری، بزدلی اور خود غرضی سے بھی واقف ہو گیا تھا اور جانتا تھا کہ جب یہ ناکامیوں سے دوچار ہوتے ہیں تو یہ ایک جارحانہ اور غاصبانہ فوج بن جاتے ہیں۔ اس پس منظر میں ہندوستانی سپاہیوں کو اس فوج میں جس نے ہندوستان کو انگریزوں کے لیے مطیع کر رکھا تھا انگریزی عملہ کی نسبت اپنی کثرتِ تعداد کا زعم ہونے لگا۔

۱۸۵۷ء کے دوران چیف کمشنر پنجاب جان لارنس نے بجا طور پر یہ لکھا: "اس بات کی توقع کرنی چاہیے تھی کہ دیسی فوج جو ہمارے قلعوں، اسلحہ خانوں، بارود خانوں اور خزانوں کی ذمہ دار تھی وہ فرنگیوں کی نگرانی کے بغیر اپنی اہمیت کے زعم میں مبتلا ہو جائے گی۔"[۱۵]

اس وقت ہندوستانی فوجیوں میں جو جذبات غالب تھے ان کا مفصل اندازہ ہمیں سرسید احمد خاں کے بیان سے ہو سکتا ہے:

"وہ فوج میں انگریزوں کو آٹے میں نمک کے برابر سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جو بہت

انگریزوں کے خلاف جہاد کے نام پر شہزادے دولت مندوں سے روپیہ وصول کر رہے تھے لیکن وہ اسے اپنے تصرف میں لے لیتے جب کہ شاہی خزانہ خالی تھا اور سپاہی فاقے کر رہے تھے۔ سب سے زیادہ سنگین مسئلہ جس سے مجلس دوچار تھی فوج کو رسد پہنچانے اور باغی حکومت کو چلانے کے لیے کافی روپیہ فراہم کرنا تھا۔ اس معاملے پر اس نے سخت رویہ اختیار کیا۔ ۶ر جولائی کو "بادشاہ نے مرزا عبداللہ اور دوسرے شہزادوں کے بُرے لچھنوں کی برملا مذمت کی اور انھیں وہ تمام روپیہ اگلنے کا حکم دیا جو انھوں نے ساہوکاروں سے جبراً اینٹھا تھا ورنہ ان کا وظیفہ بند کر دیا جائے گا۔"[۱۵۶] ۷ر اگست کو بخت خاں نے پھر شہزادوں کے خلاف بادشاہ سے شکایت کی تو اس نے احکام صادر کیے کہ "جب روپیہ کی فراہمی کا حکم جاری کیا جائے تو اس کی ادائیگی اہلِ شہر کے روبرو جنرل بخت خاں کو کی جائے۔ ہدایت ۱۸ر اگست کو "ساہوکاروں کے نام احکام صادر کیے گئے کہ وہ براہِ راست جنرل بخت خاں سے بات چیت کریں۔"[۱۵۷] ۳۱ر اگست کو اراکینِ مجلس نے "ساہوکاروں کو بلایا اور ان سے روپیوں کا مطالبہ کیا۔ ساہوکاروں نے جواب دیا: شہزادوں نے پہلے ہی ہم سے تین لاکھ ستر ہزار روپیہ وصول کر لیا ہے اور ہم مزید کچھ بھی نہیں دے سکتے۔ مجلس اس جواب پر غضبناک ہو گئی اور اعلان جاری کیا کہ شہزادوں کو آئندہ کوئی روپیہ ہرگز نہ دیا جائے۔"[۱۵۸] اب مجلس بادشاہ کی وساطت سے نہیں بلکہ بلا واسطہ لوگوں سے اپیل کر رہی تھی۔

۹ر ستمبر کو "بادشاہ نے ان شہزادوں کی گرفتاری کا حکم دیا جنھوں نے سپاہیوں کی تنخواہ کے لیے وصول کیا ہوا روپیہ خُرد بُرد کر دیا تھا۔"[۱۵۹] اب موقع ہاتھ سے جا چکا تھا۔ مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی دہلی فتح ہو گئی۔ سپاہی دہلی سے باہر کے رہنے والے تھے اور چوں کہ دہلی کے سماج میں شہزادوں کو ایک مقام حاصل تھا، ان کی گرفتاری عمل میں لانے سے دشمن کے خلاف محاذ میں رخنہ پیدا ہونے کا احتمال تھا اس لیے انھیں گرفتار نہ کیا گیا۔

ہومز لکھتا ہے: "ایک موقعہ پر چند سو بھوکے سپاہی ہال میں گھس آئے اور بادشاہ کے گرد کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بیٹوں کو قید کرے جنھوں نے ان کی تنخواہ میں غبن کیا تھا۔ پھر قسم کھائی کہ اگر انھیں تنخواہ ادا نہ کی گئی تو وہ اس کو اور اس کے خاندان کو قتل کر دیں گے۔"[۱۶۰]

مجلس نے جو اقتصادی اقدامات نافذ کیے ان سے صاف ظاہر ہے کہ اس کی فوجی تنظیم کی بنیاد کسانوں کے طبقے پر تھی۔ انگریزوں کے خلاف جنگ کا اہتمام اور حکومت کی روزمرہ کی ضروریات کے لیے عظیم مالی وسائل درکار تھے۔ امیروں پر بھاری ٹیکس لگائے گئے جو انھیں بخوبی برداشت

یہ ایک انقلاب پسند فوج تھی جو جاگیردار حکمران طبقے کے ساتھ لوگوں کی راہنمائی میں شریک تھی لیکن ان پر قابو پانے اور ان کی روک تھام کے لیے اپنی شرائط نافذ کر رہی تھی۔ یہ ایک نئی قسم کی فوج تھی جس کا جاگیردارانہ بھاڑے کی فوج کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔

اس فوج نے بادشاہ سے نہ صرف اپنے راہنما بخت خاں اور اس کے پورے اختیارات کو تسلیم کرنے کا مطالبہ کیا بلکہ انقلابی جدو جہد کے لیے باغیوں کی جماعت یعنی باغیوں کی مجلس قائم کی، جس کا ذکر تلمیذ خلدون کے اس بیش قیمت مقالے میں تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے جو اس کتاب میں شایع ہوا ہے۔ اس مجلس کا آئین مجموعی طور پر جمہوری تھا۔ اس کا کام باغی قوتوں کی ہمہ گیر فوجی قیادت اور ملک اور پایہ تخت کا انتظام حکومت تھا۔ اس کے راہنما بخت خاں کو نہ صرف جرنیل بلکہ صوبہ دار کا درجہ دیا گیا۔

مغل بادشاہ کے ساتھ مجلس کا تعلق اہم ہے۔ مجلس کو کثرتِ رائے کے ساتھ انگریزوں کے خلاف نہ صرف فوجی اقدامات سے متعلق تمام فیصلے کرنے کا حق تھا بلکہ ملک کے دیوانی کے لیے احکام اور قوانین بھی صادر کر سکتی تھی۔ اس کے احکام اور اعلانات بادشاہ کے پاس دستخط کے لیے بھیجے جاتے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران اپنے بیان میں بہادر شاہ نے کہا کہ جو بھی دستاویزات اس کے سامنے پیش کی جاتیں ان پر، بلکہ کبھی کبھی کورے کاغذوں پر بھی اُسے دستخط کرنے پڑتے۔ مجلس ہی اعلیٰ اختیارات کا مرکز تھی اور مجموعی طور پر یہ ایک ایسا نظام تھا جو آئینی مطلق العنان حکومت سے ملتا جلتا تھا۔

لال قلعہ میں جو زمانہ وسطیٰ کی قدیم جاگیردارانہ روایات اور رسوم و آداب میں مستغرق تھا سپاہیوں نے حقیقی جمہوری فضا پیدا کی۔ سپاہی فوجی بوٹ پہنے مارچ کرتے ہوئے دیوانِ خاص میں داخل ہو جاتے۔ اہلِ رسالہ اپنے گھوڑوں کو اس کے احاطے میں باندھ دیتے جس پر مغل بادشاہ اور اس کے درباری نوکر چاکر حیرت و ہیجان میں مبتلا ہو جاتے۔

یہ امر محلِ غور ہے کہ باغی راہنماؤں اور مجلس نے کس طرح مغل شہزادوں کو قابو میں رکھا جو فضول خرچی اور خود رائی کے عادی، حرص و ہوس کے بندے، بزدل اور ذلیل تھے جس کا لازمی نتیجہ ان کی نفاق انگیزی اور بداخلاقی تھی۔ انگریزوں کے وفادار نامہ نگار جیون لال نے تمام ماجرا احتیاط کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ "۳۰ جولائی کو ایک حکم جاری کیا گیا جس کی رو سے شہزادوں کو فوج سے متعلق تمام فرائض سے آئندہ کے لیے سبکدوش کر دیا گیا۔" ۱۵۴

لی تھی۔ بادشاہ نے اس ارادے کے پیشِ نظر مکہ جانے کا بہانہ کیا۔ یہ حالت سارے ملک میں پیدا ہوگئی
جہاں کہیں باغی فوجیں سرگرم عمل تھیں ہندوستانی جاگیرداروں کی جائے پناہ یا زیارت گاہ نزدیک ترین
برطانوی چھاؤنی تھی۔

جو سرکش سپاہی باغیانہ قوتوں میں سب سے زیادہ سرگرم اور بارسوخ تھے انہوں نے برطانیہ
کے خلاف مشترکہ جدوجہد کی غرض سے ہندوستانی جاگیرداروں کے ایک طبقے کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا۔
لیکن جدوجہد کو جاری رکھنے کے لیے انہوں نے باغیوں کی مجلس کی صورت میں ایک اعلیٰ اور مقتدر
جماعت بھی قائم کی۔ یہ مجلس اس وقت کے حالات میں آئینی شخصی حکومت کے ڈھانچے کے اندر فوجیوں
اور کسانوں کی ایک ملی جلی جمہوری سرکار کا نمونہ تھی۔

اس بات کو صرف بہادر شاہ نے برطانوی عدالت کے روبرو تسلیم کیا بلکہ دوسرے بیانات سے
بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ باغی راہنما اور مجلس بادشاہ سے خطوط لکھواتے اور اعلانات جاری کرواتے
جو اُن کی رائے میں جدوجہد کے مفاد میں ضروری تھے۔ جب بہادر شاہ انگریزوں کے ساتھ رابطہ قائم کررہا
تھا تو اُسے اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ جے پور، جودھپور، بیکانیر اور الور کے حکمرانوں کو یہ لکھے کہ "میں اس
نازک گھڑی میں سلطنت کے اہم معاملات کے اہتمام اور انجام دہی کے لیے تمہاری مدد اور تعاون چاہتا
ہوں اور ریاستوں کی ایک گروہ بندی قائم کرنے کا خواہاں ہوں۔ اگر یہ ریاستیں جن کو میں نے خطوط لکھے
ہیں متحد ہوجائیں تو میں شاہی اقتدار انہیں سونپ دوں گا۔"[۱۶۴] ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کرنے کی کوشش
میں اس اقدام کا ہم پہلے ہی ذکر کرچکے ہیں۔ انگریزی اقتدار کے خلاف کامیاب جدوجہد کے نتیجے
کے طور پر آزاد ہندوستان کی صورت میں ہندوستانی ریاستوں کے وفاق کا تصور ایک نیا اور معنی خیز
خیال ہے جو بغاوت کی پیداوار ہے۔

اس ضمن میں جنگِ کالپی کے موقع پر اور جھانسی کی شکست کے بعد اس باجماعت حلف کے الفاظ
بہت پُرمعنی ہیں جو رانی لکشمی بائی نے اپنے باغی سپاہیوں کو دلائی: "جب تک ہم میں دم ہے ہم کالپی سے
دست بردار نہ ہوں گے۔ ہم اپنے ہاتھوں سے آزاد شاہی کو دفن نہ کریں گے۔"[۱۶۵] ایک رانی سپاہیوں
کو لڑتے لڑتے مرجانے یا فتح پانے پر آمادہ کرنے کے لیے مغل شاہی یا مرہٹہ شاہی کے بجائے "آزاد
شاہی" کے نئے تصور سے کام لیتی ہے اور یہ بھی اس وقت جب نانا صاحب کا نمائندہ، اس کا اپنا
بھائی موقع پر موجود تھا اور وہ خود مہاراشٹر کی رہنے والی تھی! جھانسی کے شری ورنداون لال ورما
جنہوں نے رانی سے متعلق ہندی میں ایک مشہور تاریخی ناول لکھا ہے۔ مجھے بتایا ہے کہ انہوں نے راجہ

کرنے کے قابل تھے اور غریب لوگوں کو اس بوجھ سے آزاد رکھا گیا۔ زمین کے مسئلے پر ایک پروانہ جاری
کیا گیا جس میں انگریزوں کے بندوبست آراضی کو تبدیل کرنے کا وعدہ کیا گیا اور "کاشت کار" کو زمین
مہیا کرنے کا یقین دلایا گیا۔" [١٦١]

اشیائے خورونوش
کے تھوک بیوپاریوں نے ذخیرہ اندوزی شروع کر دی تھی اور شہر کو تنگدستی
سے بھاری قیمتیں اینٹھنے کے لیے جنگ کی سی حالت سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے تھے۔ عوام کو بڑی مصیبت
کا سامنا تھا۔ ۵ ستمبر کو "پولیس کے نام احکام جاری کیے گئے کہ وہ اشیائے خوردنی کی قیمتیں مقرر
کرنے کے لیے ہر روز ایک پنچ کا تقرر عمل میں لائیں۔ پنچ سے مراد پانچ تاجروں کی ایک منڈلی ہے۔ [١٦٢]
شہر کا کوتوال تھانیداروں کے نام قیمتوں کی باقاعدہ سرکاری فہرستیں جاری کرتا تھا۔
معلوم نہیں کہ مذکورہ بالا دستور پر کس حد تک حقیقتاً عمل ہوا اور طاقتور جاگیردار، ان کے مختار
اور حکومت میں ان کے ایجنٹ اس میں کس حد تک رخنہ ڈالتے تھے اور وقت کی کمی اور زیر محاصرہ شہر
کی مشکلات کے سبب کہاں تک ان پر عمل کرنا ناممکن تھا۔ لیکن باغی راہنماؤں کے نہایت جاندار اور
اہم طبقے کے عزائم، تصورات اور طرزِ عمل نمایاں طور سے واضح ہیں۔
ایک اور اہم کام جو سپاہی انجام دیتے تھے وہ انگریزوں کے "ففتھ کالم" جاسوس ٹولی، کے
خلاف انقلابیوں کی چوکسی تھی۔ وہ کسی بھی شخص کا لحاظ نہ کرتے خواہ وہ کوئی بڑے درجہ کا جاگیردار
ہی کیوں نہ ہو۔ جیون لال کا روزنامچہ ذیل کی قسم کے واقعات سے بھرا پڑا ہے:
"سپاہی بڑے غیظ و غضب کے عالم میں محل میں داخل ہوئے۔ انھوں نے احسن اللہ خاں
کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ زینت محل بیگم صاحب کو لے جانے کی دھمکی بھی دی تاکہ وہ اسے بادشاہ
کی وفاداری کی خاطر بطور ضمانت رکھ سکیں۔" [١٦٣]
مغل خاندان کے وارث کو کبھی بھی یہ گمان نہ ہو سکتا تھا اور وہ بھی اپنے موروثی تخت پر
بیٹھنے کے بعد کہ وہ ایسی صورت حال سے دوچار ہوگا کہ پانی سر سے گزر جائے گا۔ نئے خیالات اور
حالات کے تھپیڑوں سے گھبرا کر اس نے زیارت مکہ معظمہ کی خواہش کا اعلان کیا۔
کیا مذکورہ بالا واقعات اس نظریے کی تائید کرتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی کامیابی
ہندوستان میں جاگیردارانہ نظام اور اس کے لوازمات کو بحال کرنے کا موجب ہوتی۔ اس کے
برعکس اس بغاوت نے تو چوٹی کے جاگیرداروں کے بھی حوصلے پست کر دیے۔ ان میں مغل بادشاہ
اس کی چہیتی بیگم اور شہزادوں کی کثیر تعداد بھی شامل تھی جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی ٹھان

اپنے پایۂ تخت کی آخری مدافعت کے لیے پہنچ گئے۔ چارلس بال کے الفاظ میں "سارے ملک کے مسلح آوارہ گردوں کے ہجوم لکھنؤ کی طرف امنڈ رہے تھے تاکہ سبھی ایک ساتھ کیفرِ کردار کو پہنچ کر فرنگیوں کے ساتھ آخری شاندار جنگ میں کام آئیں ..."[۱۷۰]

بریلی اور لکھنؤ کی شکستوں کے بعد بھی باغی لڑتے رہے اور انھوں نے گوریلا جنگ کے ڈھنگ اپنالیے۔ اس کا نمونہ خان بہادر خان کے فرمان عام میں بیان کیا گیا ہے: "کافروں کے ساتھ باقاعدہ فوجی دستوں کے ساتھ مقابلے کی کوشش نہ کرو کیوں کہ وہ بندوبست کے اعتبار سے تم پر فوقیت رکھتے ہیں اور ان کے پاس بڑی بڑی توپیں ہیں۔ البتہ ان کی حرکات و سکنات پر نگاہ رکھو، دریا کے تمام گھاٹوں کی نگرانی کرو۔ ان کے سلسلۂ رسل و رسائل میں رخنے ڈالو۔ ان کی رسد رسانی میں خلل اندازی کرو۔ ان کی ڈاک کا سلسلہ منقطع کرو اور ان (فرنگیوں) کے آس پاس متواتر چکر کاٹتے رہو تاکہ وہ دم نہ لے سکیں۔"[۱۷۱]

مذکورہ بالا حالات پر رائے دیتے ہوئے رسل نے اپنے روزنامچے میں لکھا: "اس فرمان عام سے دانش مندی ظاہر ہوتی ہے اور یہ اس خوفناک جنگ کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کا ہمیں سامنا کرنا ہوگا۔"[۱۷۲] انگریزوں کے خلاف جنگ کو طویل کرنے کی غرض سے مذکورہ بالا طریق کار کو عمل میں لانے اور متفرق باغی قوتوں کی امداد کرنے کی ذمہ داری کا بار دیہاتی عوام پر پڑا۔ روہیلکھنڈ، بندھیلکھنڈ، اودھ اور بہار میں اس جنگ کی داستان کے تمام ہمعصر برطانوی بیانات میں اس بات کی متعدد کہانیاں موجود ہیں کہ کس طرح ہندوستان کے دیہاتیوں نے وفاداری اور صدق دلی کے ساتھ باغی ہائی کمان کے احکام کی تعمیل کی۔ ہم صرف ایک مثال پیش کرتے ہیں: "جب باغی اپنے مقصد میں ناکام ہوتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے تب بھی انھوں نے ہمارے ساتھ خیرسگالی کا کوئی ثبوت نہ دیا بلکہ جو اطلاع ہم چاہتے تھے وہ بھی دینے سے دریغ کرتے اور اکثر ہمیں گمراہ کرتے۔"[۱۷۳]

ناکام قومی بغاوت میں کسی طبقے کے حصے اور امداد کا بہترین اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اس نے اس میں کس قدر قربانی کی۔ اگر اس معیار کے مطابق اندازہ لگایا جائے تو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اعزازی مراتب میں کسانوں کا طبقہ سب پر سبقت لے جائے گا۔ ہومز لکھتا ہے: "ان مسلح جوانوں کی تعداد جنھوں نے اودھ میں جان دی لگ بھگ ایک لاکھ پچاس ہزار تھی جن میں سے کم سے کم پینتیس ہزار سپاہی تھے۔"[۱۷۴]

یہ دیکھنے کے بعد کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں کسانوں نے اپنے گاؤں سے باہر گیا کارنامے انجام دیے اس جدوجہد کی ماہیت اور وسعت کا جائزہ بھی ضروری ہے جو اس نے گاؤں کے اندر جاری

مردان سنگھ کے نام رانی کا ایک خط پڑھا ہے جس میں وہ جدید لفظ "سوراج" استعمال کرتی ہے۔

لکھنؤ میں اودھ کا کمسن بادشاہ محض ایک کٹھ پتلی تھا اور اقتدار سپاہیوں کے ہاتھ میں تھا جو اپنے افسروں کا انتخاب کرتے اور جب چاہتے انھیں معزول کر دیتے۔[۱۹۶] لکھنؤ میں بھی اسی طرح کی ایک مجلس تھی جیسی دہلی میں تھی۔[۱۹۷]

غرضیکہ نئی ہوائیں صرف دہلی تک محدود نہ تھیں بلکہ سارے ملک میں چل رہی تھیں جہاں بغاوت زوروں پر تھی اور یہ ہرگز نظام جاگیرداری کی بحالی کا پیش خیمہ نہ تھیں۔

اس وقت ہندوستان کے اندر جاگیرداری کا شیرازہ بکھر رہا تھا اور جمہوری خیال اور عمل کی نئی لہریں اٹھ رہی تھیں لیکن یہ اتنی طاقتور نہ تھیں کہ قدیم جاگیرداری کے نظریاتی بندھنوں کو توڑ سکیں اور برطانوی حکام پر غلبہ پائیں۔ البتہ یہ اس درجہ خطرناک ضرور تھیں کہ اصلی ہندوستانی جاگیردار اس بات پر مجبور ہو گئے کہ انگریزوں سے بغاوت میں شرکت کی معافی مانگ کر ان سے زندگی کا نیا پٹہ بطور ہبہ حاصل کریں۔

ہندوستان میں قدیم بندوبست آراضی کی تباہی اور انتقال آراضی کے قانون نے سارے دیہاتی علاقے کو سرکار کے خلاف شورش پر آمادہ کر دیا۔ حکومت کی پالیسیوں کی وجہ سے قدیم دیہاتی طبقات تاجروں، ساہوکاروں اور کمپنی کے افسروں کی نئی جماعت کے ہاتھوں اپنی زمینیں کھو بیٹھے۔ اس طرح سرکار نے ان کی زندگی کو تباہ کر دیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں بڑے پیمانے پر کسانوں کی شرکت نے اسے ایک ٹھوس جمہوری بنیاد اور عوامی بغاوت کا رنگ دیا۔ ۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستانی کسانوں نے وطن پرستانہ فرض ادا کیا۔

کسان باغی قوتوں کے ساتھ بطور مجاہدین شامل ہوئے۔ اگرچہ انھوں نے کوئی فوجی تربیت حاصل نہ کی تھی لیکن وہ اس قدر شجاعت اور خوبی کے ساتھ لڑے کہ خود انگریزوں نے انھیں خراجِ تحسین ادا کیا۔ ان میں سے بعض کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

لکھنؤ اور کانپور کے درمیان بیانجنج کی لڑائی میں انگریزوں کو آٹھ ہزار ہندوستانی باغی فوج کا مقابلہ کرنا پڑا جن میں سپاہیوں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہ تھی۔[۱۹۸] سلطانپور میں باغیوں نے ایک اور جنگ لڑی۔ اس میں ۲۵۰۰۰ فوجی ۱۱۰۰ رسالہ اور ۲۵ توپیں تھیں۔ ان میں صرف پانچ ہزار باغی سپاہی شامل تھے۔[۱۹۹] دہلی کی شکست کے بعد انگریزوں نے لکھنؤ پر تمام تر توجہ مرکوز کی جب انگریزوں نے اپنی تمام طاقت لکھنؤ کے محاذ پر جمع کر دی تو اودھ کے دیہات سے مسلح کسان مجاہدین

امنِ عامہ کے قیام میں میری امداد کر سکے۔ اس کے برعکس جو لوگ دیہاتی آبادی کی کثیر تعداد پر قابو پا سکتے تھے وہ بدامنی اور ابتری کی حالت پیدا کرنا چاہتے تھے۔"[۱۷۶]

فارسٹ نے بغاوت کے دوران دیہات میں طبقاتی صف بندی کا صاف صاف نقشہ کھینچا ہے:

"سرمایہ دار طبقات کو بے دخل کرنے میں پرانے زمینداروں کی ان کے سابق مزارعین نے مدد کی۔"[۱۷۷]

قومی بغاوت کے دوران اصلی طبقاتی صف بندی کو ملاحظہ کرنے کے بعد آئیے دیکھیں کہ جو واقعات سچ مچ رونما ہوئے ان میں دیہات کے باغی عوام نے کیا طرزِ عمل اختیار کیا۔

مختلف اضلاع کی اطلاعات موجود ہیں جو ضلع مجسٹریٹوں یا ڈویژنل کمشنروں نے فرمانِ عام نمبر ۲۱۲ مورخہ ۳۰ اپریل ۱۸۵۸ء سے متعلق مرتب کیں۔ اب ہم جنگ ۱۸۵۷ء کے کورو کشیتر یعنی اتر پردیش کے مختلف خطوں کے چیدہ ضلعوں پر نگاہ ڈالتے ہیں۔ ان اطلاعات کے نقطہ نظر میں شہنشاہیت پرستی کی خوبو ہے اور حقیقت کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ان کی زبان سے ظاہر ہے لیکن وقعت حقائق کی ہوتی ہے، الفاظ کی نہیں۔ اور شہنشاہانہ لفاظی میں ملبوس مفہوم کو نہایت آسانی کے ساتھ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

میرٹھ کا ذکر یوں کیا گیا ہے: "گوجروں (کاشتکاروں کی مویشی پالنے والی ذات) اور رہائی یافتہ مجرموں نے فوراً رہزنی اور لوٹ مار شروع کر دی۔ سڑکوں کو بند کر دیا گیا۔ ڈاک کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ ۱۱ اور ۱۲ مئی کو رنگھڑوں (ایک اور کاشتکار ذات) اور راجپوتوں نے تحصیل سردھانہ پر حملہ کر دیا۔ قلندر خاں نام کے ایک حوالدار نے فوراً اپنے حکمران ہونے کا اعلان کر دیا۔"

شاہ مل، باغ پت کا جاٹ باغی راہنما تھا اس کے بارے میں یہ رپورٹ تھی کہ "اس نے باغپت پر حملہ کیا اور اسے لوٹا اور دریائے جمنا پر کشتیوں کے پل کو تباہ کر دیا جو میرٹھ اور برطانوی فوج کے ہیڈکوارٹرز کیمپ کے بیچ رسل و رسائل کا واحد اور سیدھا ذریعہ تھا۔ ۹ جولائی کو باغیوں کا ایک بہت بڑا گروہ بیگم آباد کو لوٹنے کے بعد سیکری میں جمع ہو گیا اور برطانوی فوجی دستوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ دھولانہ کے باشندوں نے دہلی کے کچھ باغیوں کی امداد سے پولیس افسروں کو نکال دیا اور سرکاری کاغذات اور عمارات کو تباہ کر دیا۔ پرگنہ بڑوت کے لوگ باقاعدہ طور پر رسد فراہم کرتے اور شاہ مل کے توسط سے دہلی کے باغیوں کو بھیج دیتے۔ ۱۶ جولائی کو برطانوی فوجی دستوں کو موضع بسودھ کے باشندوں کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ان لوگوں نے شاہ مل کی اس قسم کی مدد کی تھی اور دہلی کے باغیوں کے لیے اناج کے بھاری ذخیرے فراہم کر رکھے تھے۔ اس اناج کی مقدار اتنی زیادہ تھی کہ محکمۂ رسد کی تمام گاڑیاں اس

رکھی۔ اس سے اس بحث کا فیصلہ ہو جائے گا جو نہایت پسند حلقوں میں چھڑی ہوئی ہے کہ آیا یہ ایک قومی جنگ تھی یا طبقاتی اور اس وقت طبقاتی قوتوں کی صف بندی کس طور تھی۔ اب ہم برطانوی عینی شاہدوں اور افسروں کے بیانات کا حوالہ پیش کرتے ہیں جنھیں آنکھوں دیکھا حال معلوم تھا اور جو براہ راست جدوجہد کے ساتھ وابستہ تھے۔

تھارن ہل اس کے آغاز کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"جب یہ خبر پھیل کر دہلی کے بادشاہ کو دوبارہ اپنے تخت پر بٹھا دیا گیا ہے تو دیہاتیوں نے خیال کیا کہ ہماری حکومت ختم ہو گئی ہے۔ جب قانون کی دہشت جاتی رہی تو ہر شخص جس میں کچھ دم تھا وہی کچھ کرنے لگا جو اس کی نگاہ میں درست تھا۔ ہر جگہ پہلا کام بنیوں سے انتقام لینا تھا۔ ان کے مکانات کو لوٹا گیا، ان کے بہی کھاتے جلا دیے گئے، خود ان کے ساتھ اور ان کے عیال و اطفال کے ساتھ برا سلوک کیا گیا۔ باہر کے زمینداروں کو ہر جگہ زمینوں سے بے دخل کر دیا گیا۔ اگر وہ گاؤں کے رہنے والے ہوتے تو انھیں اپنی حیثیت برقرار رکھنے کے لیے قدیم مالکان آراضی کے ساتھ جدوجہد کرنا پڑتی کیوں کہ وہ ہتھیاروں کے زور سے اپنی کھوئی ہوئی میراث کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔"[۱۶۵]

ولیم ایڈورڈس جو ضلع بدایوں کا حاکم تھا مذکورہ بالا بیان کی تصدیق کرتا ہے:

"بلند رتبہ اور بارسوخ خاندانوں کی کثیر التعداد جائدادوں کو نئے آدمیوں نے دغابازیوں اور قانونی حیلوں سے خرید لیا جن میں زیادہ تر تاجر اور سرکاری ملازم تھے اور جن کا کوئی چلن یا اپنے مزارعین پر کوئی اثر نہ تھا۔ ان لوگوں کی اکثریت (زمینوں سے) غائب باشوں کی تھی جو اپنی خریدی ہوئی زمینوں پر رہنا پسند نہ کرتے تھے یا ڈرتے تھے کیوں کہ وہاں انھیں زبردستی دخل دینے والے اور ناخواندہ بہمان سمجھا جاتا تھا۔ منتقل شدہ جائدادوں کے قدیم مالکوں سے انھیں زمینوں پر مزارعین کی حیثیت سے کام لیا جاتا تھا جو کبھی ان کی اپنی تھیں۔ وہ کسی بھی طرح اپنی حیثیت کی تبدیلی پر قانع نہ تھے بلکہ کاشت کاروں کے طبقے کی ہمدردیوں پر انھیں زبردست موروثی اختیار حاصل تھا۔ یہ کاشتکار اپنے جاگیردار آقاؤں کی اس کوشش میں شریک ہونے پر رضامند اور تیار تھے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی عزت اور جاگیروں کا قبضہ دوبارہ حاصل کریں۔ نئے آدمیوں میں سے کوئی بھی، جو ان کے بعد زمینوں کے مالک بنے تھے، اس قدر اثر و رسوخ نہ رکھتا تھا کہ وہ

"اس کے برعکس نیلام میں زمین کا خریدار عام طور پر شہر کا باشندہ تھا اور کبھی اپنے گاؤں میں نہ آتا تھا سوائے اس موقع کے جب وہ پٹہ کی رقم وصول کرنے یا ڈگری کے عملدرآمد کے تبعیج مقصد کے ساتھ آتا۔ اس لیے لوگوں نے قدرتی طور پر ان زمینداروں کا ساتھ دیا جنھیں ہنگاموں میں اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو بحال کرنے کا شاندار موقع نظر آیا۔ پہلے وہ فرنگیوں کی ہر چیز کو تباہ کرنے اور لوٹنے پر مصروف ہوئے اور ان کی تمام جائدادوں پر جبراً قبضہ کر لیا۔ البتہ نیلام میں زمین کے خریدار ہمارے خیر خواہ تھے اور انھوں نے امن وامان کی بحالی میں حتی المقدور ہماری مدد کی۔"[۱۸۳]

جونپور کے مشرقی اضلاع میں "کوئی نام کا بھی حاکم نہ رہا۔ جو لوگ ہماری حکومت کے تحت اپنی جائدادوں سے محروم ہو گئے تھے انھوں نے ان کھوئی ہوئی جائدادوں کو دوبارہ حاصل کرنے کے لیے موقع کو غنیمت جانا۔ جن لوگوں نے ایسا خیال نہ کیا وہ اپنے کمزور ہمسایوں کو لوٹ کر معمولی فائدہ اٹھا سکے۔ جو کسی قدر زیادہ منچلے تھے انھوں نے اودھ کی باغی قوتوں سے راہ و رسم پیدا کر کے زیادہ مجاہدانہ فوائد حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ یہ بدنظمی کی حالت جاری رہی حتیٰ کہ ۸ ستمبر کو گورکھوں نے پہنچ کر برطانوی حکومت کی صورت دوبارہ پیدا کر دی۔"[۱۸۴]

گورکھپور کے مشرقی علاقے میں بھی "راجہ نگر سے شہہ پا کر اور بعض اوقات اس کی نجی کمان کے تحت گوتم راجپوت ہر جگہ باغی ہو گئے اور موجودہ مالکوں کو ان تمام زمینوں سے بے دخل کر دیا جو روایتاً ان کی نسل کی ملکیت تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ معلوم ہوا کہ نر ہرپور، نگر اور ستاسی کے راجے اور پانڈے پور کے ابرار اور کئی دوسرے لوگوں نے باہم ملاقاتیں کی ہیں جن میں اودھ سے امداد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔"

"اختیارات سنبھالنے کے بعد محمد حسین کا پہلا کام یہ تھا کہ اس نے تمام سرکاری ملازموں کو سزا کی دھمکی کے ساتھ حکم دیا کہ وہ اس کی ملازمت قبول کریں۔ اس نے موجودہ صیغہ مال اور ضابطہ فوجداری کو برقرار رکھا اس پر اس کے بہت سے زمیندار حامی بیزار ہو گئے۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ "نوابی" کے تحت جو علاقہ اب ضلع بن گیا ہے، تھانیداروں کا وجود نہیں ہوتا تھا۔ عدالت دیوانی کی ڈگریوں کی تعمیل عدالتی ٹکٹ کی نصف رقم پر بھی کی جاتی تھی۔

"ضلع میں جو لوگ دیوانی عدالتوں کے ذریعہ سے اپنی جائدادیں کھو بیٹھے تھے اب انھوں نے خریداروں کو بے دخل کر دیا اور خود دوبارہ قابض ہو گئے۔ دستاویزوں اور ڈگریوں کو بڑی دوڑ دھوپ سے ڈھونڈا گیا۔"[۱۸۵]

جنوبی ہمیر پور میں "بغاوت کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ ضلع میں ہر جگہ تمام ساہوکار بنیوں

ذخیرے کے صرف ایک قلیل حصے کو ڈھونے کے لیے کافی ثابت ہوتیں۔"۱۷۸

سہارنپور میں "پہلے ساہوکاروں کو لوٹا گیا یا انھیں لوٹ سے بچنے کے لیے رقم ادا کرنی پڑی سود خوروں اور تاجروں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اپنے بہی کھاتے اور قرضوں کی رسیدیں دے دیں۔ گڑے مردے اکھاڑے گئے۔ اولین شورشیں دیرینہ عداوتیں نکالنے، پرانے حساب چکانے یا لوٹ مار کے لیے تھیں۔"

رنگھڑوں کے بارے میں یہ بیان کیا گیا: "ان کی پرجوش دلیری کی داد دینے سے دریغ کرنا ممکن تھا پناہ مانگنا کسرشان سمجھتے تھے اور اپنے تعاقب کرنے والوں پر فوراً مڑ کر ٹوٹ پڑتے خواہ وہ گنڈا سے یا ایسے ہی کسی بھدے سے ہتھیار سے لیس ہوتے۔"۱۷۹

مظفر نگر میں "سارے ضلعے میں ہر روز بلکہ ہر گھنٹے میں ہر قسم کے قتل و غارت کے جرائم چھپ کر یا رات کو نہیں بلکہ کھلم کھلا اور دن دہاڑے سرزد ہوتے۔ اکثر حالتوں میں بنیے اور مہاجن ہی ان کے تشدد کا شکار تھے اور ان میں سے کئی ایک کو اپنے گذشتہ حرص اور طمع کا خوف ناک خمیازہ بھگتنا پڑا۔"۱۸۰

علی گڑھ میں "ماہ جون کے وسط سے پہلے پرگنہ کے چوہانوں (راجپوت زمیندار) نے جو انتقام پر تلے ہوئے تھے جاٹوں (ایک اور زمینداروں کی ذات) کو مدد کے لیے بلایا۔ خیر پر حملہ کیا اور لگ بھگ ساری سرکاری عمارتوں کو بھی لوٹا اور تباہ کیا اور بنیوں اور مہاجنوں کو بھی گھروں کو بھی۔ صدر، کچہری اور تحصیلوں کے سرکاری کاغذات کو برباد کر دیا گیا۔ بہت سے لوگوں نے جنھیں ہماری حکومت کا تختہ الٹنے سے بڑا فائدہ پہنچا اپنی کھوئی جائدادیں حاصل کر لیں اور ان پر قناعت کر کے شورش کے نتیجے کا انتظار کرنے لگے۔"۱۸۱

متھرا میں "ہنگاموں میں زیادہ تر بنیوں پر حملے ہوئے اور پرانے زمینداروں کے ہاتھوں نئے زمیندار زمینوں سے بے دخل ہو گئے۔ آگرہ کو جانے والی سڑک کے ساتھ ساتھ تمام دیہات کے زمیندار باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان کی امداد کی۔ محکمۂ مال اور پولیس کے عملے کو ہر جگہ نکال دیا گیا اور اگر رہنے دیا گیا تو وہ باغیوں کے رحم و کرم پر تھے۔"۱۸۲

الٰہ آباد میں "کاشتکار اور غریب طبقات ابھی تک پرانے بے دخل زمینداروں کو ان زمینوں کے خریداروں کی نسبت زیادہ عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے خواہ نئے زمیندار کتنی ہی مدت سے زمینوں پر قابض رہ چکے ہوتے۔ سابق زمیندار اور اس کے خاندان کے لوگ اب بھی گاؤں کے سب سے زیادہ بارسوخ باشندے تھے۔

تلمیذ خلدون کا یہ نظریہ کہ اس بغاوت کے دوران "ہندوستانی کسان غیر ملکیوں اور ہندوستانی جاگیرداروں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر لڑ رہے تھے اور یہ بغاوت ملکی زمینداری نظام اور غیر ملکی شہنشاہیت کے خلاف کسانوں کی جنگ بن کر ختم ہو گئی" محض مبالغہ ہے۔ اس بات کی مطلق کوئی شہادت نہیں کہ ہندوستانی کسانوں نے جاگیردارانہ بندھنوں کو سیاسی یا اقتصادی طور پر توڑ ڈالا تاکہ وسیع قومی بغاوت کو کسانوں کی جنگ میں بدل دیں بلکہ اس کے برعکس تمام شہادت جو معلوم ہے اس نظریے کے خلاف ہے۔

ضلعوں سے متعلق مذکورہ بالا اقتباسات کے متعلق کسانوں کی جدوجہد برطانیہ کے پیدا کردہ نئے زمینداروں کے خلاف ہے نہ کہ تمام نئے اور پرانے زمینداروں کے طبقے کے خلاف۔ دوسرے اضلاع سے متعلق "دی نیریٹو آف ایونٹس" (The narrative of events) میں جو معاصرین کے نہایت مفصل دستیاب بیانات ہیں مجھے کوئی شہادت نہیں ملی سوائے اس کے جو اس طبقاتی صف بندی کی تصدیق کرتی ہے جس کا میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں۔ ان برطانوی ماخذوں ـــ جن کا خلدون نے حوالہ دیا ہے ظاہر ہے کہ زمیندار اعلیٰ طبقات کے خلاف ادنیٰ طبقات کی بغاوت سے خوفزدہ تھے اور انھوں نے جدوجہد کو حسب مصلحت حدود کے اندر رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ کسی ایسی شہادت کا حوالہ نہیں دیتا جس سے ثابت ہو کہ کاشتکاروں کی جدوجہد نئے زمینداروں یعنی نیلام میں خرید کرنے والوں کی زمینوں کی ضبطی اور قبضے سے آگے بڑھی اور تمام زمینداروں کے طبقے کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ "زمین برائے کاشت کار" کے نعرے پر عمل کرنے کے لیے زمینوں کو از سر نو تقسیم کیا جائے۔ زمینداروں کا طبقاتی خوف ایک تاریخی حقی[illegible] تھی جس نے زم[illegible]دں کو زیادہ آسانی اور رضامندی کے ساتھ اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انگریزوں کے سا[illegible]ل دیں لیکن یہ ثابت کرنے کے لیے کوئی تاریخی حقائق موجود نہیں ہیں کہ ۵۸-۱۸۵۷ء کے دوران کسانوں کی جدوجہد نئے زمینداروں کے خلاف جدوجہد سے آگے بڑھ کر تمام زمیندار طبقے کے خلاف جدوجہد کے مرحلے تک پہنچی۔ یعنی اس نے ایک کسانوں کی جنگ کی صورت اختیار کی۔

پھر کچھ ایسے نظریاتی اور سیاسی اسباب تھے جن کی بنا پر زرعی شورش کو زمینداروں کے صرف اس ایک طبقے کے خلاف محدود اور محصور رکھا گیا جس نے دیہاتی کاشتکاروں اور قدیم روایتی زمینداروں کی اکثریت کو یکساں زمینوں سے بے دخل کیا تھا۔ مشترکہ شکایات کی بنا پر یہ تمام دیہاتی طبقات کی غیر دیہاتی، غیر کاشتکار، سرمایہ دار اور سود خور طبقات، برطانوی حکومت کے پیدا کردہ

مارواڑیوں وغیرہ کو تمام جائداد آراضی سے محروم کر دیا گیا خواہ وہ کسی بھی طریقے سے انھوں نے حاصل کی تھیں یعنی نیلامی میں، نجی بیع سے یا کسی اور طریقے سے۔ نیز بڑے بڑے فرقوں نے اس بدنظمی کے دور سے بے حد فائدہ اٹھایا اور پرانے حساب خون سے چکائے گئے۔"۱۸۶

پاس ہی باندا میں "سرکاری کاغذات پھاڑ کر ان کی دھجیاں اڑا دی گئیں تاکہ ان کے توں کے مطابق نئی حکومت کے ہاتھ میں ان کے قرض کا کوئی ثبوت باقی نہ رہے۔ ہر طرف گاؤں کے گاؤں باغی ہو گئے۔ نیلامی میں جائداد کے خریداروں اور عدالتی ڈگری رکھنے والوں کو بے دخل کر دیا گیا۔ مسافروں اور تاجروں کو لوٹا گیا۔ سرکاری ملازموں کو جان بچانے کے لیے بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا اور ہر حالت میں ہر قسم کی سرکاری جائداد اور عمارات کو لوٹ کر تباہ کر دیا گیا۔

"بندھیلکھنڈ میں تلواروں اور توڑے دار بندوقوں کی کمی تھی لیکن لوگوں نے برچھیوں، درانتیوں آہنی لاٹھیوں اور چھوری کے سرے پر چھری لگا کر عارضی ساخت کی کلہاڑیوں سے مسلح ہو کر اپنے آپ کو سپاہی تصوّر کر لیا۔ اپنے بادشاہوں کا انتخاب کیا اور تمام نوواردوں کو للکار کر ان کا مقابلہ کیا۔ بغاوت کبھی بھی اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ نہ پھیلی تھی اور نہ ہی اس سے زیادہ مکمل تھی۔"۱۸۷

مذکورہ بالا اقتباسات کی بے شمار مثالیں باغی صوبوں کے تمام اضلاع سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ ان بیانات سے ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران دیہات میں جدوجہد کی ماہیت صاف صاف ظاہر ہے۔ اوّل یہ کہ ساری دیہاتی آبادی اس نئے بندوبست آراضی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی جسے برطانوی حکمرانوں نے ان کے گلے منڈھ دیا تھا۔ دوسرے جدوجہد کا یکساں طریقہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت کے تحت جو نئے زمیندار پیدا ہوئے تھے ان کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ ان کی دستاویزات کو تباہ کر دیا جائے۔ دیہات سے انھیں مار بھگایا جائے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ برطانوی حکومت کے تمام آثار بالخصوص کچہری، تحصیل اور تھانے پر دھاوا بولا جائے۔ تیسرے، جدوجہد کی بنیاد دیہاتی عوام اور غریبوں پر تھی جب کہ قیادت کی باگ ڈور ان زمینداروں کے [illegible] تھی جنھیں برطانوی قانون کے تحت بے دخل کر دیا گیا تھا۔ چوتھے، جدوجہد کا یہ طریقہ ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے عام طریقے سے مطابقت رکھتا تھا۔ دیہات میں طبقاتی جدوجہد تمام زمینداروں کی جماعت کے خلاف نہیں تھی بلکہ صرف اس نئے طبقے کے خلاف تھی جو انگریزوں نے نئے قانونوں کے تحت پیدا کیا تھا اور یہ ان کے وفادار سیاسی حامیوں کے طور پر کام کرتے تھے یعنی یہ طبقاتی جدوجہد غیر ملکی غاصب کے خلاف قومی اتحاد کے عام تقاضے کے تحت تھی۔

پروانہ لے آیا (جس نے دہلی کے بادشاہ سے لقب 'صوبہ' پایا تھا) جس کی رو سے اُسے 'نائب صوبداری' کی سند عطا کی گئی۔ اس سے لیس ہو کر وہ واپس آیا، اپنے القاب کا اعلان کیا اور اقتدار سنبھال لیا۔" فرخ آباد میں سابق نواب کو وہاں کا حاکم اور بادشاہِ دہلی کا مقامی نائب بنا دیا گیا، جب کہ حکومت کے معاملات پرانے جاگیرداروں اور اکثر سابق برطانوی ملازموں کی مدد سے انجام دیے جاتے تھے۔ سپاہیوں کے نمائندے کئی بار لوگوں کی طرف سے مداخلت کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باغی راہنماؤں کے تحت ضلعوں اور صوبوں میں دہلی کی نسبت نظام حکومت جاگیرداروں کے زیادہ زیرِ اثر تھا۔ پنچایتیں ہر جگہ بحال ہو گئیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جدوجہد کے مراکز کے طور پر کام کرتی تھیں تاکہ انگریزوں کے خلاف جنگ کے لیے انسانی اور مادی وسائل کو متحد کر کے حرکت میں لایا جائے۔ شاید یہ پنچایتیں سوائے دیہات کے کہیں بااقتدار جماعت کی حیثیت سے کام نہ کرتی تھیں۔ دہلی پر باغی سپاہیوں کا قبضہ تھا۔ انھیں انگریزوں اور شہری مراکز کے ساتھ واسطہ رہا۔ وہ نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں بلکہ ہمسایہ ممالک کے حالات سے بھی واقف تھے۔ تجربہ اور سوجھ بوجھ کے اعتبار سے وہ باغی عوام میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ طبقہ تھا۔ ان کے دیہات میں رہنے والے لوگ بہت محدود مقامی تجربہ رکھتے تھے اور ان پر روایتی جاگیردارانہ نظریاتی، اور سیاسی اثر کہیں زیادہ غالب تھا۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ باغی کسان دیدہ و دانستہ ہندوستان میں قدیم جاگیردارانہ نظام کی بحالی میں شریک ہوتے یا ان پر متعلقہ جاگیردارانہ اثر و رسوخ اس نظام کی بحالی کا موجب ہوتا۔ دہلی کے باغی سپاہی جنھوں نے مجلسِ انتظامیہ قائم کی اور جمہوری احکام جاری کیے ان کے اپنے ہی بیٹے تھے اور ان کی اپنی آرزوؤں کا اظہار کر رہے تھے جو اگلی صفوں کے ان مورچوں کو ظاہر کرتے تھے جو ہندوستانی کسانوں نے فوجی وردیوں میں ملبوس ہو کر پہلے ہی سنبھال رکھے تھے۔

ہندوستانی کسانوں نے قدامت پسند زمینداروں کے ساتھ مشترکہ جدوجہد کی خاطر مصالحت کر لی لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ یہ عوام کی انقلابی جدوجہد کی حقیقی صورت اختیار کر رہی ہے تو وہ اس اتحاد سے خوفزدہ ہو گئے۔ گبنس جسے اودھ اور دوسرے مشرقی اضلاع سے متعلق وسیع ذاتی تجربہ حاصل تھا لکھتا ہے:

"اس نازک گھڑی میں بے شک ہندوستانی شرفا کی معذوری کو ملحوظِ خاطر رکھنا چاہیے کیوں کہ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ اس مسلح اور منظم دشمن کی تاب لائیں جس نے اچانک ہمارے خلاف سر اٹھایا۔ دشمن اپنے ان ہم وطنوں کے ساتھ

خدمت گاروں، اور خود غرض رشوت خور ہندوستانی ملازموں کے خلاف بغاوت تھی جو ان کی زمینوں پر جبراً دخل اور قبضہ جما رہے تھے۔ یہ ایسی زمینیں تھیں جن کے یہ دیہاتی طبقے پشتوں کا مالک رہے تھے اور ان پر کاشت کی تھی۔

ایسی صورتِ حال کے تحت پرانے زمیندار جدوجہد کے رہنما بن کر ظاہر ہوئے کیوں کہ وہ دیہات کے روایتی پیشوا تھے۔ نئی قوتوں کے زیرِ اثر جو برطانوی حکومت حرکت میں لائی، بحیثیت ایک معاشی اور انتظامیہ اکائی کے قدیم دیہاتی برادری کا شیرازہ تیزی سے بکھر رہا تھا لیکن اس کی نفسیاتی اور سماجی میراث محفوظ تھی اور از سرِ نو تازہ ہو گئی۔ جب یہ سوال پیدا ہوا کہ قدیم دیہاتی برادری کے مختلف عناصر ترکیبی جو تمام آراضی کے مالک تھے مل کر زمینوں کے نئے غاصبین کے خلاف جنھوں نے ان کی قدیم زمینوں پر قبضہ جما لیا تھا اور اس غیر ملکی غاصبانہ حکومت کے خلاف جدوجہد کریں جس نے اپنے قانونوں، عدالتوں اور حکومت کے ایجنٹوں کے ذریعے یہ سب کچھ ممکن بنایا تھا۔ پس اس طرح گاؤں کے روایتی پیشوا دیہات میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے تاریخی راہنما بن گئے۔

یہ بات نہیں کہ باغی کسانوں کا دانشمند عنصر ان زمینداروں کے ساتھ اپنے طبقاتی تنازعوں سے باخبر نہ تھا لیکن انھوں نے مصلحت اس میں سمجھی کہ اس تنازعے کو ابھرنے نہ دیا جائے بلکہ عقلِ سلیم کا تقاضا یہ تھا کہ پہلے بڑے مشترکہ دشمن سے نپٹا جائے۔ ہومز کا بیان ہے: "دیہاتیوں کے لیے ان تعلقداروں کے ساتھ ہمدردی کی کوئی وجہ نہ تھی جنھوں نے انھیں حقوقِ آراضی سے محروم کیا تھا، لیکن یہی تعلقدار ان کے قدرتی پیشوا تھے جن کی قیادت قبول کرنا ان کے لیے ضروری تھا اگر وہ غیر ملکی ناخواندہ بہالوں کے ساتھ سنجیدگی سے لڑنا چاہتے تھے۔"[۱۸۸]

دیہات میں طبقاتی جدوجہد کی صورت میں بے شک تبدیلی پیدا ہوئی لیکن یہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بعد رونما ہوئی اور اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے۔

اس بغاوت کے دوران کسانوں اور دوسرے طبقوں پر روایتی زمینداروں کی نظریاتی اور سیاسی گرفت نے بے شک انقلابی قوتوں کو کمزور کیا۔ ہم پہلے گورکھپور کی رپورٹ کا حوالہ دے چکے ہیں جس میں یہ مذکور ہے کہ علاقے کو آزاد کرانے کے بعد زمیندار راہنماؤں نے زیادہ تر قدیم انتظامیہ ڈھانچے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس سے بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ ضلع علی گڑھ کی رپورٹ میں بیان کیا گیا ہے کہ مقامی بغاوت کے بعد بااختیار مقامی تنظیم کے طور پر ایک بڑی پنچایت قائم کی گئی لیکن جاگیردار راہنماؤں نے اس کے خلاف سازش کی۔ ان میں سے ایک "مالاگڑھ کے ولی داد خاں"

تھے ہم نے زیادہ وقت لیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے تجربے کی بنا پر انگریز حکمرانوں نے ہندوستانی جاگیردار طبقات کے تئیں اپنی پالیسی کو تیزی سے بدلا۔ ان کے مفادات پر ضرب لگانے کی پرانی پالیسی کو ترک کر دیا اور ہندوستان میں اپنی حکومت کی اصلی سماجی بنیاد قائم کرنے کی غرض سے ان کے ساتھ مصالحت کی نئی پالیسی اپنائی۔ ہندوستانیوں نے ہندوستانی جاگیرداروں کے تجربے سے یہ درس حاصل کیا کہ اپنی تحریک کے اگلے دور کے لیے انگریزوں کے خلاف ان کی جدوجہد کی کامیابی کا مدار اس بات پر ہے کہ یہ جدوجہد جاگیرداروں کے خلاف بھی ہو۔ وہ لوگ جنھیں آج تک ہندوستانیوں نے اپنا روایتی راہنما سمجھا اب بجا طور پر انھیں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے غدار اور برطانوی اقتدار کی ہندوستانی کٹھ پتلیاں تصور کیا گیا۔

جہاں تک والیانِ ریاست کا تعلق ہے 'الحاق کی پالیسی ترک کر دی گئی۔ ملکہ وکٹوریہ نے اپنے اعلان میں ان سے وعدہ کیا: "ہندوستانی حکمرانوں کے حقوق، شان اور عزت کا ہم ایسا ہی پاس رکھیں گے جیسا کہ اپنا۔" لارڈ کیننگ نے اپنی سرکاری یادداشت مورخہ ۳۰ر اپریل میں بڑی صاف گوئی سے لکھا "ہندوستانی سرداروں کی سرپرستی سے جو ہمارے ساتھ اچھی خاصی وابستگی رکھتے ہیں، ہماری حکومت کا تحفظ بڑھتا ہے، کم نہیں ہوتا۔"

——

۱۸۵۷ء کے بعد والیانِ ریاست کے تئیں برطانوی پالیسی کو جس طرح ہندوستان کی قومی تحریک نے سمجھا اس کا بہترین اظہار نہرو کی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" (Discovery of India) میں کیا گیا ہے جس میں وہ فرماتے ہیں، "دیسی ریاستوں کو برقرار رکھنا ہندوستان کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے کے ارادے سے تھا۔[۱۹۱] ہندوستانی والیانِ ریاست ہندوستان میں برطانیہ کے ففتھ کالم کا کام کر رہے ہیں۔"[۱۹۲]

ملکہ کے اعلان میں یہ وعدہ کیا گیا کہ "ہندوستانی باشندے اپنی موروثی آبائی زمینوں کے ساتھ جو وابستگی رکھتے ہیں اس کا پاس رکھا جائے گا۔" اور "قانون کے بنانے اور نافذ کرنے میں ہندوستان کے قدیم حقوق اور رسم و رواج کا مناسب لحاظ رکھا جائے گا۔" اودھ کے برطانوی اعلیٰ افسر مال، گبنس نے یہ دلیل پیش کی: "ہم ایسے نظام کے مستقل قیام کا تصور نہیں کر سکتے جس سے ہندوستانی باشندوں کے اعلیٰ طبقات ہم سے بیگانے رہیں۔" یہ عمل خود بغاوت کے دوران ہی شروع ہو گیا جب گبنس نے اعتراف کیا: "اس وقت ہم انھیں جاگیریں بطور رشوت دے رہے ہیں۔"[۱۹۳] "گذشتہ را صلوٰۃ آئندہ را احتیاط" کی آڑ میں اودھ کے دو تہائی تعلقداروں کو غداری کے انعام کے طور پر پہلے سے زیادہ موافق شرائط پر اپنی زمینیں واپس مل گئیں۔ اس کے برعکس ہم نے دیکھا ہے کہ باغی کسانوں کے ساتھ کس بے دردی کا سلوک روا رکھا

ہمیشہ انتہائی سختی کا سلوک کرتے جو انگریزوں کے خیر خواہ سمجھے جاتے تھے۔ نہ اُن کی جان محفوظ تھی نہ مال۔ اس لیے یقیناً دیسی باشندوں پر بڑا خوف طاری ہو گیا جس کے سبب بہت سے لوگ ہمارا ساتھ چھوڑ گئے"۔ ۱۸۹

محدود طبقاتی مفاد اور "مسلح و منظم" عوام کے خوف نے جنھیں انگریزوں نے بجا طور پر "دشمن" کا نام دیا۔ بالآخر جاگیردار شرفا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ انقلابی جد وجہد کو ترک کر کے غیر ملکی حاکموں کے ساتھ مصالحت کریں۔ یہ صورتِ حال جاگیرداروں کی غداری اور قومی بغاوت کے دب جانے کا موجب ہوئی لیکن ہندوستانی کسانوں اور لوگوں کے دلوں اور بعد ازاں ان کی تحریک میں جاگیرداری کی تقویت کا سبب نہ بنی۔

ڈاکٹر آر۔ سی۔ موزمدار خود "سپریم گورنمنٹ نیریٹو آف ایونٹس" (Supreme Government Narrative of Events) مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۸۵۷ء میں یہ اقتباس پیش کرتے ہیں: "بغاوت کی عمومی خصوصیت اور باغیوں کی اکثریت کی شناخت ناممکن ہونے کے سبب مجسٹریٹ نے سفارش کی کہ ان تمام دیہاتوں کو سالم طور پر جلا کر تباہ کر دیا جائے جن کے بارے میں یہ ثابت ہو چکا ہے کہ انھوں نے بغاوت میں عملی طور پر حصہ لینے کے لیے آدمی بھیجے"۔ ۱۹۰ یہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں کسانوں کے پارٹ کا برطانوی جائزہ ہے۔ کیا ہندوستان میں کسانوں کے ایسے طبقے کے کندھے پر بندوق رکھ کر جاگیردارانہ نظام کی بحالی ممکن تھی؟

۸۔ خمیازہ اور سبق

۱۸۵۷ء کی بغاوت ایک عہد آفریں تاریخی واقعہ ہے۔ یہ ایک پورے تاریخی دور کے اختتام اور نئے عہد کے آغاز کی علامت ہے۔ جہاں تک انگریزوں کا تعلق ہے اس نے کمپنی کی حکومت کو ختم کر دیا اور برطانوی تاج کے تحت بلا واسطہ حکومت کا موجب ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اجارہ داریا جرون کے دورِ حکومت کا خاتمہ ہوا اور ہندوستان کے معاملات میں برطانیہ کے صنعتی متوسط طبقہ کا غلبہ شروع ہوا۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے بغاوت ناکام ہوئی لیکن ہندوستانیوں کو وہ تجربہ حاصل ہوا جس سے وہ نئے خیالات کے ساتھ نئی بنیادوں پر جدید ہندوستانی قومی تحریک تعمیر کرنے کے قابل ہو گئے اور ۱۸۵۷ء کے اسباق بے بہا ثابت ہوئے۔ فریقین نے ۱۸۵۷ء کے تجربے سے سبق حاصل کیے اور بعد میں ان سے استفادہ کیا۔ انگریز فاتح تھے، انھوں نے جلد اقدامات کیے۔ ہم مفتوح

اور اگلے ہی دن برطانوی وزیر اعظم نے ہندوستان کو ایک وزارتی وفد بھیجنے کا اعلان کردیا اور ہندوستان کی آزادی کے لیے گفت وشنید شروع ہوگئی۔

ہندوستان میں نظامِ حکومت کو از سرِ نو مرتب کیا گیا اور دفتری حکومت کا بھاری ڈھانچہ قائم کیا گیا جس میں ہندوستانیوں کو صرف ادنیٰ اسامیوں پر مامور کیا جاتا۔ اصلی طاقت اور ذمّہ داری انگریزوں کے ہاتھ میں تھی۔ ملکہ کے اعلان میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ سرکاری ملازمت میں ہندوستانیوں کے خلاف کوئی نسلی امتیاز روا نہ رکھا جائے گا، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔

"۱۸۵۷ء میں برطانوی تاج کے براہِ راست حکومتِ ہند کو سنبھالنے کے بعد پہلے پچیس برسوں کے دوران شاید ہی کوئی ہندوستانی سول سروس (Civil Service) میں لیا گیا ہو۔ اگرچہ صدی کے اختتام سے کچھ گنتی کے ہندوستانی اس اعلیٰ ملازمت میں ہر سال بھرتی ہوتے رہے لیکن ۱۹۱۹ء تک یعنی شہنشاہی اقدار کے عروج کے دوران ان کا تناسب زیادہ نہ تھا۔ شدید نسلی امتیاز تمام ملازمتوں میں سرایت کیے ہوئے تھا اور نسل پرستی انیسویں صدی میں سرزمینِ مشرق میں برطانوی حکومت کی امتیازی خصوصیت تھی.... اگرچہ ہندوستانی کھلے مقابلے کے امتحان کے ذریعے انڈین سول سروس میں بھرتی ہوسکتے تھے لیکن خاص درجوں سے اوپر کے عہدوں پر انھیں فائز ہونے کا حق حاصل نہ تھا۔ اپنے زمانے کے ممتاز ترین ہندوستانی حاکم آر۔ سی۔ دت کو استعفیٰ پیش کرنا پڑا کیوں کہ نسلی امتیاز کی بنا پر انھیں کمشنر کے عہدے پر مامور نہ کیا گیا۔

"برطانیہ کے تحت ہندوستان نے ایک طاقتور ملک کی حیثیت حاصل کی اور یہ اس دفتری حکومت کا کارنامہ تھا جسے احتیاط کے ساتھ مرتب اور بڑے اہتمام کے ساتھ منظم کیا گیا اور شان وشوکت کے ساتھ قائم رکھا گیا۔ ہندوستان میں برطانیہ کے دفتری نظام سے مراد صرف سرکاری اہلکاروں کی جماعت ہی نہ تھی بلکہ یہ ایک حکمران ادارہ تھا جو ہندوستان میں چار پانچ اہم ترین عہدوں کے سوا بھی اسامیوں پر قابض تھا۔ سرکاری پالیسیاں وضع کرنے میں ان کو سب سے زیادہ دخل تھا اور ان پالیسیوں کو عمل میں لانے کا کام انھیں کے ذریعے انجام پاتا تھا۔"[۱۹۵]

۱۸۵۷ء کے بعد سرسید احمد خاں نے بھی سیاسی طور پر یہ مشورہ دیا تھا کہ مجلس قانون ساز میں ہندوستانیوں کو بھی شریک ہونا چاہیے تاکہ لوگوں کے ساتھ سرکار کا رابطہ قائم رہے۔ ۱۸۶۱ء میں انڈین کونسل ایکٹ کی رو سے مجلس قانون ساز میں قانون وضع کرنے کی غرض سے غیر سرکاری اراکین کی شمولیت کا بھی اہتمام کیا گیا۔ ۱۸۶۲ء میں اس طرح تین ہندوستانیوں کو نامزد کیا گیا۔ ان قانون ساز

گیا۔ زمینداروں پر خاص لطف و عنایت اور کسانوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا ۱۸۵۷ء کے بعد حکومت کی مسلمہ پالیسی بن گئی۔

کسانوں کے طبقے کو اس نئی حقیقت کا اچھی طرح احساس ہوا لیکن کچھ حقوق رعیت داری حاصل کرنے سے پہلے انھیں ملک گیر قحط اور زرعی فسادات کے مصائب کا شکار ہونا پڑا۔ جس طرح برطانوی پالیسی سے قدیم دیہاتی برادری تباہ ہوگئی تھی اسی طرح نئے تلخ تجربے سے روایتی راہنماؤں کی حیثیت سے زمینداروں کے ساتھ گاؤں کے روایتی اتحاد کا رشتہ بھی ٹوٹ گیا۔ طبقاتی جدوجہد دیہات میں بھی پھیل گئی۔ جب جدید قومی تحریک نے کسانوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تو ہندوستانی کسانوں کا طبقہ زمینداروں سے لڑنے کے لیے قومی تحریک کی حمایت پر آمادہ ہوگیا کیوں کہ زمینداران کی کمائی ہڑپ کرنے والے ۱۸۵۷ء کے غدار اور دیہات میں برطانوی حکومت کے ستون تھے۔

سپاہیوں کے غدر کے بعد جس سے سارے ملک میں شورش کی آگ بھڑک اٹھی تھی، فوج کو از سرِ نو منظم کیا گیا۔ برطانوی فوجیوں کا تناسب بڑھایا گیا۔ انھیں خاص طور پر "قبضہ رکھنے والی فوج" کی حیثیت سے استعمال کیا جاتا تاکہ اندرونی امن و امان کو قائم رکھا جا سکے۔ ہندوستانی فوجیوں کو غیر ممالک میں فوجی خدمت انجام دینے کے لیے منظم کر کے تربیت دی گئی تاکہ برطانوی سلطنت کے لیے ایشیائی اور افریقی علاقوں کو فتح کیا جائے۔ توپخانہ ہندوستانیوں سے واپس لے لیا گیا۔ تمام اعلیٰ عہدے انگریزوں کے لیے مخصوص کر دیے گئے۔ اب ہندوستانی کو کنگس کمیشن (Kings Commission) بھی نہ مل سکتا تھا اور نہ ہی فوجی ہیڈ کوارٹرز میں کوئی ملازمت مل سکتی سوائے کلرک کی حیثیت سے جسے صرف غیر فوجی کام سپرد کیا جاتا۔ ہندوستانی رجمنٹوں کو "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے اصول پر از سرِ نو منظم کیا گیا اور فوج کی بھرتی کو صرف نام نہاد جنگجو نسلوں تک محدود کیا گیا۔

لیکن آخر سب کچھ کرنے کے باوجود کوئی چیز انگریزوں کے آڑے نہ آئی۔ ۱۸۵۷ء کے دوران ہندوستانی سپاہیوں کے کارناموں کی یاد نہ صرف ہندوستانی عوام کے دلوں سے کبھی محو نہ ہوئی بلکہ ہندوستانی مسلح افواج کے دلوں سے بھی۔ خواہ ہندوستانی فوج کو کتنا ہی دوبارہ منظم کیا گیا۔ جب جدید قومی تحریک نے زور پکڑا تو یہ فوج اس کے اثر سے نہ بچ سکی۔ ۱۹۳۰ء کی قومی تحریک کے دوران گڑھوالی فوجوں نے پشاور میں ہندوستانی مظاہرہ کرنے والوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد قومی شورش کے دوران ہندوستانی بری اور ہوائی افواج میں یکے بعد دیگرے "غدر" ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸ فروری ۱۹۴۶ء کو ہندوستانی بحری فوج میں بغاوت ہوگئی

میں دوستی پیدا نہیں کی بلکہ پُرامن شہری بھی نہیں بنایا۔"۱۹۸

کلکتہ ان جدت پسند تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اس وقت وہ خود ہندو قدامت پسندی کے خلاف جہاد میں ہمہ تن مصروف تھے اور باغیوں کے مقصد پر جو مذہب کا رنگ چڑھایا گیا تھا اس سے انھیں سخت نفرت تھی۔ اپنے تاریخی وجود کی ابتدا اور سیاسی تجربہ کی کمی کے سبب وہ اپنی ترقی کو غلطی سے برطانوی حکومت کی دین سمجھتے تھے۔ مگر وہ ایسے "وفادار اور نمک حلال" نہ تھے جیسا کہ ارل گرینول کا خیال تھا۔ وہ برطانوی حکمرانوں کے ہاتھ بندھے غلام نہ تھے۔ ۱۸۵۷-۵۸ء کی بغاوت کے دبنے کے بعد اگلے ہی سال میں یہ بات ثابت ہوگئی جب بنگال کے روشن خیال طبقے نے بغاوتِ نیل (Indigo Revolt) میں اتحادِ عمل کے لیے بہار اور بنگال کے کسانوں سمیت سارے بنگال کو اکسایا۔ یہ کسان کھیتوں کے برطانوی مالکوں کے بے قیاس ظلم اور لوٹ کھسوٹ کا شکار تھے۔ یہ سریندر ناتھ بنرجی تھا جس نے انڈین سول سروس کے امتحان کے لیے عمر میں کمی کے خلاف سارے ہندوستان میں تحریک چلانے کی ابتدا کی کیوں کہ یہ کمی بظاہر ہندوستانی امیدواروں کے مفاد کے منافی تھی۔ اس کے بعد البرٹ بل، عدالتوں میں نسلی امتیاز اور ورنیکلر پریس ایکٹ وغیرہ سے متعلق مہموں کا آغاز ہوا۔ جب روشن خیال طبقے نے برطانوی تاج کے تحت ہندوستان کی حالت کو ابتر ہوتے دیکھا تو ملکہ وکٹوریہ کے ۱۸۵۸ء کے اعلان سے متعلق ان کا یہ فریب کہ یہ ہندوستانیوں کا منشورِ آزادی ہے، آہستہ آہستہ کافور ہوگیا اور انھوں نے سیاسی اصلاحات کے لیے شورش شروع کردی۔ ۱۸۸۲ء میں ہندوستانی قوم پرستی کے باوا آدم دادا بھائی نوروجی نے لکھا:

"ہندو، مسلمان اور پارسی یکساں طور پر پوچھتے ہیں کہ آیا برطانوی حکومت ایک برکت ہے یا لعنت۔ یہ اب کوئی راز کی بات نہیں ہے اور نہ کوئی ایسی صورتِ حالات ہے جو ہمارے ان حکمرانوں پر آشکار نہیں جو آنکھیں رکھتے ہیں۔"۱۹۹

رفتہ رفتہ ہندوستانی روشن خیال طبقے کو تلخ تجربے کی بنا پر معلوم ہوگیا کہ انسانی مساوات اور سیاسی جمہوریت کے برطانوی اصول ہندوستان کے لیے نہیں تھے۔

رابندر ناتھ ٹیگور خود ہندوستان کے روشن خیال طبقے کی قدیم اور جدید پشتوں کے بیچ کی کڑی تھے اور ہم عصر اور بعد میں آنے والے روشن خیال طبقات کے نظریاتی مقامات کے عبوری دور کے ترجمان۔ انھوں نے اپنی ۸۰ ویں سالگرہ (مئی ۱۹۴۱ء) کے موقع پر ایک پُرخلوص اور پُراثر خطبے میں یہ کہا:

مجالس میں حقیقی اختیار صرف انگریز حکام کے ہاتھ میں تھا البتہ ہندوستانی وطن پرست سیاستداں انھیں ہندوستانیوں کے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرتے تھے اور برطانوی پالیسیوں کی پردہ دری کرکے قومی تحریک کی ترقی میں مدد دیتے۔ انگریزوں کی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پالیسی ایک اور طریقے سے کامیاب ہوئی۔ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخابات کا اجرا دو قوموں کے اس زہریلے نظریہ کا پہلا اظہار تھا جو حصولِ آزادی کے عین موقع پر ملک کی تقسیم کا موجب ہوا۔

برطانوی سرکار جو شروع میں سماجی اصلاح کے اقدامات پر فخر کرتی تھی، مثلاً ستی کی رسم کا انسداد، بیوہ کی شادی وغیرہ، ۱۸۵۷ء کے تجربے اور ہندوستانی جاگیردار رجعت پسندوں کے ساتھ اتحاد کے بعد تمام ترقی پسندانہ سماجی اقدامات کی مخالف ہوگئی۔ "ہندو قانون زیادہ تر رواجی تھا۔ چوں کہ رواج تبدیل ہوجاتے ہیں اس لیے قانون کا اطلاق مختلف طریقوں سے ہونے لگا۔ ہندو قانون میں کوئی ایسی دفعہ نہیں تھی جو رواج سے نہ بدلی جاسکتی تھی۔ انگریزوں نے اس لچکدار رواجی قانون کی جگہ عدالتی فیصلے رائج کردیے جو پرانے شاستروں پر مبنی تھے۔ یہ فیصلے ایسی قانونی نظیریں بن گئے جن کا سختی کے ساتھ پابند ہونا پڑتا تھا۔ تبدیلی صرف قطعی قانون وضع کرنے سے ہوسکتی تھی لیکن برطانوی سرکار جو قانون سازی کی مجاز تھی، رجعت پسندانہ طبقات کو اپنا مخالف نہیں بنانا چاہتی تھی کیوں کہ یہ ان کی امداد پر بھروسہ رکھتی تھی۔ بعد میں جب منتخب اسمبلیوں کو قانون سازی کے کچھ اختیارات دیے گئے تو بذریعہ قانون سماجی اصلاح کو فروغ دینے کی ہر کوشش پر حکام چیں بجبیں ہوتے اور اس کی سخت حوصلہ شکنی کرتے"[۱۹۶] اس طرح ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں برطانوی سرکار سماجی رجعت پسندی کی حامی ہوگئی۔

برطانوی فرمانرواؤں نے ایک انگریزی پڑھا لکھا ہندوستانی متوسط طبقہ پیدا کردیا تھا تاکہ ملک، حکومت کی ادنیٰ مگر ضروری کرسیوں کے لیے ایک سستا، قابل اور قومیت سے کورا ہندوستانی عملہ حاصل ہوجائے۔ "تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے سپاہیوں کے غدر میں کوئی حصہ نہ لیا۔ اس افراتفری کے دور میں انھوں نے برطانوی حکام کے ساتھ وفاداری اور نمک حلالی کا اظہار کیا گو ان پر اس کے برعکس الزامات عائد کیے گئے۔"[۱۹۷]

مذکورہ بالا بیان پورے طور پر درست نہیں ہے۔ ڈاکٹر سین لکھتا ہے: "جدید وضع کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی یہ قلیل تعداد بھی حکومت کی حمایت میں متفق الرائے نہ تھی۔ بنگال کا تعلیم یافتہ ہندو صدی بھر کی بے کم و کاست ستم رانی کا شاکی تھا جس میں دل جوئی کے لیے فراخدلی کا ایک شمہ بھی شامل نہ تھا۔" وہ مزید لکھتا ہے: "ایک دوسرے کے ساتھ سو سال یا اس سے بھی طویل ترمیل جول نے ہندوؤں اور

کارخانہ دار طبقہ یہاں نسبتاً کم قیمت پر مال بیچنا چاہتا تھا لیکن اب پانسا پلٹ گیا ہے۔ کارخانہ داروں پر یہ حقیقت آشکار ہو گئی ہے کہ ہندوستان کو خام مال پیدا کرنے والے ملک میں تبدیل کرنا ان کے وجود کے لیے صد درجہ ضروری ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر سب سے بڑھ کر یہ لازم ہے کہ اسے آبپاشی کے وسائل اور اندرونی ذرائع آمد و رفت بہم پہنچائے جائیں۔[۲۱۸]

ہندوستان میں پیداوار کی قوتیں مفلوج ہو چکی تھیں۔ برطانوی شہنشاہیت پرستوں کو ہندوستان میں بھاپ، ریلوے، آبپاشی وغیرہ کے اہتمام کی صورت میں اقتصادی اقدامات کرنے پڑے تاکہ یہ ان مصنوعات کے عوض خام مال پیدا اور برآمد کر سکے جو برطانوی شہری متوسط طبقہ ہندوستان کی منڈی میں کم قیمت پر بیچنے کے لیے بھیجتا تھا۔

ہندوستان کی قومی تحریک کی ترقی کے ساتھ ہندوستانی ماہرینِ معاشیات نے محققانہ طریق پر بیش قیمت کتابیں لکھیں جن سے ثابت ہوتا تھا کہ کس طرح برطانوی پالیسی خود غرضی پر مبنی تھی اور کس طرح ہندوستانی مفادات کو برطانوی مفادات پر قربان کیا جاتا تھا۔ ان تصنیفات نے قومی بیداری کو بڑھانے میں مدد دی لیکن ان میں عیب یہ تھا کہ ان کا اندازِ فکر غیر متحرک اور قیاسی تھا۔ ہندوستان میں برطانیہ کے کردار سے متعلق مارکس کو کوئی مغالطہ نہ تھا۔ اس نے بیان کیا: "ہندوستان میں برطانوی حکومت سراسر بے خبرتی کی ہے"[۲۱۹] لیکن اس نے اپنی محققانہ نگاہ سے انگلستان کو "تاریخ کا غیر شعوری حربہ قرار دیا"[۲۲۰] اس نے پیش گوئی کی کہ انگلستان جو کچھ ہندوستان کے وسائل پیداوار کو کام میں لانے کے لیے کرے گا یہ بالآخر اس کی تباہی کی مہر ثابت ہو گا۔

اس نے پہلے سے ہی یہ بھانپ لیا: "جب ایک بار کسی ایسے ملک کے ذرائع باربرداری میں مشینوں کا استعمال شروع کر دیا جائے جس میں لوہا اور کوئلہ موجود ہو تو اسے اس کی مصنوعات سے محروم رکھنا ممکن نہیں اس لیے ہندوستان میں ریلوے سسٹم جدید صنعت وحرفت کا پیش خیمہ ثابت ہو گا۔ اس کا احتمال اور بھی زیادہ ہے کیونکہ برطانوی حکام نے ہندوؤں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو سراسر نئی قسم کے کام کے متعلق ڈھالنے کے لیے خاص استعداد پیدا کریں اور مشینوں سے متعلق ضروری علم حاصل کریں جدید صنعت جو ریلوے سسٹم سے وجود میں آئے گی پیشوں کی موروثی تقسیم کو ختم کر دے گی جس پر ہندوستانی ذات پات کا مدار ہے۔ یہ ذات پات ہندوستان کی ترقی اور قوت کی راہ میں قطعاً حائل ہے۔"[۲۲۱]

یہی عمل باوجود انگریزوں کی مخالفت کے ہندوستان کی جدید صنعتوں کی ابتدا اور ترقی کا موجب ہوا۔ ہندوستان کے تجارتی متوسط طبقے کے عام مختار کاروں سے ہندوستان کا صنعتی متوسط طبقہ پیدا ہوا۔

"جب میں ماضی کے گذشتہ برسوں کی دور دراز وسعت پر نظر ڈالتا ہوں اور اپنی ابتدائی نشو و نما کی تصویر صاف صاف دیکھتا ہوں تو مجھے اس تبدیلی پر حیرت ہوتی ہے جو میرے اپنے اندازِ فکر میں اور اپنے ہموطنوں کی نفسیات میں واقع ہوئی ہے ایسی تبدیلی جو انتہائی المناک واقعہ کا سبب ہوگی۔

اس زمانے کے تعلیم یافتہ لوگ انگریزی زبان اور ادب کے شیدائی تھے۔ دن رات برک کی شاندار تقریریں اور میکالے کے طویل اور رواں جملوں کی تقلید میں فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھائے جاتے تھے شیکسپیئر کے ڈرامے، بائرن کی شاعری اور سب سے بڑھ کر انیسویں صدی کی برطانوی سیاسیات کی فراخدلانہ حریت پسندی بحث و مباحثہ کے خاص موضوع تھے۔

"اس وقت اگرچہ قومی آزادی حاصل کرنے کے لیے آزمایشی کوششیں جاری تھیں لیکن ہم نے دل سے انگریز قوم کی فیاضی میں اپنا اعتقاد نہ کھویا تھا۔ یہ اعتقاد ہمارے راہنماؤں کے جذبات میں اس مضبوطی سے جڑ پکڑ چکا تھا کہ ان میں یہ امید پیدا ہوگئی تھی کہ فاتح خود اپنے رحم و کرم سے مفتوح کی آزادی کا راستہ ہموار کردے گا۔

"یقیناً حکمرانوں کی بخشش پر ذلت آمیز انحصار رکھنے کی ذہنیت فخر کی کوئی بات نہ تھی۔ البتہ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ ہم نے اس وقت بھی انسانی عظمت کو دل و جان سے تسلیم کرلیا جب یہ اجنبی میں ظاہر ہوئی۔

"قدرتی طور پر میں انگریزوں کو دل سے چاہتا تھا۔ میری زندگی کا پہلا باب یوں ختم ہوا۔ تب ہمارے راستے الگ ہوگئے۔ ایک دردناک احساس کے ساتھ میری آنکھیں کھل گئیں جب یہ حقیقت بڑھتی ہوئی شدت کے ساتھ مجھ پر روشن ہونے لگی کہ جن لوگوں نے تہذیب کے بلند ترین اصولوں کو قبول کیا انھوں نے کتنی بے باکی کے ساتھ انھی اصولوں کو ترک کردیا کیوں کہ ان کے قومی مفاد کا یہی تقاضا تھا۔"[۲۰۰]

ٹیگور کی اس منظر کشی سے ظاہر ہے کہ کس طرح ہندوستان میں برطانوی حکومت سے متعلق ہندوستان کے روشن خیال طبقے کے ابتدائی خوابوں کی تعبیر پوری نہ ہوئی کس طرح اسے نئے نظریات دریافت کرنے پڑے جو ہندوستان کے منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے قومی اعتقاد کی بنیاد بن سکیں۔

اس دور کے اقتصادی میدان میں برطانیہ کی ہندوستان کو لوٹنے کی پالیسی میں اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ مارکس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اس کی خوب تصویر کھینچی ہے:

"برطانیہ عظمیٰ کے حکمراں طبقات نے اب تک ہندوستان کی ترقی میں صرف اتفاقی، عارضی اور شاذ و نادر دلچسپی لی تھی۔ طبقۂ امرا اسے فتح کرنا چاہتا تھا۔ سرمایہ دار طبقے کا مقصد اسے لوٹنا تھا اور

بہر حال مستقبل بعید میں ہم یقیناً اس عظیم اور دل چسپ ملک کے نئے جنم کو دیکھنے کی توقع رکھتے ہیں جس کے ادنیٰ ترین طبقات میں بھی شریف النفس باشندے، اہلِ اٹلی سے زیادہ ہنر مند ہیں، اور ان کی اطاعت میں بھی خاص سنجیدہ شرافت کا رنگ ہے۔ باوجود طبعی سستی کے انھوں نے اپنی بہادری سے انگریز افسروں کو محوِ حیرت کر دیا ہے۔ ان کا ملک ہماری زبانوں اور ہمارے مذاہب کا سرچشمہ رہا ہے۔ ان کے جاٹ قدیم جرمنوں کی اور ان کے برہمن قدیم یونانیوں کی مثال پیش کرتے ہیں:

ہندوستان نہ صرف بذاتِ خود برطانیہ کا نہایت قیمتی انعام تھا بلکہ اس لیے بھی بہت اہم تھا کہ اس نے برطانیہ کو دوسرے ملک فتح کرنے اور اپنی سلطنت کو وسعت دینے کے قابل بنایا۔ کے۔ ایم۔ پانیکر کا بیان ہے: "بلاشبہ ہندوستان ایک عظیم ایشیائی قوت ہے جس کے بل بوتے پر ہی چین کے دروازے پٹ سے کھول دیے گئے اور باقی ایشیا یورپ کی ایک بستی بن کے رہ گیا۔ اگرچہ ہندوستان کی فوجی فتح صرف ۱۸۵۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی لیکن ۱۸۱۸ء تک یہاں برطانیہ کے قدم جم چکے تھے۔ برطانیہ میں صنعتی انقلاب آچکا تھا اور وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ نپولین کے بعد کے دور میں اس نے بحرالکاہل میں اپنا سیاسی اور اقتصادی اقتدار بڑھا لیا۔"[۲۰۶]

۱۸۵۷ء سے پہلے ہی، "ہندوستان سے باہر برطانوی سلطنت کی توسیع کا منصوبہ باندھا گیا تھا اور ہندوستان کی برطانوی سرکار، برطانیہ کے فائدے کے لیے مشرق میں فتح اور الحاق کی خطرناک راہ پر گامزن تھی۔ البتہ اس کا خرچ ہندوستانی محصول گزاروں کے سر پڑا۔"[۲۰۷] اس طرح ملاکا اور سنگاپور پر قبضہ کر لیا گیا۔ برما کو فتح کیا گیا، نیپال اور افغانستان کی جنگیں لڑی گئیں اور جنگِ ایران کا بھی اہتمام کیا گیا۔ برطانوی سلطنت کا عہد جس کی بنیاد ہندوستان پر تھی ۱۸۵۷ء کے بعد شروع ہوا۔ درحقیقت اب ہندوستان محض ایک برطانوی مقبوضہ بستی بن کے رہ گیا۔ اس وقت سلطنتِ ہند ایک براعظم کی حیثیت رکھتی تھی اور ایک ایسا سیاسی نظام وجود میں آیا جس کی بنیاد ہندوستان پر تھی۔ عدن سے ہانگ کانگ تک اس کا سکہ چلتا تھا۔"[۲۰۸] اس دور میں افغانستان اور ایران حقیقتاً برطانیہ کے زیر سایہ تھے۔ شمال میں سنکیانگ اور تبت کو مہمات اور وفد بھیجے گئے اور جنوب مشرقی ایشیا اور چین میں برطانیہ کو ایک مستحکم مقام حاصل ہو گیا۔

"اس براعظم کے نظام میں ہندوستان کو ادنیٰ درجے کی شرکت حاصل تھی۔ برطانیہ کی بڑھتی ہوئی نوآبادیوں کی صنعت و کاشت کے کارخانوں میں ہندوستانی بطور سپاہیوں، تاجروں، سود خوروں اور قلیوں کے کام کرتے تھے۔ ہندوستان کے مادی اور انسانی وسائل سے نہ صرف فتح کرنے بلکہ برطانیہ کی

اور کنگال کسانوں سے انقلاب پسند مزدوروں کا طبقہ وجود میں آیا۔ ہندوستانی سماج میں یہ دو جدید طبقات ہیں جنہوں نے ہندوستان کی قومی تحریک کو ایک نیا جمہوری رنگ دیا اور اسے کامیابی حاصل کرنے میں مدد دی۔ یہی طبقات اس نوآبادیاتی پس ماندگی کو ملک کی صنعتی ترقی کے ذریعہ ختم کرنے کا سبب ہوں گے جو برطانوی شہنشاہیت چھوڑ گئی ہے۔

انگریزوں نے اپنا اُلو سیدھا کرنے کی غرض سے تعلیم یافتہ ہندوستانی متوسط طبقہ پیدا کیا اور اسے بابو طبقے کا نام دے کر اس کی ہنسی اڑائی۔ البتہ یہی طبقہ ہندوستان کا انقلابی اور ترقی پسند روشن خیال طبقہ بن گیا اور قومی تحریک میں اس نے نمایاں حصہ لیا۔ مارکس نے پیش گوئی کی کہ: "ایک نیا طبقہ وجود میں آرہا ہے جو حکومت کی ضروریات کو پورا کرنے کے اہل ہے اور یورپی سائنس سے بخوبی آشنا ہے:"

ہندوستان کے استحصال اور اس پر قابو رکھنے کی غرض سے انگریزوں نے ہندوستان میں سیاسی اور معاشی مرکزیت قائم کی۔ یہی سیاسی اتحاد بالآخر سارے ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف قومی بیداری کی ترقی اور تحریک آزادی کی ابتدا کا موجب ہوا۔ مارکس نے ہندوستان کے "سیاسی اتحاد" کو اس کے کایا پلٹ کی پہلی شرط قرار دیا۔

بقول مارکس: "بھاپ نے ہندوستان اور یورپ کے درمیان آمدورفت کا ایک باقاعدہ اور تیز سلسلہ قائم کر دیا ہے۔ اس کے بڑے بڑے بندرگاہوں کو جنوب مشرقی سمندر کی بندرگاہوں کے ساتھ ملا دیا ہے اور اسے الگ تھلگ ہونے کی حالت سے بچا لیا ہے جو اس کے جمود کا اصلی سبب تھا۔"

مارکس نے ہندوستان کے اس دور میں برطانیہ کے پارٹ کا یوں ذکر کیا ہے:

"برطانوی شہری متوسط طبقہ مجبوراً خواہ کچھ بھی کرے اس سے نہ تو عوام کو سماجی مجبوری سے نجات ملے گی اور نہ ہی ان کی سماجی حالت میں قابلِ قدر اصلاح ہوگی۔ اس کی قوت کا انحصار نہ صرف پیداوار کی ترقی پر ہے بلکہ عوام کے اس پر اختیار حاصل کرنے پر بھی ہے۔ لیکن ایک بات جو وہ ضرور کریں گے وہ یہ ہے کہ ان دونوں صورتوں کے لیے وہ ضروری وسائل فراہم کر دیں گے۔ کیا شہری متوسط طبقے نے کبھی اس سے زیادہ کیا ہے؟ کیا اس نے کبھی افراد اور قوم کو خون خرابہ اور مصیبت و ذلت میں مبتلا کیے بغیر ترقی کی ہے؟"

مارکس نے اپنے نتائج پیش گوئی کے طور پر یوں بیان کیے ہیں:

"ہندوستانی اس وقت تک ان نئے بیجوں کا پھل نہیں پائیں گے جو برطانیہ کے شہری متوسط طبقے نے ان کے درمیان بکھیرے ہیں جب تک خود برطانیہ عظمیٰ میں صنعتی مزدوروں کا طبقہ نئے حکمران طبقے کی جگہ نہیں سنبھال لیتا یا جب تک خود ہندو اتنے طاقتور نہیں ہو جاتے کہ برطانوی غلامی کا جوا یکسر اتار پھینکیں۔"

پالیسیوں کی پرزور مخالفت کی اور زاغلول پاشا کے تحت مصریوں کی جدوجہد کے ساتھ یکجہتی کا ثبوت دیا۔ ۱۹۳۰-۳۹ء کے دوران اس نے جاپانی حملہ آوروں کے خلاف چینیوں کی جدوجہد اور نازی شاہی کے خلاف عالمگیر تحریک وغیرہ کے ساتھ عملی یک جہتی کا اظہار کیا۔ اس لیے یہ محض اتفاق نہ تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد ہندوستان دنیا کی ایک بڑی طاقت بن کر نمودار ہوا اور امنِ عالم اور تمام محکوم قوموں کی آزادی کا علمبردار بنا۔

ان اسباق کا ہم پہلے ہی تجزیہ کر چکے ہیں جو برطانوی شہنشاہیت پرستوں نے اپنی ہندوستانی سلطنت کی برقراری اور استحکام کے لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے اخذ کیے اور نیز ان اسباق کا ہندوستانیوں نے ایک نئی قومی تحریک آزادی کی تعمیر کے لیے حاصل کیے۔ فریقین نے ۱۸۵۷ء کے تجربے کو اپنے دستور العمل کی بنیاد بنایا۔

جے۔ آر۔ سیلے نے "دی ایکسپینشن آف انگلینڈ" (The Expansion of England) میں ۱۸۸۳ء میں لکھا: "جوں ہی کسی غدر کا خطرہ درپیش ہوگا وہ محض غدر نہیں بلکہ عوام کے جذبۂ قومیت کا اظہار ہوگا۔ اسی وقت ہمارے سلطنت کے تحفظ کی تمام امیدیں اور آرزوئیں بھی خاک میں مل جائیں گی۔"[۲۱۱] ایسا دن بالآخر آیا اور فرنگیوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے ۱۸۵۷ء کے بعد ہماری قومی تحریک کو پھیلنے، زور پکڑنے اور پروان چڑھنے میں پورے نوے سال لگے۔

البتہ ان بیچ کے برسوں میں ۱۸۵۷ء کی یاد نے ہندوستانیوں کے جوش کو ابھارا جس نے انگریزوں کو پریشان کیا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی پچاسویں سالگرہ یعنی ۱۹۰۷ء کے دوران کیر ہارڈی ہندوستان میں اپنے تجربات کو بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ برطانوی حکام کس قدر اضطراب میں مبتلا تھے۔[۲۱۲] ایڈورڈ تھامپسن نے ۱۹۲۵ء میں لکھا: "بہت سے ہندوستانیوں کے ذہن میں جب وہ کسی انگریز سے بات کرتے ہیں تو غدر کا تصور تیزی سے گھومنے لگتا ہے گویا ایک بھوت ہے جس کی تسکین نہیں ہوئی اور جو انتقام کے لیے بے قرار ہے۔"[۲۱۳] ہندوستان کو آزاد کر کے ہم نے ۱۸۵۷ء کے اپنے باغی آباواجداد کی روحوں کو مطمئن کر دیا ہے۔ اپنے مستقبل کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں سنبھال لی ہے اور جن قوموں نے آزادی کی جدوجہد میں ہماری امداد کی ان کے احسان کا قرض چکانا شروع کر دیا ہے۔

حواشی

میجر بی۔ ڈی۔ باسو۔ "رائز آف دی کرسچین پاور ان انڈیا" (Rise of the Christian

نوآبادیاتی سلطنت کے قیام اور اہتمام میں بھی کام لیا گیا۔

البتہ یہ تصویر کا صرف ایک رُخ تھا۔ کہتے ہیں کہ ہندوستانی بغاوت کے لیے غیرملکی حمایت حاصل کرنے کی غرض سے نانا صاحب کے نمائندے عظیم اللہ نے روس اور ترکی کے ساتھ رابطہ قائم کر رکھا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ستارا کے نمائندے رنگو باپوجی نے عظیم اللہ کے ساتھ مل کر کام کیا تھا۔ بہادر شاہ کا دربار ایران کی حمایت کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ سب کچھ اس قدیم اصول کی بنا پر عمل میں آیا کہ برطانیہ کے دشمن ہمارے دوست ہیں۔ لیکن برطانیہ اس دور کی عظیم ترین طاقت تھا۔ ان ملکوں کے جاگیردار حکمران طبقے کبھی بھی ہندوستانی بغاوت کی مدد کرنے میں جلد بازی سے کام نہ لے سکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کر سکتے تھے کہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور نتیجہ کا انتظار کریں۔

البتہ ان ملکوں اور دوسرے ملکوں میں جمہوریت پسند طبقات کا یہ وطیرہ نہ تھا جیسا کہ اس کتاب کے بین الاقوامی باب میں مطبوعہ مقالات سے ظاہر ہے۔ مہذب دنیا کے تمام جمہوریت پرست حلقوں میں ہندوستانی بغاوت کے لیے بڑی ہمدردی پائی جاتی تھی۔ ہندوستان کی قومی بغاوت کے ساتھ چارٹسٹ (Chartists) راہنماؤں کی یک جہتی کی بہت بڑی اور تاریخی اہمیت ہے۔ برطانیہ کے مزدوروں کی جدید تحریک کا آغاز منشوریوں (چارٹسٹس) کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہندوستان کی جدید قومی تحریک کا آغاز ۱۸۵۷ء سے ہوتا ہے۔ اس امر کی یاد سے ایک نئی برادری کا تصور پیدا ہوتا ہے کہ برطانوی مزدوروں کے طبقے اور ہندوستانی عوام نے اپنی اپنی تحریکوں کے آغاز سے ہی ایک دوسرے کا ساتھ دیا ہے۔ شہنشاہیت پرستی کے خلاف چینی اپنی جدید قومی تحریک کی ابتدا تائی پنگ بغاوت سے تصور کرتے ہیں جیسا کہ ہم ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے۔ چینی مقالہ اس داستان کو جو آج تک معلوم نہ تھی قلمبند کرتا ہے کہ چینیوں نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تھا اور ہندوستانی سپاہی فرار ہو کر تائی پنگ باغیوں کے ساتھ مل گئے اور ان کے کندھے سے کندھا ملا کر مشترکہ دشمن کے خلاف لڑے۔ مارکس نے اس نئی حقیقت کو سمجھ لیا اور کہا: "اینگلو انڈین فوج میں بغاوت اس عام بے زاری کے ساتھ رونما ہوئی ہے جو ایشیا کی بڑی بڑی قوموں نے اقتدارِ اعلیٰ کے خلاف ظاہر کی ہے۔ بلاشبہ بنگالی فوج کی بغاوت کا ایران اور چین کی جنگوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔"[۲۱۰]

پس ۱۸۵۷ء کی عظیم قومی بغاوت نے اگلے دور کی ہندوستانی جدوجہد کے ساتھ عالمگیر جمہوری یک جہتی کی بنیاد ڈالی اور ہماری نئی قومی تحریک خود صحیح بین الاقوامی روایات پر قائم ہوئی۔ مثال کے طور پر ہندوستانی قومی تحریک نے ۲۹-۱۹۲۰ء کے دوران مشرق وسطیٰ میں شہنشاہیت پرستانہ

۱۹۔ مالیسن: "انڈین میوٹنی" جلد چہارم صفحہ ۳۸۱

۲۰۔ مارکس: مقالہ بے دستخط ۱۴ اگست ۱۸۵۷ء بحوالہ پرچہ

۲۱۔ موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۸

۲۲۔ مارکس: The Future Results of British Rule in India
بحوالہ پرچہ ۸ اگست ۱۸۵۳ء

۲۳۔ مارکس: مقالہ بلا دستخط۔ بحوالہ پرچہ ۱۵ جولائی ۱۸۵۳ء

۲۴۔ مارکس: "برٹش رول ان انڈیا"۔ بحوالہ پرچہ ۲۵ جون ۱۸۵۳ء

۲۵۔ مارکس: "دی نیٹو اسٹیٹس"۔ بحوالہ پرچہ ۲۵ جولائی ۱۸۵۸ء

۲۶۔ ولیم ہووٹ: System of Territorial Acquisition جلد اول صفحہ ۱۲

۲۷۔ گرانٹ ڈف: "ہسٹری آف مرہٹہ" مطبوعہ ۱۸۶۳ء جلد اول صفحہ ۲۴۰

۲۸۔ مالیسن: "ہسٹری" جلد اول صفحات ۴۹-۳۴۸

۲۹۔ ایم۔آر۔گبنس: An Account of the Mutinies in Oudh Pages 57-58

۳۰۔ "پارلیمنٹری پیپرز ۳۲-۱۸۳۱ء جلد ۱۴، پیپر ۷۳۵- VI صفحہ ۱۴۶"

۳۱۔ شور: Notes 1, 4, 10. Page 116

۳۲۔ منقول از تصنیف موزمدار صفحہ ۲۰

۳۳۔ منقول از تصنیف ایس۔بی۔چودھری Civil Disturbances in India P. XXII

۳۴۔ رسل: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۱۴۶

۳۵۔ منقول از تصنیف نہرو: "ڈسکوری آف انڈیا" صفحہ ۲۷۳

۳۶۔ منقول از تصنیف چودھری صفحہ ۲۱۰

۳۷۔ منقول از تصنیف چودھری صفحات ۲۱۰-۲۱۱

۳۸۔ سرسید احمد خاں: The Causes of the Indian Revolt P44

۳۹۔ ایس۔این۔سین: Eighteen fifty-Seven. P.32

۴۰۔ منقول از تصنیف چودھری صفحہ ۲۱۵

۴۱۔ ایضاً صفحہ ۲۰۵

۴۲۔ شور: Notes 1, P 166

(Power in India) مطبوعہ ۱۹۳۱ء صفحہ ۹۵۳

۲. جان ولیم کے: "اے ہسٹری آف دی سپاہی وار" (A History of the Sepoy war) جلد اول صفحات ۱۷-۶۱۶

۳. کارل مارکس: مقالہ بلا دستخط: "دی انڈین کوئسچن" ('The Indian Question') نیویارک، ڈیلی ٹریبیون، مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۵۷ء (انسٹی ٹیوٹ آف مارکسزم لینن ازم برلن کا عکسی نسخہ)

۴ منقول از تصنیف وی۔ ڈی۔ ساورکر: "انڈین وار آف انڈیپنڈنس" (Indian war of Independence) صفحہ ۱۲

۵. چارلس بال: انڈین میوٹنی (Indian Mutiny) جلد اول، صفحہ ۶۴۲

۶. ڈبلیو۔ ایچ۔ رسل: "مائی ڈائری ان انڈیا ان دی ایر ۱۸۵۸-۵۹ء" (My Diary in India in the year 1858-59) صفحہ ۱۶۴

۷. کرنل جی۔ بی۔ مالیسن: "انڈین میوٹنی آف ۱۸۵۷ء" (Indian Mutiny of 1857) دیباچہ صفحہ viii

۸. منقول از تصنیف ساورکر صفحہ ۲۵۷

۹. منقول از تصنیف آر۔ سی۔ موزمدار: The Sepoy Mutiny and Revolt of 1857 صفحہ ۲۲۴

۱۰. "نیریٹو آف ایونٹس، کانپور ۱۸۵۷-۵۸ء" نمبر ۶۸

۱۱. ایضاً: جھانسی ۱۸۵۷-۵۸ء

۱۲. ایضاً: میرٹھ نمبر ۶، ۴۹، ۱۸۵۸ء

۱۳. منقول از تصنیف ساورکر صفحہ ۲۸۱

۱۴. موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۵

۱۵. مالیسن: "ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی" جلد دوم صفحات ۸۶-۲۸۵

۱۶. ایضاً: جلد چہارم صفحہ ۲۲۷

۱۷. منقول از تصنیف ساورکر صفحات ۱-۵۰۰

۱۸. رسل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۰۰

۶۳۔ مارکس: "The East India Company: Its History and Results" New York, Daily Tribune, July 11, 1953

۶۴۔ رام کرشن مکرجی: The Rise and Fall of the East India Company: Page 174

۶۵۔ کے۔ایم۔پانیکر: Asia and Western Dominance P. 99

۶۶۔ علامہ فضل حق خیرآبادی: "دی اسٹوری آف دی وار آف انڈپینڈنس ۵۸-۱۸۵۷ء" جو "جرنل آف دی پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی" جلد پنجم مورخہ یکم جنوری ۱۹۵۷ء صفحہ ۲۹ میں شائع ہوا۔

۶۷۔ "نیشنل ہیرلڈ" ۱۰ر مئی ۱۹۵۷ء

۶۸۔ ایضاً

۶۹۔ مکرجی: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۳

۷۰۔ آر۔سی۔دت: The Economic History of India in the Victorian Age P. XV

۷۱۔ منٹگمری مارٹن: "ایسٹرن انڈیا" دیباچہ، جلد اول

۷۲۔ ایضاً دیباچہ، جلد سوم

۷۳۔ مکرجی: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۵-۲۲۴

۷۴۔ مارکس: "دی برٹش رول ان انڈیا" مطبوعہ نیویارک ڈیلی ٹربیون" مورخہ ۲۵ر جون ۱۸۵۳ء

۷۵۔ مارکس۔اینجل: "سیلکٹڈ ورکس" جلد اوّل صفحہ ۲۲۵

۷۶۔ خان: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۴

۷۷۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اوّل صفحہ ۳۸۱

۷۸۔ رابرٹس: "فارن ایرس ان انڈیا" صفحہ ۴۳۱

۷۹۔ بال: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۶۲۹

۸۰۔ فضل حق: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۹

۸۱۔ منقول از تصنیف ساورکر صفحہ ۵۵

۸۲۔ ایضاً ، ، صفحہ ۵۶

۸۳۔ ایضاً ، صفحات ۶۲-۶۱

۴۳۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۸۰

۴۴۔ بال: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۶۴۴

۴۵۔ سر۔ٹی۔مٹکاف: Two Narrations of the Mutiny at Delhi P. 18-19

۴۶۔ ایضاً صفحات ۲-۱

۴۷۔ منقول از تصنیف ساورکر صفحہ ۲۶۰

۴۸۔ سین، بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۱

۴۹۔ مارکس: "دی برٹش رول ان انڈیا" بحوالہ پرچہ ۲۵ر جون ۱۸۵۳ء

۵۰۔ مارکس، Capital : A Critique of Political Economy Vol III P 392

۵۱۔ منقول از تصنیف چودھری صفحہ ۱۰

۵۲۔ مارکس: "کیپیٹل" جلد سوم صفحہ ۳۹۲ الیف الیف

۵۳۔ سرجان اسٹریچے: India: Its Achivements and Progress 1911,
Page 137

۵۴۔ ایضاً: صفحہ ۴۲۷

۵۵۔ ایضاً صفحات ۴۵۷-۵۸

۵۶۔ خان: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷-۳۰

۵۷۔ سین: بحوالہ تصنیف صفحات ۳۵-۳۴

۵۸۔ لو: Centeral India During the Rebellion of 1857-58. P. 326-27

۵۹۔ اعلان بہادر شاہ مورخہ ۲۵ر اگست ۱۸۵۷ء مطبوعہ "دہلی گزٹ" ۱۸۵۷ء سیرام پور سے شایع ہونے والے "فرینڈ آف انڈیا" کے پرچہ مورخہ ۷ر اکتوبر ۱۸۵۸ء میں بعنوان "The Delhi Millennial" چھاپا گیا۔ "نیشنل ہیرلڈ" لکھنؤ مورخہ ۱۰ر مئی ۱۹۵۷ء میں دوبارہ طبع ہوا۔

۶۰۔ ڈی۔آر۔گیڈگل: Industrial Evolution of India طبع چہارم ۱۹۴۴ء
صفحہ ۳۸

۶۱۔ ایضاً صفحات ۴۵-۴۴

۶۲۔ آر۔پی۔دت: "انڈیا ٹوڈے" صفحہ ۹۸

۱۰۵۔ میجنڈی: "اپ امنگ دی پینڈیز" صفحات ۹۶-۱۹۵

۱۰۶۔ کے اینڈ مالیسن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۱۷۷

۱۰۷۔ منقول از تصنیف باسو صفحہ ۹۵۹

۱۰۸۔ نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸۱

۱۰۹۔ رسل: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۵

۱۱۰۔ منقول از تصنیف ساورکر صفحات ۰۲-۴۰۱

۱۱۱۔ فضل حق: بحوالہ تصنیف صفحات ۴۳-۴۲

۱۱۲۔ ایضاً " " ۳۲-۳۰

۱۱۳۔ گریتھڈ: "لیٹرز رٹن ڈیورنگ دی سیج آف دہلی" صفحہ ۲۱۷

۱۱۴۔ ایضاً " " " " " صفحات ۲۰۶-۵

۱۱۵۔ سین: بحوالہ تصنیف صفحہ ۹۵

۱۱۶۔ اے۔ آر۔ ڈی۔ میکنزی: "میوٹنی میمائرز" صفحہ ۱۳۱

۱۱۷۔ ساورکر: بحوالہ تصنیف صفحات ۶۷-۲۶۶

۱۱۸۔ انس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۲۲

۱۱۹۔ منقول از تصنیف نہرو، صفحات ۶۷-۲۶۶

۱۲۰۔ نارٹن: "ٹاپکس فار انڈین سٹیٹس مین" صفحہ ۵۶

۱۲۱۔ مالیسن: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۶۱

۱۲۲۔ "ریڈ پمفلٹ" صفحہ ۱۹۴

۱۲۳۔ انس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰۱

۱۲۴۔ مارکس: Chronological Experts on East India in the Year 1854. 58

(نسخہ عکسی دی انسٹی ٹیوٹ فار مارکسزم۔ لینزم، برلن)

۱۲۵۔ کے اینڈ مالیسن: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۳۵۷

۱۲۶۔ مالیسن: بحوالہ تصنیف جلد اول صفحہ ۲۵۸

۱۲۷۔ ایضاً " " صفحہ ۵۵۲

۸۴۔ خان : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۸
۸۵۔ ایضاً ، ، صفحات ۲۳-۲۲ ۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظ فرمائیں موزمدار : بحوالہ تصنیف صفحات ۵۲ - ۲۴۸ نیز سین : بحوالہ تصنیف صفحات ۲۲ - ۲۰
۸۶۔ منقول از تصنیف ساورکر : صفحہ ۵۵
۸۷۔ موزمدار : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۴۹
۸۸۔ ایضاً ، ، صفحہ ۲۲۹
۸۹۔ بال : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۴۲
۹۰۔ مٹکاف : بحوالہ تصنیف صفحات ۶۹ - ۶۸
۹۱۔ مارکس : مقالہ بلا دستخط : " دی انڈین ریولٹ " مطبوعہ " نیویارک ڈیلی ٹریبیون " مورخہ ۱۰ ار ستمبر ۱۸۵۷ء
۹۲۔ مسز آر۔ایم۔کوپ لینڈ : A Lady's Escape from Gwalior and Life in the Fort of Agra During The Mutinies of 1857 P 234
۹۳۔ فضل حق : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۰
۹۴۔ فارسٹ : " اے ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی " جلد اول صفحہ ۲۱۷
۹۵۔ کے اینڈ مالیسن : " ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی " جلد دوم صفحہ ۲۸۱
۹۶۔ منقول از تصنیف ساورکر صفحہ ۱۲۵
۹۷۔ منقول از تصنیف ایڈورڈ تھامپسن : " دی ادر سائڈ آف دی میڈل " صفحات ۷۴-۷۳
۹۸۔ منقول از تصنیف موزمدار صفحہ ۱۱۲
۹۹۔ ٹی ۔آر۔ہومز : " ہسٹری آف دی سپاہی وار " صفحہ ۱۲۴
۱۰۰۔ فضل حق ، بحوالہ تصنیف
۱۰۱۔ ایچیسن : " لائف آف لارنس " جلد دوم صفحہ ۲۶۲
۱۰۲۔ ایضاً ، ، ، ، ۴۵۴
۱۰۳۔ مارٹن : " دی انڈین ایمپائر " جلد دوم صفحہ ۴۴۹
۱۰۴۔ منقول از تصنیف ساورکر صفحہ ۱۳۴

۱۵۳۔ مشکاف : بحوالہ تصنیف صفحات ۳۵-۱۳۴

۱۵۴۔ ایضاً 〃 〃 صفحہ ۱۲۰

۱۵۵۔ ایضاً 〃 〃 صفحہ ۱۴۰

۱۵۶۔ ایضاً 〃 〃 صفحہ ۱۹۸

۱۵۷۔ ایضاً 〃 〃 صفحہ ۱۹۹

۱۵۸۔ ایضاً 〃 〃 صفحہ ۲۱۵

۱۵۹۔ ایضاً 〃 〃 صفحہ ۲۲۶

۱۶۰۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۵۲

۱۶۱۔ ملاحظہ فرمائیں مقالہ تلمیذ خلدون، اس کتاب میں

۱۶۲۔ مٹکاف : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۴

۱۶۳۔ مٹکاف : بحوالہ تصنیف صفحات ۹۴-۹۳

۱۶۴۔ ایضاً 〃 〃 صفحہ ۲۲۰

۱۶۵۔ مہاشویتا بھٹاچاریہ : "جھانسی رانی" (بنگالی زبان میں) صفحہ ۲۵۲

۱۶۶۔ مائیکل جائنس : "دی آرڈیل ایٹ لکھنؤ" صفحہ ۲۸۴

۱۶۷۔ ملاحظہ فرمائیں مقالہ تلمیذ خلدون نیز اشوک مہتہ : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۷

۱۶۸۔ بتاریخ ۵ اکتوبر ۱۸۵۸ء ملاحظہ فرمائیں مالیسن : بحوالہ تصنیف جلد سوم صفحہ ۲۸۷

۱۶۹۔ بتاریخ ۳ فروری ملاحظہ فرمائیں ایضاً جلد دوم صفحہ ۲۳۴

۱۷۰۔ بال : بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۴۱

۱۷۱۔ منقول از تصنیف اشوک مہتہ صفحات ۵۲-۵۱ نیز ساورکر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۴۴۴

۱۷۲۔ رسل : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۶

۱۷۳۔ گبنس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۳

۱۷۴۔ ہومز : بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۰۶

۱۷۵۔ تھامسن ہل : "انڈین میوٹنی" صفحہ ۳۵

۱۷۶۔ ولیم ایڈورڈس : "پرسنل ایڈونچرز ان دی انڈین ریبلین" صفحات ۱۳-۱۲

۱۷۷۔ منقول از تصنیف اشوک مہتہ صفحہ ۴۶

۱۲۸۔ ڈبلیو۔ ایچ۔ فچٹ: "دی ٹیل آف دی گریٹ میوٹنی" صفحات ۴۹-۴۸

۱۲۹۔ مارکس، مقالہ بے دستخط مطبوعہ "نیویارک ڈیلی ٹریبون" مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء

۱۳۰۔ نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۹

۱۳۱۔ فچٹ: بحوالہ تصنیف صفحات ۲۲-۲۱

۱۳۲۔ انس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲

۱۳۳۔ منقول از تصنیف ساورکر صفحات ۳۵-۵۳۴

۱۳۴۔ نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۷۹

۱۳۵۔ موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۴۱

۱۳۶۔ سین: بحوالہ تصنیف صفحات ۱۳-۴۱۲

۱۳۷۔ کے: بحوالہ تصنیف جلد اول ۶۱۷

۱۳۸۔ ایضاً ″ ″ صفحہ ۵۶۵

۱۳۹۔ منقول از تصنیف اشوک مہتہ: "دی گریٹ ری بلین" صفحہ ۴۲

۱۴۰۔ فضل حق: بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۲

۱۴۱۔ ملاحظہ فرمائیں مقالہ تلمیذ خلدون اس کتاب میں

۱۴۲۔ مٹکاف: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۰

۱۴۳۔ ایضاً روزنامچہ جیون لال زیر تاریخ ۲۶ر اگست

۱۴۴۔ ایضاً ″ ″ صفحہ ۱۰۱

۱۴۵۔ ایضاً ″ ″ صفحہ ۹۸

۱۴۶۔ ایضاً ″ ″ صفحہ ۱۷۰

۱۴۷۔ موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۲۹

۱۴۸۔ جی۔ ڈبلیو فارسٹ: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۱۵۰

۱۴۹۔ مارکس: مقالہ بلا دستخط مطبوعہ "نیویارک ہیرلڈ ٹریبون" مورخہ ۱۵ر جولائی ۱۸۵۷ء

۱۵۰۔ گبنس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۹

۱۵۱۔ فچٹ: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰

۱۵۲۔ خان: بحوالہ تصنیف صفحات ۵۲-۵۱

۲۰۱۔ مارکس : "The Future Results of British Rule in India" New York, Herald Tribune, June 25. 1853.

۲۰۲۔ مارکس اینڈ اینجلس : "سیلکٹڈ کارس پانڈنس" صفحہ ۷۰

۲۰۳۔ مارکس : "دی برٹش رول ان انڈیا" "نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون مورخہ ۲۵ رجون ۱۸۵۳ء

۲۰۴۔ مارکس : "The Future Results of British Rule in India" New York Herald Tribune, August 8, 1853.

۲۰۵۔ ایضاً

۲۰۶۔ پانیکر : بحوالہ تصنیف صفحہ ۹۵

۲۰۷۔ ایضاً ، ، صفحہ ۱۰۵

۲۰۸۔ ایضاً ، ، صفحات ۶۳-۱۶۲

۲۰۹۔ ایضاً ، ، صفحات ۶۵-۱۶۴

۲۱۰۔ مارکس : مقالہ بلا دستخط "نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون" ۱۵ رجولائی ۱۸۵۷ء

۲۱۱۔ منقول از تصنیف آر۔ پی۔ دت صفحہ ۲۳۵

۲۱۲۔ جے۔ کیر۔ ہارڈی ایم۔ پی۔ "انڈیا" صفحات ۶۰-۵۸

۲۱۳۔ تھامپسن : بحوالہ تصنیف صفحہ ۳۰

۱۷۸۔ "نیریٹو آف ایوینٹس " نمبر ۴۰۶، ۱۸۵۸ء مؤلف کمشنر ایف۔ ولیمز مورخہ ۱۵ر نومبر ۱۸۵۸ء

۱۷۹۔ ایضاً

۱۸۰۔ ایضاً مؤلف آر۔ ایم۔ ایڈورڈس مورخہ ۱۶ر نومبر ۱۸۵۸ء

۱۸۱۔ ایضاً مؤلف ڈبلیو۔ جے۔ برامبے مورخہ ۱۷ر نومبر ۱۸۵۸ء

۱۸۲۔ ایضاً مؤلف تھارن بل مورخہ ۱۰ر اگست ۱۸۵۹ء

۱۸۳۔ ایضاً مؤلف ایف تھامس

۱۸۴۔ ایضاً مؤلف ایف۔ بی۔ گبنس مورخہ ۶ر نومبر ۱۸۵۸ء

۱۸۵۔ ایضاً مؤلف کمشنر گورکھ پور مورخہ ۸ رجولائی ۱۸۵۸ء

۱۸۶۔ ایضاً مؤلف جی۔ اتیچ۔ فریلنگ

۱۸۷۔ ایضاً مؤلف ایف۔ ڈی۔ مین۔ مورخہ ۴ر ستمبر ۱۸۵۸ء

۱۸۸۔ ہومز: بحوالہ تصنیف

۱۸۹۔ گبنس: بحوالہ تصنیف صفحہ ۵۸

۱۹۰۔ موزمدار: بحوالہ تصنیف صفحہ 217

۱۹۱۔ نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸۴

۱۹۲۔ ایضاً: صفحہ ۲۶۸

۱۹۳۔ گبنس: بحوالہ تصنیف

۱۹۴۔ ٹیلیگرام مورخہ ۲۹ رجون ۱۸۵۷ء: فارسٹ: بحوالہ تصنیف جلد دوم صفحہ ۲۹

۱۹۵۔ پانیکر: بحوالہ تصنیف صفحات ۱۵۶۔ ۱۴۵

۱۹۶۔ نہرو: بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۸۵

۱۹۷۔ ارل گرینول ۱۹ر فروری ۱۸۵۸ء بدارالامرا بجواب الزامات صدر بورڈ آف کنٹرول لارڈ ایلن برا "پارلیمنٹری ڈیبیٹس" سلسلہ سوم CXL VIII ۱۸۵۸ء صفحات ۱۸۲۸۔۲۹

۱۹۸۔ منقول از تصنیف سین صفحہ ۲۹

۱۹۹۔ دادا بھائی ناروجی: "دی کنڈیشن آف انڈیا" وزیر ہند کے ساتھ خط وکتابت "جرنل آف دی ایسٹ انڈیا افیرز" XIV 1882 P.P 171-172

۲۰۰۔ منقول از تصنیف نہرو صفحات ۷۸۔۲۷۶

حصّہ دوم

پ۔ سی۔ گپتا

۱۸۵۷ء اور ہندی ادب

۱۸۵۷ء ہندوستانی عوام کے حافظے میں ایک یادگار سال ہے جس میں برطانوی حکومت کو ایک حقیقی بغاوت کا سامنا کرنا پڑا اور اس کے اقتدار کو سخت دھکا لگا۔ بعد میں اس کی یاد نے قومی آزادی کی متعدد تحریکوں میں جوش پیدا کیا۔ خاص طور پر آنے والے برسوں میں مسلح بغاوت کی تمام کوششوں کو ۱۸۵۷ء کی روایت سے قابلِ قدر اخلاقی تقویت ملی۔ بغاوت کے سرگردہ رہنماؤں کو بالخصوص رانی لکشمی بائی اور کنور سنگھ کو ہندوستانیوں کے دلوں میں بحیثیت قومی سورماؤں کے عزت کا مقام حاصل ہے بہت سی نظموں، لوک گیتوں اور دوسری ادبی تخلیقات میں ان کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں۔

ہندی ادب میں بغاوت کے سیدھے حوالے بہت کم ہیں لیکن اقتصادی لوٹ کھسوٹ کی طرف اشاروں کی کثرت ہے۔ ہمیں اپنے شاعروں اور نثر نگاروں کے ادب پاروں سے ذلت اور درد و کرب کے احساس کا پتہ چلتا ہے۔ تمام جدید ہندی ادب میں ردیفِ شعر کی طرح اس غم کا بار بار اظہار کیا گیا ہے کہ اغیار نے نہ صرف اس عظیم ملک کو تباہ و برباد کیا بلکہ اس کی عزت کو بھی خاک میں ملایا۔

مغلیہ حکومت کے آخری دور میں ہندی شاعری میں عشقیہ مضامین اور رسمی اسالیب شاعری کا غلبہ تھا۔ ملک پر برطانوی قبضہ کے بعد یہ شاعری سماجی شعور حاصل کرنے لگی۔ اس دور کے شاعر پنڈت یگیہ دت تواڑی اس بات پر اظہارِ تاسف کرتے ہیں کہ ملک عیش و عشرت کا دلدادہ ہے:

"ہندوستانی عیش و عشرت میں مستغرق ہیں اور انھوں نے اس کے آلام و آفات سے آنکھیں موند رکھی ہیں۔ وکرماجیت کی بہادری کہاں ہے؟ راجہ بھوج کا نام و نشان نہیں رہا۔ پایہ تخت کی ساری آبادی عیاشی میں محو ہے۔ قنوج کی آب و تاب کہاں ہے؟"[1]

ایک اور شاعر مکرند لچھمن اسی قسم کے جذبات کو ظاہر کرتا ہے:

"ہندوستان غمزدہ ہے، ہزاروں سال اس نے سختی جھیلی ہے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ ان

آہ! مصائب نے ہندوستان کو پست کر رکھا ہے۔[۴۹]

اسی طرح پرتاپ نرائن مشر اس بات پر افسوس کرتا ہے کہ ملک کی تمام دولت کو انگریز لوٹ کر لے جا رہے ہیں:

"انگریز ہم سے ہر چیز چھین لیتے ہیں
ہم صرف باتیں کرنا جانتے ہیں
عمل کے بغیر باتیں بے سود ہیں
ہم جادو ٹونوں سے مصیبت کو نہیں ٹال سکتے۔"[۵۰]

بھارتیندو اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ کس طرح تجارت اور دستکاری کی تباہی سے ملک کو مفلس کر دیا گیا ہے:

"وہ ہمیں مشینوں کے ذریعے لوٹ رہے ہیں
دولت دن بدن کم ہو رہی ہے جب کہ آلام و مصائب بڑھ رہے ہیں
باریک سوتی کپڑے اور نفیس ململ کے بغیر ہمارا کام نہیں چلتا
ہم غیر ملکی جولاہوں کے غلام ہیں
ہر چھوٹی موٹی چیز باہر سے درآمد کی جاتی ہے
ہر روز یہاں بھرے ہوئے جہاز آ کر مال اتارتے ہیں۔"[۵۱]

اس دور کے ادب میں یکے بعد دیگرے آنے والے قحطوں کا بار بار ذکر کیا گیا ہے بدری نرائن چودھری پریم گھن لکھتا ہے:

"بھاگو لوگو! بھاگو! خوفناک قحط پڑ گیا ہے
ہندوستان پر تباہی کی گھنگھور گھٹائیں چھا رہی ہیں
بیوپار اور تجارت کا خاتمہ ہو گیا ہے
صنعت و حرفت کا نام نہیں باقی ہے
زراعت بالکل برباد ہو چکی ہے
چاروں طرف مہنگائی کی آگ بھڑک رہی ہے۔"[۵۲]

۱۸۵۷ء کی بغاوت کا براہِ راست حوالہ دیتے ہوئے بھارتیندو اس دہشت کا ذکر کرتا ہے جو بغاوت کے بعد لوگوں پر طاری ہوئی:

مصائب پر کیسے قابو پائیں۔ وہ لاپروا ہیں اور سوچتے ہیں کہ اس پر کیوں وقت ضایع کریں۔ جو ہو، سو ہو، ہم رادھا اور کدم کے تصور میں محو ہیں۔"[2]

مشہور ہندی ناول نگار ورنداون لال ورما کے پاس ہردیش کی ایک نظم ہے جو جھانسی کی رانی لکشمی بائی کا ہمعصر تھا۔ ہردیش بھی اخلاقی قدروں کے المناک زوال پر تاسف کا اظہار کرتا ہے، وہ لکھتا ہے:

"اس کلجگ میں کتنے امیر کبیر خاک میں مل گئے
لیکن اوباش گردن میں موتیوں کے ہار پہنے پھرتے ہیں
بقول ہردیش علما ہرن کی کھال اوڑھتے ہیں
لیکن مطرب اور رقاص قیمتی شال زیب تن کرتے ہیں۔"[2]

گنگا پرساد اور چترلیش کی ناتمام نظمیں اور شاعر بھگی داؤ جی شیام کی راسو کا ایک مسخ شدہ نسخہ جھانسی کے مشہور انقلاب پسند راہنما شری بھگوان سنگھ ماہور کے پاس ہے جو بھساول مقدمہ سازش میں ماخوذ تھے۔ رانی جھانسی سے متعلق بندھیلکھنڈ کے مشہور شاعر کلیان کی ایک نظم ہے۔ اس کے جو حصے دستیاب تھے وہ حال ہی میں شایع ہوئے ہیں۔ ان نظموں میں بعض ایسے نادر اشعار ہیں جو زورِ بیان اور حسنِ خیال کے مرقع ہیں۔ ان سے غیر ملکی حکومت کے خلاف جہاد، شجاعت، جوانمردی اور ایثارِ نفس کی روایات اور حفاظت کی تکمیل ہوتی ہے۔

ممتاز شعرا اور ادبا کی تصنیفات میں اقتصادی خستہ حالی، مفلسی اور لوٹ کھسوٹ کے شعور کا متواتر اظہار پایا جاتا ہے

بھارتیندو اپنے مشہور ناٹک "بھارت دُردشا" میں لکھتا ہے:

"ہندوستان کے مصائب حد درجہ جگر خراش ہیں!
خوف سے لوگوں کی آنکھوں تلے اندھیرا ہے وہ مفلس اور کنگال ہیں
برطانوی حکومت کے تحت ہر قسم کی راحت اور نعمت میسّر ہے
لیکن ملک کی دولت کو لوٹ کر باہر لے جایا جا رہا ہے
مہنگائی، بیماری اور موت نے ناک میں دم کر رکھا ہے
رنج والم روز بروز بڑھ رہے ہیں
اس پر ٹیکس اور بھی غضب ڈھا رہے ہیں

بلند پایہ باغی راہنماؤں کی عظمت اور عزت کے راگ الاپے گئے ہیں۔ وہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ عوام ملک کی اس بربادی اور اس کے استحصال کو، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا خاصہ تھا، نفرت اور خصومت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان گمنام شاعروں نے بغاوت کے ان راہنماؤں کو دیوتا کا درجہ دے کر عقیدت کے پھول چڑھائے کیوں کہ ان سورماؤں نے حیرت انگیز دلاوری اور بہادری کے ساتھ ایک ایسے دشمن کا مقابلہ کیا جو مسلح قوت اور تنظیم کے اعتبار سے برتر تھا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی اس روایت کی لوگوں نے پورے سو سال پرورش کی جو شجاعت ایثارِ نفس اور ناقابلِ تسخیر حبِ وطن کی روایت تھی۔ بعد کی مسلح بغاوتوں کے لیے یہ فیضان کا سرچشمہ رہی۔ مثلاً چٹا گانگ کی بغاوت اور حال کی بحری فوج کی بغاوت جو ہندوستان سے انگریزوں کے جلد رخصت ہونے کا سبب بنی۔ ادیب اور شعرا نے خدمتِ خلق کے لیے اپنی زندگی کو وقف کرنے اور رفاہِ عامہ کے ساتھ اپنے آپ کو وابستہ کرنے میں اس روایت کو برقرار رکھا۔ یہ روایت بھارتیندو کے زمانے کے دویدی یگ کے اور چھایا واد کے شعرا اور ادیبوں کی تصنیفات و تالیفات کے دم سے زندہ ہے۔ یہ روایت منشی پریم چند کی تصنیفات میں بھی محفوظ ہے اور ان ترقی پسندوں اور نئی نسل کے ادیبوں کی تصنیفوں میں بھی جو روز بروز زور پکڑ رہے ہیں۔ ایسی تصنیفات جیسے بھارت بھارتی، ماکھن لال چترویدی سبھدرا کماری چوہان اور نوین کی قومی شاعری میں۔ پرساد، نرالا اور پنت کے کلام میں، پریم چند، راہل، یش پال، رانگے راگھو، ناگ ارجن اور رینو کے ناولوں میں۔ رانی جھانسی سے متعلق سبھدرا کماری چوہان اور ورنداون لال ورما کی معرکتہ الآرا تصانیف اور نریندر، کیدار، سمن اور آج کے متعدد عوامی شعرا کی شاعری میں ہم کو ۱۸۵۷ء کی گونج سنائی دیتی ہے۔

جدید ہندی ادیب متواتر اپنی تصنیفات میں ہندوستان کی قومی توہین کا ذکر کرتے ہیں۔ اگرچہ شری میتھلی شرن گپت کی "بھارت بھارتی" کی طرز غیر معمولی طور پر شائستہ نہیں ہے لیکن اس میں ایسے اشعار موجود ہیں جن سے ہر محبِ وطن کا دل متاثر ہوتا ہے۔ ایام بغاوت کے شعرا کی طرح شری میتھلی شرن گپت بھی ملک میں افلاس اور قحط کے پھیلنے پر درد و کرب کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں

"جہاں دولت تھی، ہر چیز کی افراط تھی۔ زندگی با مقصد تھی

سارے دنیا میں ہندوستان "سونے کی چڑیا" کے نام سے مشہور تھا

اب وہاں مفلسی کا خوفناک ننگا ناچ ہے

اب چاکری کے سوا کوئی کام نہیں جس سے روزی کمائی جائے

"فوجی بغاوت کی آگ کو بیدردی کے ساتھ فرو کیا گیا
دہشت کے مارے ہندوستانی دم نہ مار سکتے تھے۔" ۸

پرتاپ نرائن مشر اور بدری نارائن چودھری پریم گھن نے بھی اپنی نظموں میں بغاوت کی طرف ناگوار اشارے کیے ہیں۔ ان کا خیال ہے بغاوت غیر مطمئن لوگوں کا کام تھا۔ پرتاپ نارائن مشر لکھتا ہے:

"جب ۱۸۵۷ء میں فوج کے ایک حصے نے بغاوت کی
تو لوگوں نے ثابت قدمی کے ساتھ حکمرانوں کا ساتھ دیا۔" ۹

پریم گھن بھی اسی انداز میں لکھتا ہے:

"اہلِ مشرق خوف زدہ تھے۔ لوگوں پر ہیبت طاری تھی
جن لوگوں نے خیال کیا کہ مذہب اور ذات خطرے میں پڑ گئے ہیں
انھوں نے چند جاہل فوجیوں اور شہدوں کو اپنے ساتھ ملایا
انھوں نے بڑی تباہی مچائی اور اپنی بربادی کے بیج بوئے۔" ۱۰

انیسویں صدی کے نصف آخر میں بہت سے شاعر جاگیرداروں کے سایۂ عاطفت میں رہتے تھے اس لیے وہ ان کے زیر اثر تھے۔ قدرتی طور پر بغاوت کے تئیں ان کا رویہ وہی تھا جو ان کے سرپرستوں کا تھا۔ چنانچہ سیوک "واگ ولاس" میں انگریزوں کے تئیں اپنے مربیوں کی ان خدمات کے لیے مدح سرائی کرتا ہے جو انھوں نے بغاوت کے دوران انجام دیں:

"تمام اوصاف سے آراستہ، انعام و اکرام عطا کرنے والا،
انگریزوں کا وفادار، حسین اور خوبرو،
اس نے بغاوت کے دوران حکمرانوں کی بے حد مدد کی۔" ۱۱

ایک اور شاعر "رس راج" بہاری سنگھ البتہ کمپنی کی حکومت کے تحت لوگوں پر ڈھائے گئے جور و ستم کا ذکر کرتا ہے جس نے بالآخر ان کا پیمانۂ صبر لبریز کر دیا اور انھیں بغاوت پر آمادہ کیا:

"ساری دنیا جانتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے دوران کس قدر
مظالم ڈھائے گئے۔ لوگ دہشت زدہ تھے۔" ۱۲

جب ہم کم مشہور یا گم نام شعرا کے کلام کو دیکھتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے ان باغیوں کو زیادہ نمایاں خراجِ تحسین ادا کیا جنھوں نے غیر ملکی حکومت اور اس سے وابستہ بے غیرت تاخت و تاراج کے خلاف بغاوت کی تھی۔ لوک گیتوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ جھانسی کی رانی لکشمی بائی اور کنور سنگھ جیسے

مصنفہ یش پال، "بلیجنا" ، اور "ورُن کے بیٹے" مصنفہ ناگارجن اور "میلا آنچل" مصنفہ رینو۔ اس نے راہل سانکرتیائن ، بھگوت شرن اپادھیائے اور رانگے راگھو کو عالمانہ تصنیفات پر آمادہ کیا۔ ہم اس کی صدائے بازگشت ایسی نظموں میں سُنتے ہیں جیسے نریندر کی "لال نشان"، سُمن کی "نئی آگ ہے"، "کدار کی گنگ کی گنگا" اور راجیو سکسینہ کی "ناوک و درد" بعض افسانوں مثلاً "تین گنڈے" مصنفہ کرشن چندر یا اس کے خاکے "صبح ہوتی ہے" کے پڑھنے سے قومی جنگ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔

جوں جوں لوگوں کا شعور بلند تر سیاسی سطح پر پہنچے گا گیت اور افسانوں میں اس عظیم قومی واقعہ کی یاد منانے کے لیے بہت سے شاعر اور ادیب ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متاثر ہوں گے۔ نئے قومی شعور کے زیر اثر ایسی کوششیں پہلے ہی ہو چکی ہیں۔ خواجہ حسن نظامی نے اپنی کتاب "مغلوں کے اتم دن" میں کنگال مغل شہزادوں کی المناک اور رقت انگیز تصویریں کھینچی ہیں۔ بغاوت کے راہنماؤں میں جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی ذات کے تئیں صد درجہ محبت اور تعظیم کا اظہار کیا گیا ہے۔ ایک نظم میں جو لوک گیت کی عام خصوصیات کی حامل ہے، سبھدرا کماری چوہان نے اس والہانہ عقیدت کا اظہار کیا ہے جو اس نامور خاتون کے لیے عوام میں پیدا ہوئی۔ نظم کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

"راجاؤں کی نسل نے بغاوت کر دی۔ تخت لرزنے لگے

بوڑھے ہندوستان پر پھر سے جوانی کا جوبن آگیا

لوگوں کو از سرِ نو کھوئی ہوئی آزادی کی قدر کا احساس ہوا

ہر کوئی فرنگی کو نکالنے پر تُلا ہوا تھا

۱۸۵۷ء میں پرانی تلوار پھر چمک اٹھی

یہ کہانی ہم نے بندھیلوں سے سُنی ہے

جو بھگوان شو کی پوجا کرتے ہیں

جھانسی کی رانی نے بہادری اور جوانمردی

کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا۔"[16]

ہندی بولنے والے لوگوں میں اس نظم کی بے حد مقبولیت کا سبب یہ ہے کہ یہ عوام کے جذبات کی ترجمان ہے۔ ان جذبات کو جو بغاوت نے برانگیختہ کیے سبھدرا کماری چوہان نے بڑی صراحت کے ساتھ ترجیع بندوں میں بیان کیے ہیں:

"جھونپڑیوں میں بد بختی کا ڈیرہ تھا، محلات میں فخر خاک میں مل چکا تھا

جدھر بھی نظر ڈالو مغموم چہرے دکھائی دیتے ہیں
ہر طرف مایوسی کی کالی رات چھائی ہوئی ہے
غم کے شعلے اٹھ اٹھ کر ہمیں جھلس رہے ہیں
نت نئی مصیبت یہاں نازل ہوتی ہے "۱۳

سمترا نندن پنت اپنی شہرہ آفاق نظم "پریورتن" میں اسی قسم کے جذبے کا اظہار کرتے ہیں:
"آج بہار غمناک آہیں بھرتی ہے
گویا سردی کا موسم ہے
موسم بہار میں پھولوں سے لدی ہوئی
ٹہنی جھکی ہوئی تھی
آج یہ بیچارگی کے عالم میں چلا کر کہتی ہے
"جوانی ایک خوفناک وبال ہے۔" "۱۴

پنت اپنی نظم "بھارت ماتا" میں افلاس زدہ ہندوستان کی ایک جگر خراش تصویر کھینچتے ہیں:
"بھارت ماتا کا نواس دیہات میں ہے
اس کا میلا کچیلا دوپٹہ کھیتوں میں بچھا ہے
گنگا جمنا کی نہریں اس کے آنسو ہیں
یہ ایک چکنی مٹی کا بت ہے
اداس اور غمناک!" ۱۵

بغاوت کی دردناک یاد ہندوستانیوں کے دلوں میں گھر کیے ہوتے ہے۔ اس سے غیر ملکی حکومت کے لیے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے اور حب وطن کا جذبہ بھڑکتا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ہتھیار اٹھائے جیسے بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد اور سوریہ سین، اور وہ لوگ جو غیر ملکیوں کو وطن سے نکالنے کے لیے مزاحمت عامہ میں اعتقاد رکھتے تھے ان کے دلوں میں یکساں طور پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے سورماؤں کے تئیں محبت اور تحسین کے جذبات موجزن تھے۔ غیر ملکی حکومت کی مخالفت اور مزاحمت کی یہ روایت ہندی ادب میں بیش بہا ترکہ ہے۔ زیریں رو کی طرح یہ روایت تمام چھایا واد شاعری میں سرایت کیے ہوئے ہے۔ پریم چند کی انتہا پسندانہ تصنیفات میں یہ نمایاں طور پر ظاہر ہے۔ یہ ایسے ناولوں کی تصنیف کا موجب ہوئی جیسے "دادا کامریڈ" اور "دیش دروہی"

بیان ہے جو لوگ اس کے تئیں رکھتے تھے۔ اس نے جھانسی کی عورتوں کو نجات دلائی اور انھیں مردوں کے ساتھ شانہ بہ شانہ لڑنے پر آمادہ کیا۔ ناول میں اُسے ناناصاحب سے یوں خطاب کرتے ظاہر کیا گیا ہے:

"عوام ہی اصل قوت کا ماخذ ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ قوت بے انتہا ہے۔ چھترپتی نے امراء کی قوت کے سہارے نہیں بلکہ عوام کے ہی بل بوتے پر دہلی کے طاقتور شہنشاہ کو للکارا۔ باولے اور کنبی کسان تھے اور اب بھی ہیں۔ ان کے ہل ان کی آزادی اور خودمختاری کی مجسم تمنا ہیں۔ میں یہاں کے لوگوں کو بھی ویسا ہی سمجھتی ہوں۔"[۱۸]

شری ورنداون لال ورما رانی کی سیرت کا جائزہ مندرجہ ذیل الفاظ میں مختصراً پیش کرتا ہے۔

"رانی سوراج کے لیے لڑی، سوراج کے لیے جان قربان کی اور سوراج کا سنگِ بنیاد ثابت ہوئی۔"[۱۹]

یہ محض ایسے جذبات نہیں ہیں جو آج بھولی بسری یادوں پر ٹھونس دیے گئے ہیں۔ خود ۱۸۵۷ء میں لوگ برطانوی حکومت کو شدید نفرت اور ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بغاوت کے ایک "روزنامچے" میں جسے سرجان مٹکاف نے مرتب کیا، نواب معین الدین حسن خاں کہتا ہے۔

"میں بغاوت کی ابتدا کا حال اس بیان کے ساتھ شروع کرتا ہوں کہ انگریز خود حسبِ مرضی اپنے بارے میں خواہ کچھ ہی رائے رکھتے ہوں، ہندوستانی انھیں ظالم سمجھتے تھے اور برطانوی سلطنت میں اودھ کے الحاق سے یہ جذبہ اور بھی زیادہ بھڑک اٹھا۔ اس واقعہ سے سب سے پہلے فوجیوں میں بےاطمینانی پھیلی جن کی اکثریت اس علاقے کی رہنے والی تھی۔ پھر بغاوت سے متعلق مختلف واقعات رونما ہوئے۔ کسان خوفناک مصائب کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ بہت سی ریاستیں تباہ ہو گئیں یا فتح کر لی گئیں۔ بہت سے خاندان اور بڑے بڑے شہر خاک میں مل گئے۔ بہت سے بیگناہوں کو پھانسی دی گئی۔ ہمہ گیر تباہی کے بادل سارے ملک پر چھا گئے۔"[۲۰]

غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت کی اس روایت کا لوک گیتوں میں متواتر اظہار ہوتا رہا۔ ایک بھوجپوری گیت میں مذکور ہے کہ غیر ملکی کی کمزور کشتی اب غضب ناک لہروں میں ڈگمگا رہی ہے۔

"بدیسیوں کی کشتی اب ڈگمگا رہی ہے
ملک مفلسی کے بھنور میں پھنسا ہوا ہے
اس کی کشتی منجدھار میں ڈانواڈول ہے

بہادر سپاہیوں کے دلوں میں گذشتہ شان کا غرور ابھر آیا
نانا جنگ کے لیے تمام سامان فراہم کر رہا تھا
اس کی بہن لکشمی بائی برملا جنگ کی دیوی کو مدد کے لیے پکار رہی تھی
یگیہ کی اگنی جلائی گئی
انھیں از سرِ نو گذشتہ کو حاصل کرنا تھا
یہی کہانی ہے جو ہم نے بندھیلوں سے سُنی ہے
جو بھگوان شو کی پوجا کرتے ہیں
محل سے چنگاری نمودار ہوئی، جھونپڑیوں میں آگ بھڑک اٹھی
یہ آزادی کا شعلہ تھا جو تمام دلوں میں چھپا ہوا تھا
یہ آگ جھانسی، دہلی اور لکھنؤ تک پھیل گئی
میرٹھ، کانپور اور پٹنہ سب میں آگ لگی ہوئی تھی۔"[۱۷]

پرنسپل منورنجن پرساد نے اسی قسم کی ایک نظم بابو کنور سنگھ پر "یُوگ" ۱۹۲۹ء میں لکھی جب یہ پٹنہ سے شری بینی پوری کے زیرِ ادارت شایع ہو رہا تھا۔ برطانوی سرکار نے فوراً اس کی اشاعت ممنوع قرار دے دی۔ یہ نظم اور رانی جھانسی پر دوسری نظم جو منورنجن بابو نے لکھیں اپنی قوتِ تاثیر اور جوش کی وجہ سے مقبولِ عام ہیں۔ کنور سنگھ سے متعلق نظم یوں شروع ہوتی ہے

"ترانۂ مسرت بلند ہوا، یہ ترانۂ آزادی تھا
ملک کے ہر گوشے میں یہی ایک ترانہ سُنا گیا
ایک سرے پر لکشمی بائی اور پیشوا نانا تھے
دوسرے سرے پر بہار کا بہادر کنور سنگھ تھا
اس اسی سالہ بوڑھے کی ہڈیوں میں سلگتی آگ بھڑک اٹھی
ہر ایک کی زبان پر ہے: 'کنور سنگھ بڑا سورما تھا'"

ہندی کے ممتاز ناول نگار شری ورنداون لال ورما نے ایک ناول بعنوان "جھانسی کی رانی لکشمی بائی" لکھا ہے۔ اس ناول کے دیباچے میں وہ بیان کرتا ہے کہ رانی جھانسی نے بانپور کے راجہ مردان سنگھ کے نام ایک خط میں لفظ "سوراج" کا استعمال کیا اور اس سے انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مدد مانگی۔ ناول مذکور رانی لکشمی بائی کی بلند نظری اور اس محبت اور تعظیم کا پر جوش

میرے گلے میں رسی ڈال کر کیوں تامل کرتے ہو؟
میں غازی بن کر سیدھا بہشت میں جاؤں گا
اور دھرم راج کے حضور میں اپنے مصائب بیان کروں گا۔
اس سے بھگت سنگھ کو واپس چھین لوں گا۔" ۲۵

ایسے گیت غیر ملکی حکومت کے خلاف ہمارے لوگوں کی گہری نفرت کو زندہ رکھتے ہیں اور ہمارے ملک کے عام شعور کے اندازے کے لیے ایک پیمانے کا کام دیتے ہیں۔

ہندوستان کی قومی جدوجہد کے لیے بغاوت کا بیش قیمت ترکہ ہندو مسلم اتحاد کی روایت تھی جو اس دور میں قائم ہوئی۔ بہادر شاہ کے تحت اور رانی جھانسی کی فوجوں میں ہر جگہ ہندو اور مسلمان مشترکہ دشمن کے خلاف متحد ہو کر دوش بدوش صف آرا ہوئے۔ معین الدین حسن خاں اپنی "غدر ڈائری" میں اس حقیقت پر زور دیتا ہے:

"یہ قرین قیاس ہے کہ یہ ایک مشترکہ اعلان تھا جو ہندو اور مسلمان باغیوں میں اتحاد کا نتیجہ تھا۔ یہ ایک قابلِ قبول تاریخی حقیقت ہے کہ کمپنی کے الحاقِ اودھ کے واقعے سے بے اطمینانی بڑھ گئی اور یہی وجہ تھی کہ بغاوت کی آگ جلد تر بھڑک اٹھی۔ واقعہ اودھ کا اثر ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر پڑا کیونکہ اودھ میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہے..." ۲۶

قومی اتحاد کی یہ روایت بعد کی تمام بغاوتوں میں برقرار رہی مثلاً بحری عملہ اور آزاد ہند فوج کی بغاوتیں۔

جس چیز کو "غدر" کہا جاتا ہے وہ ہندوستانیوں کے لیے غیر ملکی حکومت کے خلاف عوام کی بغاوت تھی۔ ہندی ادب میں معلوم اور نامعلوم ادیب اور شعرا کی تصنیفات ہماری قوم کی ان امنگوں اور جذبوں کی ترجمان ہیں جو سو سال پہلے برطانوی حکومت کے خلاف اس قدر بڑے پیمانے پر بغاوت کا سبب ہوئے۔

حواشی

۱۔ ایس۔ ایل۔ ورشنے: "آدھونک ہندی سہت" صفحات ۴۷-۲۴۶

۲۔ ایضاً صفحہ ۲۴۷

۳۔ ورما: "رانی لکشمی بائی آف جھانسی" صفحات ۲-۴۰۱

ملک میں قحط اور بیماری کا زور ہے

مصیبت کے بادل گرج رہے ہیں

دریائے غم میں اتھاہ پانی ہے

ملک میں جبر و ستم کی آندھی زور سے چل رہی ہے

حاکم نشے میں مدہوش ہے

ہم اس سے التجا کرتے ہیں لیکن اس کے منھ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلتا

اے بدنصیبی تیری کشتی غرق ہونے والی ہے

دریا میں تیرا جنازہ نکلا ہی چاہتا ہے۔"[۲۱]

قلت اور قحط کے حالات میں جو ہندوستان میں برطانوی حکومت کی دیرینہ خصوصیت ہے شاعر، شاعری اور عشق کو بھول جاتا ہے:

"قحط کے سبب ہم اپنے تمام نغمے بھول چکے ہیں

برہا، کجری، کبیر

اب حسن کا نظارہ بھی دل کو متاثر نہیں کرتا۔"[۲۲]

ایک مالوی لوک گیت میں شاعر کہتا ہے:

"ملک مصیبت میں مبتلا ہے

فرنگی ملک پر حکمران ہے

آسمان پر گھنگھور گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔"[۲۳]

بھگت سنگھ جو اغیار کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متاثر ہوا متعدد لوک گیتوں کا موضوع بنا۔ یہ گیت شہنشاہیت کے خلاف مزاحمت کی روایت کو زندہ رکھتے ہیں جو لوگوں نے مختلف اوقات پر جدو جہد کے ذریعے قائم رکھی۔ بھگت سنگھ کے بارے میں ایک لوک گیت ذیل کے مصرعے سے شروع ہوتا ہے:

"وہ پھانسی پر جھول گیا۔ بہادر بھگت سنگھ، غیرت مند بھگت سنگھ!"[۲۴]

ایک اور لوک گیت ایک محب وطن کی تصویر کھینچتا ہے جو پھانسی پر چڑھنے میں دیر ہو جانے کے سبب پیچ و تاب کھاتا ہے:

"اب ایک ایک لمحہ میرے لیے باعث عذاب ہے۔

سید احتشام حسین

اردو ادب اور انقلاب ۱۸۵۷ء

یہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اردو ادب دربار، خانقاہ اور بازار کی پیداوار ہے۔ بلاشبہ یہ صدیوں کے گذشتہ حقائق، حالات اور خیالات کے اتصال اور انتشار کے دقیق تاریخی عمل کا بہت سادہ سا بیان ہے۔ یہ مثلث نظام جاگیرداری، مذہبی و سماجی ماحول اور ادب میں عوام کی آرزوئے اظہار کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ حقیقت پُرمعنی ہے کہ شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا آغاز اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں جاگیردارانہ نظام کے زوال کے ساتھ ہوا۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ دور اپنی ساری طاقت کھو چکا تھا اور ایک ختم ہوتے عہد کی قدروں کو بھی بیان کرنے کے قابل نہیں تھا۔ مبہم طور سے یہ ایک نئی بیداری کا بھی دور تھا اس نئے شعور کی ابتدا کا جو بدلتے ہوئے تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات کا تقاضہ تھا۔ اس وقت کی اردو شاعری درد و کرب، افراتفری، مایوسی اور تذبذب کی آئینہ دار تھی جس میں کسی قسم کے خیالات اور نظریات کی جستجو بے سود ہوگی۔ وہ ماحول جس میں یہ شاعر رہتے تھے، ان کے سرپرستوں کا مذاق جن کی وہ مدح کرتے تھے اور اکثر صورتوں میں عوام اور شعرا کے درمیان بے تعلقی، یہ ساری باتیں شاعری کے زوال کا موجب ہوئیں اور وہ محض ضلع جگت یا ایہام بن کر رہ گئی۔ ہیئت کے اعتبار سے معیار بہت بلند ہوا لیکن خیالات محدود ہوگئے اور شاعری روایات کی پابند ہوگئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے قیام کے بعد ہی سے شعرا اور ادیب نئی صورتِ حال کی نزاکت سے آگاہ ہونے لگے۔ جب سراج الدولہ کو انگریزوں نے ہلاک کردیا اس کا دوست اور رفیق کار راجہ رام نارائن موزوںؔ درد سے تڑپ اٹھا

آہ وہ صحرا نورد دیوانے عاشق کہاں گئے؟

اور وہ ایام عاشقی کہاں معدوم ہوگئے؟

۴۔ "ہندی نو رتن" صفحہ ۵۹۸

۵۔ ورشنے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۶۲

۶۔ ایضاً ، ، صفحہ ۲۶۴

۷۔ "کوتاکومدی" حصہ دوم صفحات ۳۹-۳۸

۸۔ ورشنے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۵۶

۹۔ بریڈلا۔ سواگت صفحہ ۱۰

۱۰۔ "ہاردک ہرش ورش" مطبوعہ ۱۹۰۰ء صفحہ ۱۱

۱۱۔ ورشنے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۵۰

۱۲۔ ایضاً ، ، صفحہ ۲۵۱

۱۳۔ "بھارت بھارتی" صفحہ ۸۷

۱۴۔ "گرامیہ" صفحہ ۴۸

۱۵۔ "مخل" صفحہ ۴۷

۱۶۔ ایضاً صفحہ ۵۳

۱۷۔ ایضاً تمہیدی اشعار

۱۸۔ ورما : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۴۱

۱۹۔ ایضاً صفحہ ۵۱۰

۲۰۔ "ڈائری آف دی میوٹنی" صفحہ ۵۲

۲۱۔ کرشن دیو اپادھیائے "بھوجپوری گرام گیت" صفحات ۹۴-۳۸۲

۲۲۔ "کوتاکومدی" حصہ سوم صفحہ ۲۷

۲۳۔ "پرتبھا" اگست ستمبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۵

۲۴۔ دیوندر ستیارتھی "دھیرے بہو گنگا" صفحات ۲۳-۱۳۲

۲۵۔ ایضاً

۲۶ معین الدین حسن خاں : "غدر ڈائری آف دہلی" صفحہ ۲۱

تصنیفات میں مندرجہ ذیل اہم ہیں : خطوط غالب ، دستنبو (غالب کا بغاوت کے ایام میں فارسی زبان میں لکھا ہوا روزنامچہ) داستانِ غدر مصنفہ ظہیر دہلوی ، تاریخ سرکشیٔ بجنور مصنفہ سرسید احمد ، رسالہ اسباب بغاوتِ ہند مصنفہ سرسید احمد ، تاریخ ہند جلد نہم مصنفہ ذکاءاللہ ، روزنامچۂ غدر (انگریزی تصنیف) ترجمہ ڈاکٹر نذیر احمد ، آغا ہجو ، شرف (لکھنؤ کی غارت گری پر ایک طویل نظم) واجد علی شاہ ، منیر شکوہ آبادی بہادر شاہ ظفر اور برق لکھنوی کی بہت سی نظمیں اور فغانِ دہلی (پچاس نظموں کا مجموعہ جو سب سے پہلے ۱۸۶۱ء میں شایع ہوا) اور مختلف نظمیں اور مقالے جو بغاوت کے دوران اور اس ہنگامے کے بعد زیادہ تر دہلی کے اخبارات میں شایع ہوئے ۔ اور بھی تصانیف ہیں لیکن ہم انھیں نظر انداز کرتے ہیں کیوں کہ ہمارا مقصد اس مقالے میں ایسی کتابوں کی فہرست فراہم کرنا نہیں ہے ۔

مذکورہ بالا تصنیفات میں سے بعض کا تجزیہ کرنے سے ہم چند قابلِ ذکر نتائج پر پہنچتے ہیں ۔ مشہور اُردو شاعر مرزا اسداللہ خاں غالب کو اس دور کے تمدن اور روایات کا بہترین ترجمان تسلیم کیا گیا ہے چوں کہ وہ اُسی قبیل کے تھے جس کے زوال پذیر مغل دربار کے دوسرے لوگ تھے اس لیے انھوں نے انگریزوں کے ساتھ تعلقات پیدا کر لیے تھے اور ان کے بعض اوصاف اور کارناموں کے مداح تھے ۔ یہ پہلے اہم ادیب تھے جنھوں نے سائنس اور سیاسی تنظیم میں انگریزوں کے کارناموں کو کئی اعتبار سے مغلِ اعظم اکبر کی نسبت زیادہ ترقی پسندانہ پایا ۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنی ایک فارسی نظم میں کیا ہے ۔ یہ نظم ۱۸۵۵ء میں سرسید کی مرتب کی ہوئی ابوالفضل کی تصنیف "آئین اکبری" کے نئے نسخے کے لیے پیش لفظ کے طور پر لکھی گئی تھی ۔ اس میں قدیم نظام پر ایسی جگر خراش نکتہ چینی کی گئی تھی کہ سرسید بھی اسے اپنی تالیف میں شامل کرنے پر رضامند نہ ہوئے ۔ غالب جو اس وقت بہادر شاہ کے دربار کے ساتھ وابستہ تھے ، دہلی کے تمام عمائدین کے ساتھ قریبی تعلقات رکھتے تھے ۔ جب بغاوت پھیلی تو وہ بھی ناچار اس میں الجھ گئے جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو ان کے گھر پر مہاراجہ پٹیالہ کی فوج کا پہرا بٹھا دیا گیا (کیوں کہ یہ اُس کے ایک معزز دوست کا مکان تھا) اس طرح یہ خوش قسمتی سے انگریزوں کی غارت گری اور آتش زنی سے بچ گئے ۔ دوسری ادبی سرگرمیوں کے علاوہ غالب اس وقت فارسی زبان میں ایک روزنامچہ لکھنے میں مصروف تھے ۔ اگرچہ یہ روزنامچہ ایک اچھا ادبی شاہکار تھا لیکن تاریخی اعتبار سے اس کی زیادہ وقعت نہ تھی ۔ ان بیسیوں خطوط سے جو انھوں نے تمام ہندوستان میں رہنے والے طرح طرح کے لوگوں کو لکھے ، دہلی کے حالات سے متعلق اچھی خاصی واقفیت حاصل ہوتی ہے ۔ وہ کالوں اور گوروں کی دہشت انگیزی ، انگریز اور ہندوستانی دوستوں اور مربیوں کی موت ، دہلی کے فوجی چھاؤنی میں بدل جانے (جہاں کوئی کرفیو پاس

اور مصحفی نے لکھا:

"کافر فرنگیوں نے ہندوستان کی تمام دولت اور شان و شوکت دغابازی سے چھین لی۔"

پھر بغاوت رونما ہوئی۔ مبہم، غیر معین، غیر منظم لیکن شدید قومی جذبے کی سلگتی ہوئی آگ بھڑک اٹھی۔ چھوٹے بڑے بہت سے دربار جو شاعروں کے سرپرست تھے برباد ہو چکے تھے۔ اودھ کو، جو فنِ تہذیب کا بڑا مرکز تھا، ۱۸۵۶ء میں انگریزوں نے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ دہلی میں مغل حکومت صرف نام کی رہ گئی تھی۔ ایک نئی سلطنت وجود میں آ گئی جس کی جڑیں سرزمینِ ہند میں نہ تھیں اور جو ہندوستانی تمدن سے بیگانہ تھی۔ بغاوت یا اس کے نتائج سے متعلق اعلیٰ معیار کے ادبی کارناموں کی جستجو زیادہ سود مند نہ ہو گی اگرچہ ایسا ادب بھی موجود ہے۔ یہ زیادہ فائدہ مند ہو گا کہ ادب کو بھی ان خاص تاریخی اور معاشی قوتوں کی پیداوار سمجھا جائے جو خود بغاوت کا موجب ہوئیں۔ اس کے بعد کے ادب کے بیشتر حصے سے ایک مختلف رنگ نمایاں ہے۔ اس کے بعد کے شاعروں اور ادیبوں کو نئے اندازِ فکر کے راہنما قرار دیا جا سکتا ہے جنھوں نے ادب کو قوم کے ارتقا میں ایک تعمیری عمل تصور کیا۔ ان کے خیال میں ادب کا کام لوگوں میں نیا شعور پیدا کرنا ہے۔ ان میں اہم ترین شخصیتوں کے نام یہ ہیں: سرسید احمد خاں، خواجہ الطاف حسین حالی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، مولانا شبلی۔ مولانا ذکاء اللہ، چراغ علی، محسن الملک اور وقار الملک۔ ان سب کا عقیدہ یہ تھا کہ ادب زندگی کے مطابق بھی ہو اور اس کے لیے فائدہ مند بھی۔ پہلے یہ شعوری طور پر ممکن نہ تھا۔

جب ہم اردو ادب پر بغاوت کے اثر کا ذکر کریں تو ہمیں اس حقیقت کو نہ بھولنا چاہیے کہ اُس وقت اِس بغاوت کی ماہیت کو واضح طور سے نہیں سمجھا گیا تھا۔ بیشتر حالتوں میں اسے قہرِ الٰہی، فریبِ تقدیر، آسمان کی چشمِ بد، انقلابِ زمانہ اور اعمالِ بد کی سزا تصور کیا گیا۔ اس اہم تاریخی واقعہ کی انفرادی تعبیروں سے وہ غلط راہوں پر پڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بغاوت کی وسعت اور اصلیت کو سمجھنے کی کوئی کوشش نہ کی گئی۔ صرف یہی نہیں، بعض حلقوں میں جو بظاہر انگریزوں کے زیرِ اثر تھے اس کا یہ مطلب لیا گیا کہ یہ موجودہ حکومت کے خلاف بغاوت ہے۔ یہ خیال اس قدر غالب ہوا کہ بغاوت کو قومی تحریک کے ساتھ وابستہ کرنے میں بہت دیر لگی۔ جوں جوں نیا مواد ہاتھ لگے گا اور مزید حقائق کا انکشاف ہو گا بغاوت کا بے لاگ جائزہ لینے میں مدد دے گی۔

پہلے ہم ان تصنیفات کا ذکر کرتے ہیں جو بغاوت کے دوران مرتب ہوئیں۔ ایسی بہت سی

انکشاف ہوا ہے۔

ان کتابوں کا ذکر میں کر چکا ہوں جو مصنفین کے ذاتی تجربوں یا بغاوت سے پیدا ہونے والی صورتِ حال کا نتیجہ تھیں۔ سر سید نے (جو ابھی "سر" کے خطاب سے سرفراز نہیں ہوئے تھے) تاریخ سرکشی بجنور" لکھی۔ اُس وقت تک انھوں نے مسلمانوں کے روشن خیال طبقے کی راہنمائی کی باگ ڈور نہیں سنبھالی تھی۔ ان کی سیاسی زندگی کا آغاز ان کی کتاب "رسالہ اسباب بغاوت ہند" کی اشاعت کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کتاب اُردو میں لکھی گئی اور بعد میں اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ کیا گیا۔ یہ کتاب واقعات کا محققانہ تجزیہ بہم پہنچاتی ہے۔ وہ سارا الزام برطانوی پالیسی پر رکھتے ہیں جس کے سبب انگریز ہندوستانیوں کی خیر خواہی سے محروم ہو گئے۔ ان کا بیان ہے "یہ سرکار کا کام تھا کہ وہ کوشش کرے اور رعایا کی ہمدردی حاصل کرے نہ کہ رعایا کا فرض کہ وہ حکومت کے لطف و کرم کو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ اب برطانوی سرکار کو قائم ہوئے سو سال سے بھی اوپر ہو چکے ہیں لیکن اب تک اس نے لوگوں کے دل نہیں جیتے۔" خود سر سید کے کردار کی طرح یہ مقالہ بھی ایک بحث طلب دستاویز ہے لیکن پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ ہماری تاریخ کا کوئی بھی طالبِ علم اسے نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ظہیر دہلوی ایک جواں سال مگر نامور شاعر تھے جو بہادر شاہ کے دربار سے وابستہ تھے۔ چند سال گزرنے کے بعد انھوں نے اپنی آپ بیتی لکھی اور اس کا نام "داستانِ غدر" رکھا۔ انھوں نے دہلی کے واقعات، اپنے مصائب اور ان لوگوں کے کلام جن پر باغیوں کے ساتھی اور ہمدرد ہونے کا شک تھا، تفصیل کے ساتھ بیان کیے ہیں۔

ایک اور کتاب ہے جو نظموں کا مجموعہ ہے اور جس کا نام "فغانِ دہلی" ہے یہ ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب اس لیے قابلِ ذکر ہے کہ اس میں دہلی کی لوٹ مار اور بربادی سے متعلق کوئی چالیس شاعروں کی نظمیں جمع ہیں۔ ان نظموں میں زیادہ تر دہلی کے امرا اور شرفا کے مصائب کا بیان ہے۔ انھیں ایسی سختیوں کا سامنا کرنا پڑا جو انھوں نے پہلے کبھی نہ جھیلی تھیں۔ ان میں واقعات کا مبہم ذکر ہے اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان ہی زیادہ تر جور و ستم کا شکار ہوئے۔ کئی نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ دہلی کا ایک بھی صحیح الجسم نوجوان پھانسی سے نہ بچا۔ بعض نظموں کے اختتام پر اس خوش امیدی کا اظہار کیا گیا ہے کہ دہلی از سرِ نو آباد ہو گی اور گزرے ہوئے اچھے دن پھر لوٹ آئیں گے۔

کے بغیر گھوم پھر نہ سکتا تھا)، دہلی کے بے گناہ امرا کے مقدموں اور روزمرہ کی زندگی کی مشکلات کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ ان واقعات کو کوئی سیاسی اہمیت نہیں دیتے لیکن وہ جانتے ہیں کہ پچھلا زمانہ لوٹ کر نہ آئے گا۔ ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے جس میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

بسکہ فعّالِ ما یُرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

بغاوت کے دب جانے کے بعد غالبؔ دہلی کے لوگوں کے ساتھ بالعموم اور مسلمانوں کے ساتھ بالخصوص انگریزوں کے سلوک کے شاکی رہے۔ ان کے ایک دوست شیخ امام بخش صہبائی کو جو ایک جید عالم اور شاعر تھے، دو بیٹوں سمیت گولی سے اڑا دیا گیا۔ ممتاز عالم مولانا فضل حق کو انڈیمان بھیج دیا گیا جہاں انھوں نے بغاوت سے متعلق عربی زبان میں ایک کتاب بعنوان "الثورۃ الہندیہ" لکھی۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کو قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اردو زبان میں پہلے اہم ادبی اخبار کے بانی محمد حسین آزاد کے والد اور بلند پایہ مجتہد مولانا محمد باقر کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ غالبؔ نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کی غزلیں اس ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہونے والے درد و کرب کو مؤثر انداز میں ظاہر کرتی ہیں۔ اس زمانے کے بیشتر واقعات بہت سی تصانیف میں موجود ہیں مثلاً خواجہ حسن نظامی کی تصنیفات "غالب کا روزنامچہ"، "انگریزوں کی بپتا"، "بہادر شاہ کا مقدمہ"۔ راشد الخیری کی تصانیف "دہلی کی آخری بہار"، "نوبت پنج روزہ" امیر احمد علوی کی کتاب "بہادر شاہ ظفر" اور رئیس احمد جعفری کی تصنیف "بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد"۔

منیر شکوہ آبادی دبستان لکھنؤ کے مشہور شاعر تھے جو نواب فرخ آباد کے دربار سے وابستہ تھے۔ انھیں گرفتار کر کے مقدمہ چلایا گیا اور انڈیمان بھیج دیا گیا۔ انھوں نے مختلف نظمیں لکھی ہیں جن میں انھوں نے اپنے ذاتی مصائب اور قومی تباہی کو بیان کیا۔

محمد حسین آزاد نے انگریزوں پر افواجِ مشرق کی فتح کے بارے میں ایک نظم لکھی۔ یہ ۲۴ مئی ۱۸۵۷ء کو ان کے والد کے اخبار "دہلی اردو اخبار" میں شایع ہوئی۔ حال ہی میں اس کا

جب ہم جدید ادب کا مطالعہ کریں تو ہمیں اس کی دو متضاد خصوصیات کی طرف سے آنکھیں نہ بند کرنی چاہئیں یعنی ترقی پسندی اور رجعت پرستی، امید اور یاس خوف اور دلیری، حکمراں طبقہ کے تئیں وفاداری اور اس کے طور طریقوں کے خلاف احتجاج یہ قومی شعور کی نشو ونما میں ایک اہم مرحلے کے آثار تھے۔ اس تازہ حاصل کیے ہوئے شعور کو نئے ادبی اسالیب میں ظاہر کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد ہم نظم ونثر کی نئی اقسام کا ظہور دیکھتے ہیں۔ ناول، ناٹک، انشا پردازی، سوانح نگاری، تنقید اور طویل تخلیقی نظمیں مروج ہوئیں۔ کئی صورتوں میں قدیم اور جدید اسالیب کا امتزاج عمل میں آیا۔ چھاپہ خانہ کے وجود میں آنے سے نئے اسالیب کی ترقی اور اشاعت میں مدد ملی۔

اگر ان بیانات کی روشنی میں ہم سرسید، آزاد، حالی، نذیر احمد، شبلی اور شرر کی تصانیف کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ لوگوں کی ضروریات سے آگاہ تھے اور ان میں امید کی نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ حالی ہمیشہ اس مقولے کے قائل رہے: "ہمیں وقت کے ساتھ بدلنا چاہیے"۔ قرآنِ پاک کی تلاوت بارہ سو سال سے ہو رہی تھی لیکن کسی نے مسلمانوں کو انقلاب کی رفتار تیز کرنے کے لیے آیات کا حوالہ نہیں دیا تھا۔ اب حالی قرآن مجید کی مذکورہ ذیل آیت کا حوالہ دے رہے تھے: "ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم" (خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ آپ اپنی حالت نہ بدلے)۔ ان تمام ادیبوں نے تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کیا اور اس سے متعلق بہت کچھ لکھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے پیرو ناامیدی کو ترک کردیں اور ایک نئی زندگی شروع کریں۔ یہ محض حسنِ اتفاق نہیں کہ سرسید، حالی، آزاد، شبلی اور شرر سبھی نے نثر اور نظم میں امید کو اپنا موضوع بنایا۔ انھوں نے خدمتِ خلق کے لیے ادب کو دنیاوی حقائق کا آئینہ دار بنایا تاکہ علم کی اشاعت ہو۔ لوگ تغیرِ زمانہ کو قبول کرنے پر آمادہ ہوں اور اس کے مطابق اپنی تقدیر کو ڈھال سکیں۔

اُردو ادب میں قومی شعور کے ارتقا کی داستان قدرے طویل ہے۔ ان انشا پردازوں اور ان کی تصنیفات کے ناموں کا ذکر کرنا بھی ممکن نہیں جو بغاوت سے پیدا ہونے والے سیاسی شعور کا نتیجہ تھے۔ ان ادیبوں میں سے بیشتر نے سیاسی جور کے تاریک ترین ایام میں بھی لکھنا ترک نہ کیا۔ انھوں نے برج موہن چکبست کا ہمنوا ہو کر یہ نغمہ الاپا:

لکھنؤ کے شاعروں کی کئی نظموں کا بھی یہی لب ولہجہ ہے۔ ان میں وہ بادشاہ اور شہر
لکھنؤ کے تئیں اپنی وفاداری کے راگ الاپتے ہیں جو کلیتہً تباہ ہو چکا تھا۔ دراصل یہ نظمیں
قوم کا ماتم نہیں ہیں بلکہ معمولی واقعات کا مرثیہ ہیں لیکن ہم ان شاعروں پر نکتہ چینی نہیں کر سکتے
کیوں کہ ان کے حبِ وطن اور قومی اتحاد کے جذبے پر مقامی وفاداری اور عقیدت کا
رنگ غالب تھا۔

اُردو ادب کی روایت پر بغاوت کے اثرات کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں بغاوت
کے بعد کے واقعات کا تجزیہ کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ ان سے لوگوں کے دل و دماغ
کس طرح متاثر ہوئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے برطانوی تاج کے حق میں انتقالِ
اقتدار کے بعد مذہبی آزادی کا اعلان گویا ہندوستانیوں کو ایک بالواسطہ دعوت تھی کہ وہ
مذہبی نقطۂ نظر سے سوچنے لگیں۔ اس نے متوسط اور اعلیٰ طبقوں کے ذہن میں یہ بات
بھی ڈال دی کہ وہ صرف اپنے اپنے فرقوں کی بہبودی کا خیال رکھیں۔ دوسرے لفظوں
میں یہ ایک طرح سے احیائے مذہب اور ماضی کی شان پر فخر کرنے کا اشارہ تھا۔ بظاہر
یہ بات عجیب لگتی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جدوجہد کے بعد متحدہ قوم کے
تصور کو اس سے نقصان پہنچا۔ تقریباً تمام ہندوستانی زبانوں کے ادیبوں کو اپنے
آباو اجداد کے کارناموں کی حسرت بھری یاد ستانے لگی۔ بے شک ایک لحاظ سے یہ
بیداری کی علامت تھی لیکن مذہبی تنگ نظری ان کی تصنیفات کے قومی ادب کا جز بننے کی
راہ میں حائل ہوئی۔ اگر صورتِ حال اس کے برعکس ہوتی تو بنکم چندر چٹرجی، سرسید، بھارتیندو
اور اس کے رفقا حالی اور شبلی سے، کم از کم نفسِ مضمون کے اعتبار سے زیادہ بلند پایہ تصانیف
حاصل ہوتیں۔ اگر ہم ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور کے ادب کا تجزیہ کریں تو ہم صاف طور پر
دیکھ سکتے ہیں کہ مذہبی اندازِ فکر میں قومیت کا جذبہ پنہاں ہے لیکن اس کے واضح تر اظہار کے
لیے ہمیں بیسویں صدی کی تصنیفات دیکھنی ہوں گی۔

پرتاپ نارائن نے "ہندی، ہندو، ہندوستان" کا نعرہ لگایا اور سرسید اور
نذیر احمد مسلمانوں کا ایک علٰحدہ قوم کی حیثیت سے ذکر کرنے لگے۔ اگرچہ حالات
سے صاف صاف ظاہر ہے کہ وہ یا تو غیر ملکی خباثت کے زیرِ اثر تھے یا اپنی سادہ لوحی
کے سبب گمراہ تھے۔

کے۔ ایم۔ اشرف

غالبؔ اور بغاوت ۱۸۵۷ء

پرانے خیال کے مورخ نے غالبؔ (مرزا اسداللہ خاں) کا نام ایک مشہور اردو شاعر کی حیثیت سے سُنا ہوگا لیکن وہ غالبؔ کو ایک مورخ کی حیثیت سے نہ جانتا ہوگا جسے بہادر شاہ نے سرکاری طور پر مغلیہ خاندان کی تاریخ مرتب کرنے کا کام تفویض کیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے بھی واقف نہ ہوگا کہ اس جلیل القدر قومی شاعر نے نہ صرف باغیوں کی حکومت کے تحت دہلی میں رہنا پسند کیا بلکہ ایک روزنامچہ بعنوان "دستنبو" میں اُس نے اِس یادگار دور کے روزمرہ کے واقعات کو فارسی زبان میں قلمبند کیا۔[1] اُس روزنامچہ میں اندراجات کا آغاز ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء سے یعنی میرٹھ کے رسالے کے پہنچنے کے وقت سے ہوتا ہے اور اندراجات کا سلسلہ ۳۰ رستمبر تک چلتا ہے۔ جب برطانوی فوجی دستے دہلی میں عوامی مزاحمت پر قابو پانے میں کامیاب ہوگئے۔ بعض اعتبار سے اس روزنامچے میں لکھنؤ کی شکست تک (جولائی ۱۸۵۸ء) کے واقعات کا ذکر ہے۔

یہ واضح طور پر معلوم نہیں کہ مصنف نے یہ بے نظیر دستاویز کیوں مرتب کی۔ بہر حال اس کی اشاعت انگریزوں کے دہلی پر مکمل قبضے کے بعد ہوئی۔ یہ قیاس کرنا چنداں غلط نہ ہوگا کہ اس کتابچہ کے اصل متن میں صورتِ حال کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے مناسب ترمیم کی گئی تھی۔ غالبؔ کے موجودہ روزنامچہ میں واقعات کا بیان بہت مختصر ہے لیکن بعض اہم حقائق کا ذکر تک نہیں حالانکہ وہ عوام کے علم میں تھے۔ خصوصاً بہت سے اہم اور پُر معنی واقعات پر کم توجہ دی گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو روزنامچہ پر نظر ثانی کرنے کی فرصت ہی نہ تھی۔ اُس نے اسی پر اکتفا کیا کہ بعض عبارات کو محذوف کر دیا جائے اور بعض کا بعد میں خیال آنے پر اضافہ کیا گیا۔ یہ سب غالباً جان بچانے کے لیے کیا گیا ہوگا۔"[2]

داستان سرخوشی کے عالم میں شروع ہوتی ہے جب ہر طرف عوامی بغاوت زوروں پر تھی

دل اسیری میں بھی آزاد ہے آزادوں کا

ولولوں کے لیے ممکن نہیں زنداں ہونا

اس مختصر مقالے کا مقصد یہ نہیں کہ قومی تحریک کی تاریخ بہم پہنچائی جائے جس کی اردو ادب میں عکاسی کی گئی ہے۔ مصنف کا منشا صرف یہ ہے کہ ان ادیبوں کی دلی اور دماغی کیفیت کی ایک جھلک دکھائی جائے جنھیں پُر آشوب سیاسی زندگی کے کھلے سمندر میں چھوڑ دیا گیا۔ اس بغاوت کے سبب ان کے دلوں میں دبا ہوا غصہ اور جوش پھوٹ پڑا اور انھوں نے ہندوستان کی آزادی اور ترقی کی خاطر اس سے آج تک کام لیا۔ اردو ادیبوں کی نگاہ میں بغاوت کا یہی مطلب اور اس کی یہی وقعت ہے۔

اپنے آپ کو سختی کے ساتھ الگ تھلگ رکھا ہے بلکہ درحقیقت میں اپنے مکان میں محبوس رہا ہوں۔
انگریزی فوجی دستوں کے داخل ہونے کے بعد بھی میں نے شہر میں ٹھہرنا پسند کیا حالاں کہ بہت
سے رئیس اور پنشن خوار بھاگ گئے۔"[۹] بغاوت میں اپنی عدم شرکت کے ثبوت میں انھوں نے ہندوستان
اور انگلینڈ میں اعلیٰ حکام کی خدمت میں اپنا فارسی روزنامچہ (دستنبو) پیش کیا۔ اس کی وجوہات
معلوم کرنا کچھ دشوار نہیں۔ ایہام گوئی میں استاد ہونے کے سبب یہ طرز انیسویں صدی کے مغل دربار
کے اہلِ ادب میں مقبول تھی[۱۰]۔ وہ شعر کے معنی بیان کرتے ہوئے بھی اس کو چھپانے میں مہارت رکھتے
تھے۔ اپنے طرزِ کلام اور مفہوم دونوں میں ایہام کو بڑھانے کے لیے اس موقع پر غالب نے فارسی
زبان کی ادبی پاکیزگی کے حق میں اپنے تعصب سے فائدہ اٹھایا۔ غرضیکہ انھوں نے اس بات کا خاص
خیال رکھا کہ ان کے روزنامچے کو خود یا اُن دوستوں کے خلاف جنھوں نے بغاوت میں نمایاں حصہ لیا
ثبوت کے طور پر استعمال نہ کیا جا سکے۔"

لیکن اس سے دہلی میں بغاوت سے متعلق بعض واقعات کے لیے معتبر سند اور ماخذ کی
حیثیت سے دستنبو کی وقعت کم نہیں ہوتی۔ مجھے اس بات پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ مصنف
کا شوقِ راست گوئی اور جذبۂ انسان دوستی، اس کتاب کی ایسی ہی خصوصیات ہیں جیسی اس کی
دوسری تصنیفات کی[۱۱]۔ ظاہر اسباب کی بنا پر واقعات کا بیان بے شک مبہم اور عمومی ہے۔ غالب اس
جزوی داستان میں بھی قومی مزاحمت کی اس عظیم تحریک کی گرمجوشی سے ہمیں آگاہ کرنے اور اس
میں ابھرنے والی نئی سماجی قوتوں کی جھلک دکھانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ غالب کے فارسی روزنامچہ
کا موجودہ نسخہ، اپنی مجبوریوں اور کمیوں کے باوجود، ۱۸۵۷ء کے واقعات کے ہر ایماندار طالب علم
کے لیے ایک بیش قیمت دستاویز ہے[۱۲]۔

اب ہم دستنبو سے کچھ اقتباسات قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اس کی خوبیوں
اور خامیوں کا فیصلہ انھی پر چھوڑتے ہیں۔

عوام کی بغاوت

شاعر منظر کے آغاز میں کسی قدر پریشان ہے: "عوام حکمرانوں کے
ساتھ برسرِ پیکار ہیں۔ باغی سپاہی برطانوی سپہ سالاروں کا خون بہاتے ہیں اور پھر نتائج سے
بے خبر ہو کر بغلیں بجاتے ہیں۔" (کلیات صفحہ ۳۸۰)

اور پہاڑی پر انگریزی فوجی دستوں کا مقابلہ کرنے کے لیے مختلف سمتوں سے ہندوستانی فوجیں دہلی کی جانب بڑھ رہی تھیں لیکن جوں ہی لڑائی شروع ہوئی ۔ جو چار مہینے دس دن تک جاری رہی ۔ مصنف کی خاموشی بڑھتی گئی اور اُس نے چُپ سادھ لی ۔ عام کیفیت کے بیان کی چند سطروں کے بعد ہمیں یکایک بتایا جاتا ہے کہ "کشمیری دروازے پر انگریزوں کے حملے کے مقابلے میں ہندوستانی فوجوں کے لیے سوائے پسپا ہونے کے کوئی چارہ نہ رہا۔"[۳] اب وہ اصل موضوع سے گریز کرتا ہے اور ملک میں تحریکِ مزاحمت کے چند اتفاقی مگر حقیقت افروز حوالوں کے سوا وہ زیادہ تر اپنے خانگی مسائل اور سابقہ دور میں انگریزوں کے تئیں اپنے خاندان کی خدمات کے ذکر پر متوجہ ہو جاتا ہے ۔

بغاوت کی تفصیلات پر بحث سے متعلق مصنف کی خاموشی اور غیر ملکی فاتحین کے تئیں اُس کی وفاداری کے دعووں کی حقیقت اور وقعت کو آسانی سے سمجھ سکتے ہیں اگر ہم اس وحشیانہ قتلِ عام کو ملحوظ رکھیں جو اُس وقت جاری تھا ۔ بغاوت میں اُس کی شرکت کے ذرہ بھر گمان پر بھی اُسے یقیناً پھانسی پر چڑھا دیا جاتا ۔[۴] اس کے علاوہ غالب معاش کے لیے پنشن پر انحصار رکھتے تھے اور اس سے پیشتر کہ حکام اُس کی بحالی پر آمادہ ہوتے، انھیں اپنے خلوصِ نیت کا ثبوت بہم پہنچانا تھا ۔ یہ اُس شخص کے لیے اور بھی زیادہ ضروری تھا جو طبقۂ امرا سے تعلق رکھتا تھا اور دہلی کے مغل بادشاہ بہادر شاہ کا اتالیق، درباری اور ندیم رہ چکا تھا۔[۵] اگرچہ وہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے جدید تہذیبی اثرات کو سراہتے تھے لیکن انگریزوں کی جارحانہ پالیسیوں بالخصوص اودھ کے الحاق کو قبول نہ کر سکتے تھے ۔[۶] کچھ دیر کے بعد جب مارشل لا کی سختیوں میں ڈھیل ہوئی اور امن امان کی حالت بحال ہوئی تو غالب انگریزوں کے جور و ستم کی زیادہ کھل کر مذمت کرنے لگے ۔ وہ جاگیردار شرفا کی اس خام خیالی سے متفق نہ تھے کہ نئے حکمراں اُن کو سیاسی اقتدار میں شریک کریں گے ۔[۷] انھوں نے عام طور پر اپنے باغی ساتھیوں اور شکست خوردہ طبقۂ امرا کے مصائب کے لیے کھلے بندوں ہمدردی کا اظہار کیا ۔[۸]

حقیقت یہ ہے کہ جب ستمبر ۱۸۵۷ء کے وسط میں حالات دگرگوں ہو گئے تو انھوں نے اپنے بہت سے دوستوں کی طرح اپنی سلامتی کو ہر چیز پر ترجیح دی ۔ اس لیے اگر انھوں نے حکام کے سامنے اپنی بریت کی پُر زور وکالت کی تو اس کے لیے انھیں قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ میرا خاندان ہمیشہ انگریزوں کا نمک حلال رہا ہے اور اسی بنا پر مجھے زندگی بھر کے لیے پنشن عطا ہوئی ہے ۔ بغاوت کے ایام میں میں نے شاہ پرستوں اور باغیوں دونوں سے

سپاہی خاص و عام سب پر حکم چلاتا ہے۔" (ایضاً صفحات ۸۵-۳۸۴)

عوامی لشکر کا دہلی میں اجتماع

غالبؔ نے لکھا ہے کہ جوں ہی سپاہیوں کے مختلف دستے دہلی میں پہنچے، سب سے پہلے اُنھوں نے اپنے ساتھ لایا ہوا سونا چاندی شاہی خزانے کے حوالے کر دیا۔ پھر وہ لال قلعہ میں گئے تاکہ بادشاہ کے آستانہ پر سجدہ کریں۔ بعد میں فوجیوں کے انداز میں اِدھر اُدھر پھرنے لگے۔
"لو دیکھو! ہر کونے کھترے سے ایک سپاہی نمودار ہوا۔ ہر راہ سے ایک پلٹن اور ہر جانب سے ایک فوج ظاہر ہوئی۔ سبھی اس سرزمین یعنی دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ عجیب زمانہ ہے، کامران باغیوں کے مزے ہیں۔ اب دہلی کے شہر کے اندر اور باہر کم و بیش پچاس ہزار پیادہ اور سوار فوجی جمع ہو چکے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۳۸۵)

ہندوستانی والیانِ ریاست پر عوام کا دباؤ

نامور والیٔ فرخ آباد تفضل حسین خاں نے دور ہی سے بادشاہ کے حضور میں جبہ سائی کی اور اطاعت کا اظہار کیا۔ بریلی کے خان بہادر خاں نے حضورِ شاہ میں ایک سو ایک سونے کی مہریں، ایک ہاتھی اور ایک گھوڑا چاندی کے ساز کے ساتھ بطور ہدیہ بھیجا۔ رام پور کے نواب یوسف علی خاں بہادر جنھوں نے مدت سے انگریز حکمرانوں کے ساتھ پیمانِ وفا باندھ رکھا تھا، بہادر شاہ سے وفاداری کا رسمی پیغام بھیجنے پر مجبور ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے اپنے نکتہ چیں ہمسایوں کا منہ بند کر دیا۔ لکھنؤ میں دانشمند وزیر (لفظی معنی "معاملہ فہم") شرف الدولہ نے واجد علی شاہ کے بیٹوں میں سے ایک دس سال کے لڑکے کو تخت پر بٹھا دیا اور خود اُس کے پیشکار اور مشیر بن گئے۔ اُس نے دہلی میں شاہی دربار کو بیش بہا تحائف کے ساتھ اپنا سفیر بھیجا۔ الغرض بادشاہ کی قسمت کا ستارہ اتنا بلند ہوا کہ فرنگیوں (لغوی معنی خاکی وردی پہننے والوں "خاکیوں") کا چہرہ گہنا گیا۔" (ایضاً صفحات ۸۸-۳۸۷)

انگریزوں کے ساتھ جنگ

"دن رات دونوں طرف سے سنگریزوں کی مانند فضا سے گولے برستے ہیں۔ مئی اور جون کی گرمی آفتاب کی تیز روشنی کے ساتھ روز بروز بڑھ رہی ہے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد شاہی فوج

حامیانِ فرنگ کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں

"چوں کہ تیز سیلاب کو خس و خاشاک سے روکنا محال ہے، اس لیے انگریزوں کے مددگاروں میں سے ہر ایک لاچار ہو گیا اور حالات کے بگڑنے پر گھر کی چار دیواری میں سوگوار ہو کر بیٹھ رہا۔ مجھے بھی اِن ماتم داروں میں شمار کر لو۔" (ایضاً صفحہ ۳۸۲)

میرٹھ کے سواروں کا اُن کے پہنچنے پر استقبال

"میرٹھ سے کچھ کینہ پرور سوار شہر میں داخل ہوئے۔ یہ سب شور و غل کرنے والے تھے جو اپنے آقاؤں کو ہلاک کرنے کے لیے بے تاب اور انگریزوں کے خون کے پیاسے تھے۔ شہر کے دروازوں پر متعین دربانوں کو سازش کا پورا پورا علم تھا (لفظی معنی "ہم سوگند") انھوں نے ان ناخواندہ (یا شاید خواندہ) مہمانوں کا خیر مقدم کیا۔ بہر حال سواروں نے دربانوں کو مہمان نواز پایا۔" (ایضاً)

بغاوت کی توسیع

"رفتہ رفتہ دور دراز شہروں سے خبریں آنے لگیں کہ ہر چھاؤنی میں ہر رجمنٹ کے شوریدہ سروں نے اپنے انگریز سپہ سالاروں کو قتل کر دیا ہے۔ جس طرح ساز چھڑتے ہی رقاصہ رقص میں آجاتی ہے، اسی طرح ہر طرف نمک حرام سپاہی اور کاریگر اٹھ کھڑے ہوئے اور دل و جان سے بغاوت میں شریک ہو گئے اور دوسرے سے ایک لفظ کہے بغیر اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ماہرِ جنگ سپاہیوں کے یہ بزدل دستے جھاڑو کی مانند ایک ہی شیرازے میں بندھے ہوئے ہیں۔ بے ترتیبی سے اُن کے کوچ کرنے کا منظر دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کسی باقاعدہ سپہ سالار کی قیادت کے بغیر لڑتے بھی ہیں۔" (ایضاً)

جاگیردار طبقہ پسِ پشت پڑ جاتا ہے

"اُنھوں نے نام ور اور دانشمند ہستیوں کی عزت اور ان کی حویلیوں کو خاک میں ملا دیا۔ پیچ اور کنگال یکایک ممتاز ہو گئے۔ ذرا خیال کرو یہ شہدے، لچے اب تیس مار خاں بنے ہوئے ہیں۔ یہ بدبختی کے دن ہیں جب جواں مرد خود اپنے سایہ سے ڈر جاتے ہیں اور ایک معمولی

دیہات اور دہلی کے گرد و نواح میں مزاحمت

بالآخر جب ۷ ، اکتوبر ۱۸۵۷ء کو دہلی رسمی طور پر انگریزوں کے قبضے میں آگئی لیکن دیہات میں مزاحمت کسی صورت کم نہ ہوئی۔ مصنف لکھتا ہے: "اب بھی بریلی، فرخ آباد اور لکھنؤ میں کثیر التعداد باغی منظم گروہوں کی صورت میں لڑنے اور زمین کا چپہ چپہ واپس لینے پر تلے ہوئے ہیں (لفظی معنی ایک ایک فرسنگ)[14] دہلی کے قرب و جوار میں سوہنا اور نوہ (ضلع گوڑگاؤں) کے میواتیوں نے ایسا اودھم مچا رکھا ہے جیسے سودائی زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گئے ہوں۔ تلا رام اب بھی ریواڑی میں مغرور ہے اور دیوی نام کے میو کی فوجوں میں شامل ہو گیا ہے اور اس کے حکم کے تحت کام کرتا ہے۔ ان پہاڑی اور جنگلی علاقوں میں یہ گروہ برطانوی حکمرانوں کے ساتھ لڑنے کا اپنا جداگانہ منصوبہ رکھتا ہے۔ الغرض یہ کہنا بجا ہوگا کہ ہندوستان کا ذرہ ذرہ ہیجان میں مبتلا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۹۷)

ایک خانگی نظارہ: بارش کے پانی کا ذخیرہ کرنا

۱۵ ستمبر کے بعد غلے کی تمام دکانیں بند ہو گئیں اور بہشتی، دھوبی، حجام اور پھیری والے شہر چھوڑ گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دو دن اور دو رات کھانے پینے کو کچھ نہ ملا۔ قدرتی طور پر غالب بدحواسی کے عالم میں تھے جب "اچانک آسمان ابر آلود ہو گیا اور بارش ہونے لگی۔ ہم نے گھر میں کپڑے کی ایک چادر پھیلائی، اس کے نیچے ایک بڑا مٹکا رکھا اور اس طرح بارش کا پانی جمع کیا۔ کہتے ہیں کہ بادل سمندر سے پانی حاصل کرتے ہیں اور زمین پر برساتے ہیں لیکن اس موقع پر یہ بیش بہا بادل ہمارے لیے چشمۂ زندگی سے پانی لائے ہیں۔ بہر حال جس آبِ حیات کو سکندر اپنی بادشاہی کے دوران ڈھونڈنے میں ناکام رہا وہ اس کھاری پانی پینے والے عاجز تشنہ لب نے مصیبت کی اس گھڑی میں دریافت کر لیا۔"[15]

غارت گری اور قتلِ عام

شہر پر برطانوی قبضے کے ساتھ بقول مصنف "ہمارے نئے آقاؤں کی آتشِ انتقام" کا نیا دور شروع ہوا۔ "فاتحین کشمیری دروازے کے سامنے کے راستے سے آگے بڑھے جو بازار کو جاتا ہے اور جو کوئی بھی سڑک پر ملا اسے قتل کر ڈالا۔ ہر شریف اور ہوشمند نے اپنے گھر کا دروازہ بند کر دیا۔"

کے جنگجو روزانہ شہر کے گوشے گوشے سے جمع ہوتے ہیں۔ شیروں کی مانند لڑنے جاتے ہیں اور غروب آفتاب سے عین پہلے واپس آجاتے ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۲۸۶)

حویلی حکیم احسن اللہ خاں آگ کی نذر

"انھوں نے انگریزوں کے مددگار حکیم احسن اللہ خاں کی حویلی کو لوٹ لیا جو نگار خانہ چین کی مانند نظر آتی تھی اور استقبالیہ ہال سے متصل کمرے کو آگ لگا دی۔" (ایضاً صفحہ ۲۸۷)

برطانوی حملہ اور باغیوں کی پسپائی

"۱۴ ستمبر ۱۸۵۷ء کو انگریزوں کا حملہ ہوا اور اب کشمیری دروازے پر برطانوی حملے کے مقابلے میں ہندوستانی فوجوں (لفظی معنی "کالے سپاہیوں") کے لیے پسپا ہونے کے سوا کوئی چارہ نہ رہا۔" (ایضاً صفحہ ۲۸۸)

لوگوں کی آخری دم تک مزاحمت

"جب انگریزوں نے عوامی فوج کے ہاتھوں سے شہر چھین لیا تو عام لوگ باغی سپاہیوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور گلی گلی میں لڑنے لگے۔ شہر کے بعض شہدے، کمینے شہر پر قابض بہادر انگریز فوجیوں کے ساتھ مقابلہ کرنے لگے۔ دو تین دن تک کشمیری دروازے سے آگے شہر کا گوشہ گوشہ پیچ پیچ میدانِ جنگ بنا رہا اور باہر جانے کے تین راستے یعنی اجمیری دروازہ، ترکمان دروازہ اور دہلی دروازہ باغی فوجیوں کے ہاتھ میں رہے۔" (ایضاً صفحہ ۲۸۹)

بالآخر دہلی پر انگریزوں کے قبضے کا یہ نتیجہ ہوا کہ "اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کے بہت سے لوگ جن کا شمار ناممکن تھا ان تین دروازوں کے ذریعے شہر سے بچ کر نکل گئے۔" (ایضاً)

لوگوں کی بلند حوصلگی

اپنے محلے میں رہنے والے شہریوں کا ذکر کرتے ہوئے غالب لکھتے ہیں: "اگرچہ گلی کا پھاٹک بند ہے پھر بھی لوگ اس قدر بے خوف ہیں کہ وہ دروازے زبردستی سے کھول کر کھلے میدان میں نکل جاتے ہیں اور کھانے پینے کی چیزیں لے آتے ہیں۔" (ایضاً)

کوئی دھواں نہیں نکلتا۔" اس ویرانی اور ناامیدی کے عالم میں شاعر کو فقط یہی نظر آتا تھا کہ مسلمانوں کو قوم کی حیثیت سے موت اور فاقہ کشی کا سامنا ہے (ایضاً صفحہ ۴۱۰) البتہ جلد ہی کہیں اُفق پر ایک دھندلا سا نقش نمودار ہوا اور شاعر نے بالآخر صوفیانہ انداز میں امید کا اظہار کیا:

چرگر کہ زخمہ بر چنگ زند
پیداست کہ از بہر چہ آہنگ زند
در پردۂ ناخوشی، خوشی پنہاں است
گازر نہ زخشم جامہ بر سنگ زند

(مطرب جب باجے کے تار پر مضراب لگاتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ غم کے پردے میں خوشی پوشیدہ ہے۔ دھوبی کسی غصّے سے کپڑے کو پتھر پر نہیں پٹکتا۔)

کتابیات

(۱) دستنبو: کلیاتِ غالب (فارسی) میں شامل ہے۔ مطبوعہ لکھنؤ ۱۸۷۲ء

(۲) کلیاتِ نثرِ غالب (لکھنؤ، ۱۸۷۱ء)

(۳) غالب کا روزنامچہ (دہلی ۱۹۲۴ء)

(۴) مکاتیبِ غالب (رامپور، ۱۹۴۹ء)

(۵) نادر خطوطِ غالب (لکھنؤ، ۱۹۳۹ء)

(۶) عُودِ ہندی (علی گڑھ ۱۹۲۷ء)

(۷) اُردوئے معلّٰے (لاہور ۱۹۲۲ء)

حواشی

۱۔ اپنے ایک اُردو خط میں غالب لکھتے ہیں کہ جب ۱۱ مئی کو دہلی میں فساد شروع ہوا تو کس طرح انھوں نے گھر کا دروازہ بند کر دیا (جو شہر کے عین وسط میں واقع تھا) اور چوں کہ "بے شغل زندگی بسر نہیں ہوتی، اس نے اپنی سرگزشت جو اوروں سے سُنی تھی، لکھنا شروع کر دی۔"

(ایضاً صفحات ۸۹-۲۸۸) غالب نے یکایک دیکھا کہ "ہر طرف پھانسی کے تختے نصب ہیں اور سڑکیں وحشت ناک ہیں ۔۔۔۔ اب کسی کو باہر نکلنے اور ہم سے بات کرنے کی جرات نہیں اور نہ ہمیں باہر جانے اور اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھنے کی مجال ہے۔" (ایضاً صفحات ۹۲-۲۹۱)

جہاں تک شہر کی تاخت وتاراج کا تعلق ہے "فوجی دستوں کے نام یہ حکم عام جاری کیا گیا ہے کہ جو شخص فوراً ہتھیار ڈال دے اس کی جان بخشی کردی جائے لیکن اس کا مال ومتاع قبضے میں لے لیا جائے۔ اگر کوئی مقابلہ کرے تو اُسے جان سے مار دیا جائے اور اس کے مال پر تصرف کرلیا جائے۔ بہر حال سارے شہر میں اتنی لاشوں کو دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ قتلِ عام ہوا ہے کیوں کہ اُن کے کندھوں پر اُن کے سر موجود نہیں ہیں۔" (ایضاً صفحہ ۲۹۵)

"جھجر، بہادر گڑھ، بلب گڑھ، لوہارو، فرخ نگر، دوجانہ اور پٹودی شہر کے گرد ونواح میں ایسی سات ریاستیں ہیں جن کے حکمران دہلی میں برطانوی ایجنسی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں سے پانچ والیانِ ریاست کو سزا کے لیے قلعے میں نظر بند کردیا گیا ہے اور باقی دو اپنے حشر کا بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ اُنھوں نے جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے حکمرانوں کو الگ الگ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔" (ایضاً صفحات ۴۰۰-۴۰۱)

اس کے بعد دہلی ایک بڑا جیل خانہ نظر آنے لگا۔ بقول مصنف "اس شہر میں جیل خانہ قصبے کی حدود سے باہر اور حوالات (دارالعزا) حدودِ شہر کے اندر ہے۔ ان دو مقامات کو لوگوں سے اس قدر کھچا کھچ بھر دیا گیا ہے گویا ایک دوسرے میں گھس کر گٹھری کی صورت بندھے ہوئے ہیں۔ صرف فرشتۂ اجل ہی جانتا ہے کہ ان دو قید خانوں میں کتنے قیدی وقتاً فوقتاً تختۂ دار پر لٹک کر مرے ہیں۔ شہر میں مسلمان باشندوں کی تعداد اس وقت ایک ہزار سے زیادہ نہیں جو یا تو قیدیوں کے رشتہ دار ہیں یا پنشن خوار ۔۔۔" (ایضاً صفحات ۴-۴۰۳)

لمحاتِ یاس اور تصورِ مستقبل

غالب اس شہر کو جسے اُس نے شہر خموشاں کا نام دیا، دیکھ کر شکستہ دل تھا۔ "ایک وقت تھا کہ وہاں ہزاروں اُس کے آشنا تھے۔ ہر گھر میں اس کا کوئی نہ کوئی رفیق اور ہر مکان میں اُس کا کوئی نہ کوئی دوست تھا۔" یہ خیال اُس کے لیے درد وکرب کا موجب تھا کہ وہ شہر مسلمانوں سے خالی ہے رات کی تاریکی میں ان کے گھر بے چراغ ہیں اور دن کو روزنِ دیوار میں سے کوئی

اپنے قبضۂ قدرت میں رکھا، آدمی کو بدنام کیا ہے۔" (عودِ ہندی صفحہ ۹۴)

۸۔ وضاحت کے لیے خیر آباد کے مولانا فضل حق کی مثال لیجیے جنھیں بعد میں عمر قید کی سزا دے کر انڈیمان بھیجا گیا، وہیں ان کی وفات ہوئی۔ ۱۸۶۱ء میں جب اُن کا ایک دوست کلکتہ آیا تو غالب نے اس سے بڑی فکرمندی کے ساتھ مولانا کا حال دریافت کیا (اُردوئے معلّٰی صفحہ ۱۴) جب مولانا کا انتقال ہوا تو غالب نے اس دوست کی موت پر ماتم کیا جو "فخرِ ایجاد و تکوین" (مولانا فضل حق) تھا جبکہ وہ خود مصیبت کی گھڑیاں گن گن کر زندگی کے دن کاٹ رہا تھا (ایضاً صفحہ ۴۲) امرا کے قدیم طبقے کا جو غم اُسے کھائے جا رہا تھا اس کا اس کے مجموعۂ خطوط میں بار بار ذکر کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا خط مورخہ ۲۸ نومبر ۱۸۵۸ء لیجیے جس میں وہ یوسف مرزا کو لکھتا ہے: "میرا حال سوائے میرے خدا اور خداوند کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتے ہیں، عقل جاتی رہتی ہے، اگر اس ہجومِ غم میں میری قوتِ متفکرہ میں فرق آگیا ہو تو کیا عجب ہے بلکہ اس کا باور نہ کرنا غضب ہے میں علی کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ ان اموات کے غم میں اور زندوں کے فراق میں عالم میری نظر میں تیرہ و تار ہے ..... یہاں اغنیا اور امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں (اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے) (ایضاً صفحات ۵۵-۲۵۴) یہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اُس وقت خود مصنف کو تنگ دستی کا سامنا تھا۔ ایک بار اُس کے پاس صرف ایک روپیہ سات آنے باقی رہ گئے تھے اور فاقہ کشی کی نوبت آنے میں تھوڑی ہی کسر باقی تھی۔ (ایضاً صفحات ۵۱-۲۵۰) انگریزوں کے ہاتھوں امرا کی حویلیوں کی تباہی پر رائے زنی کرتے ہوئے غالب نے ایک بار انگریز کو بندر سے مشابہ کیا: "ایک پیلتن بندر پیدا ہوا ہے۔ مکانات جابجا ڈھاتا پھرتا ہے۔ فیض اللہ خاں بنگش کی حویلی پر جو گلدستے ہیں انھیں سے ہلا ہلا کر ایک کی بنیاد ڈھا دی ... واہ رے بندر! یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔" (ایضاً صفحہ ۲۸۸)

۹۔ کلیات صفحہ ۲۸۹، نیز رامپور کے نواب یوسف علی خاں کے نام ایک خط مورخہ ۱۴ جنوری ۱۸۶۵ء میں۔ (مکاتیبِ غالب صفحہ ۹)

۱۰۔ کلیات صفحہ ۲۹، نیز عودِ ہندی صفحہ ۱۴، غالب نے اپنے روزنامچہ میں عربی زبان کے عام معمولی الفاظ اور اصطلاحات کے ترک کا بھی التزام کیا ہے جو اُس زمانے میں مروج اور متداول تھے۔

۱۱۔ یہ ملاحظہ کرنا باعثِ دل چسپی ہے کہ مصنف نے مولانا فضل حق اور مفتی صدر الدین کے سے بلند پایہ اشخاص کے ناموں کا ذکر نہیں کیا جنھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد کی حمایت میں مسلم علما کا فتویٰ

(عودِ ہندی صفحہ ۱۴۲) اس قسم کی عبارت اُن کے روزنامچہ میں بھی موجود ہے (کلیاتِ نثرِ غالب صفحہ ۱۸۷)

۲۔ اس کے مقدمہ کے خوف کے بارے میں ملاحظہ کریں "کلیات"

۳۔ ایضاً صفحہ ۲۸۸

۴۔ عام طور پر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف شہر دہلی میں ۲۷،۰۰۰ اشخاص کو پھانسی دی گئی یا گولی سے اُڑایا گیا۔ جو لوگ قتل ہوئے اُن میں غالب کے دوست اور مشہور شاعر صہبائی کا خاندان بھی شامل تھا۔

۵۔ مصنف اپنے روزنامچہ میں دیدہ و دانستہ بہادر شاہ اور شہزادوں سے متعلق تمام حوالوں کو حذف کر دیتا ہے (کلیات صفحہ ۲۹۸)۔ جب بہادر شاہ کی جلاوطنی کی حالت میں موت کی خبر پہنچتی ہے تو اُسے غم کا احساس بھی ہوتا ہے اور اطمینان بھی۔ شاعر نے لکھا کہ "فرشتۂ ازل نے اسے قیدِ فرنگ سے بھی آزاد کر دیا ہے اور قیدِ جسمِ فانی سے بھی۔" (اُردوئے معلّےٰ صفحات ۲۱۔۱۲۰)

۶۔ ۲۳ر فروری ۱۸۵۶ء کے روزِ بغاوت سے چند ہفتے پہلے اودھ میں (غلام حسین بلگرامی نام کے) ایک دوست کو خط لکھتے ہوئے غالب لکھتا ہے: "ان بُرے دنوں کا خیال کر و جو ہمارے مقدر میں لکھے ہیں۔ گو اس سے مجھے براہِ راست کوئی سروکار نہیں لیکن اودھ کی تباہی سے مجھے صدمہ پہنچا ہے۔ درحقیقت میری رائے ہے کہ اگر کسی ہندوستانی کو اودھ سے کوئی ہمدردی نہیں تو وہ انصاف سے بالکل بے بہرہ ہے۔" (ایضاً صفحہ ۴۰۳) جب اپنے روزنامچے کے اختتام پر اُسے لکھنؤ کی شکست کی روئداد قلمبند کرنی پڑتی ہے تو غالب بظاہر مغموم ہو جاتا ہے اور اس واقعے سے متعلق اظہارِ رائے میں صرف سعدی کے ایک شعر پر اکتفا کرتا ہے ؎

چہ کند بندہ کہ گردن نہ نہد فرماں را
چہ کند گوئے کہ تن در ندہد چوگاں را

اس کا مطلب یہ ہے کہ "غلام کیا کرے اگر اپنے آقا کے حکم کے آگے سرِ تسلیم خم نہ کرے۔ گیند کیا کرے اگر بلّے کی ضرب بلا چون و چرا نہ سہے۔" (کلیات صفحہ ۴۰۵)

۷۔ جب مصنف کو اطلاع ملی کہ مہاراجہ الور کے پورے اختیارات بحال کیے جا رہے ہیں تو غالب نے (جو اس زمانہ کی مسئلہ جبر و قدر کی فلسفیانہ بحث میں تقدیر کی برتری کا معتقد تھا) ایک دوست کے نام خط میں طنزاً یہ کلمات لکھے: "بالفعل تمام عالم کا ایک سا عالم ہے۔ سنتے ہیں کہ نومبر میں مہاراجہ کو اختیار ملے گا مگر وہ اختیار ایسا ہو گا جیسا خدا نے خلق کو دیا ہے۔ سب کچھ

۱۷۔ ایک اردو خط میں یہ زیادہ واضح ہے جہاں اس نے اُسے "قتل عام" کا نام دیا (ایضاً، صفحہ ۱۲۸) ایک اور خط میں اُس نے دہلی پر دوسرے حملہ آوروں کے علاوہ انگریزوں کا بھی ذکر کیا: "دوسرا لشکر خاکیوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر لُٹ گئے۔" (عودِ ہندی صفحہ ۹۰)۔

۱۸۔ ایک اور مقام میں مصنف انگریزوں کا ذکر کرتا ہے جنھوں نے شمع کو گل کر دیا لیکن ساتھ ہی صبحِ صادق کی بشارت دی جو نورِ آفتاب کا پیش خیمہ تھی۔

صادر کیا اور جو غالب کے یارِ غار اور دوست شمار ہوتے تھے۔ درحقیقت اس کے روزنامچہ میں صرف ایک آدمی کا ذکر ہے اور وہ ہے حکیم احسن اللہ جو انگریزوں کی مدد کرنے کی وجہ سے باغیوں کے کیمپ میں بدنام ہو چکا تھا اور غالبؔ نے اس کیفیت کا خاص طور پر مناسب ذکر کیا ہے (کلیات صفحہ ۳۸۷)

۱۲۔ اپنے روزنامچہ میں غالب لکھتا ہے: "درحقیقت ایک آزاد منش کو واجب نہیں کہ وہ راستی پر پردہ ڈالے۔ خاص طور پر میرے جیسے نیم مسلمان کو جو کسی مذہب و ملّت کا پابند نہیں اور جو نیکنامی سے معلق بے نیاز ہے" (کلیات صفحہ ۴۰۷) اس ضمن میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ گو غالب نے انگریزوں کے خلاف لڑنے میں باغیوں کی بہادری کی داد دی لیکن دہلی میں بیگناہ انگریزوں کا خون بہانے کی وجہ سے انھیں کبھی معاف نہیں کیا۔ ان کی انسان دوستی سے واقف ہونے کے لیے دوسری تصنیفات کے علاوہ اُردوئے معلّے (صفحہ ۴۴۲) میں اُن کے ارشادات ملاحظہ فرمائیں۔

۱۳۔ غالب کے روزنامچے کا اُردو زبان میں ایک ملخص نسخہ مولفۂ مرزا یعقوب بیگ دہلی سے حسن نظامی نے ۱۹۲۲ء میں پہلی بار بعنوان "غالبؔ کا روزنامچہ" شایع کیا۔ مجھے ۱۸۵۷ء کی بے شمار سرکاری اور غیر سرکاری تواریخ میں کہیں غالب کے روزنامچے کا حوالہ نہیں ملا۔

۱۴۔ "فرسنگ" فاصلے کا ایک پیمانہ ہے۔

۱۵۔ یہ سکندر اور اس کی آبِ حیات کی تلاش سے متعلق داستان کی طرف اشارہ ہے۔

۱۶۔ انہی دنوں مصنف نے مارشل لا سے متعلق اپنے مشہور اُردو اشعار نظم کیے:

بسکہ فعّال مایرید ہے آج
ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے
زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے
گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک
تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا (اُردوئے معلّے صفحہ ۳۷۲)

کی پر زور کوشش کی۔ ہندوستان میں تحریکِ اصلاحِ مذہب (ابتداء ۱۸۱۵ء) جس کے بانی رام موہن رائے تھے، دیوندر ناتھ ٹیگور (۱۹۰۵-۱۸۱۷ء) کی راہنمائی میں نئے جوش و خروش (۱۸۴۳ء) کے ساتھ چل رہی تھی جب کہ معاشرتی اصلاح کی تحریک نے ایشور چندر ودیا ساگر (۱۸۹۱-۱۸۲۰ء) کی قیادت میں نمایاں کامیابی حاصل کی، جب ۱۸۵۶ء میں بیوہ کی شادی کا قانون منظور ہوا۔ اس سے سپاہیوں اور قدامت پسند طبقے کی بد اعتمادی بڑھ گئی۔

سیاسی طور پر بھی روشن خیال متوسط طبقے نے ترقی کی راہ دریافت کر لی تھی۔ مثال کے طور پر اُنھوں نے مفصلاتی عدالتوں میں فرنگیوں کے غیر منصفانہ امتیازی حقوق (جنھیں ۱۸۴۵ء کے کالے قانون کہتے تھے) کو ختم کرنے کے لیے رام گوپال گھوش (۱۸۶۸-۱۸۱۵ء) کی سرکردگی میں تحریک چلانا سیکھ لیا تھا۔ اُنھوں نے سیاسی ادارے قائم کیے (۱۸۴۳ء) اور "دی برٹش انڈین ایسوسی ایشن" (۱۸۵۱ء) میں اپنی منظم قوت کو متحد کیا تاکہ "حتی المقدور ہر جائز طریقے سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کی اصلاحات اور اُس کے حسنِ انتظام کو بڑھایا جائے۔"

۱۸۵۳ء میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر کی تجدید ہونے والی تھی، اُنھوں نے ایک عرضداشت میں جو ہریش چندر مکرجی (۶۱-۱۸۲۴ء) نے مرتب کی، مطالبہ کیا کہ دوسری چیزوں کے علاوہ ایک ہندوستانی قانون ساز مجلس کا قیام عمل میں لایا جائے جس میں ہندوستانی اراکین کی اکثریت ہو اور بالآخر سر چارلس وڈ کے ۱۸۴۵ء کے تعلیمی مراسلے اور ۱۸۵۷ء میں کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی تین یونیورسٹیوں کے قیام کے ذریعے اُنھوں نے اپنے تعلیمی مقاصد کی تکمیل اور ترقی کے لیے نئی راہیں پالی تھیں۔

تاریخ میں ہم بہت سی متضاد صورتوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ بعض لوگ اُنھیں تناقضات کا نام دیتے ہیں اور اُنھیں ہم آسانی کے ساتھ سرسری وضاحت سے رد نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے بہتوں کو یہ بات عجیب دکھائی دے گی کہ فوجی غدر (۵۸-۱۸۵۷ء) کے دوران بنگال کے اس روشن خیال طبقے نے اُن عظیم ہنگاموں میں کوئی دل چسپی نہ لی حالاں کہ اُن ہنگاموں سے کم از کم شمالی ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی بنیادیں ہل گئیں۔ یہ حیرت کا مقام ہے کہ ہندوستان کے لوگوں کا سب سے زیادہ روشن خیال طبقہ صدقِ دل سے سپاہیوں کا مخالف تھا حالاں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت ختم ہوتے ہی، بلکہ اس سال کی آخری رات ابھی گزرنے بھی نہ پائی تھی کہ وہی بنگالی روشن خیال طبقہ ۵۹-۱۸۵۸ء میں وسطی بنگال کی بغاوتِ نیل میں بلا تامل کود پڑا۔ یہ اُن کا حبِ وطن کا

گوپال ہلدر

۱۸۵۷ء سے پہلے اور بعد کا بنگالی ادب

بنگالی ادب ۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۱ء تک جس تخلیقی سرگرمی کے درد و کرب میں مبتلا تھا اس کی نظیر اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی۔ یہ تیاری کی منازل طے کر چکا تھا (لگ بھگ ۱۸۰۰ء سے ۱۸۵۶ء تک) اس کی تیاری کے چار دور تھے: فورٹ ولیم دور ۱۸۰۱ء سے ۱۸۱۵ء) رام موہن دور (۱۸۱۵ء-۳۱ء) نوجوان بنگال (ڈروزین) اور سم واد پربھاکر دور (۱۸۳۱ء-۴۳ء) اور آخر میں ودیا ساگر اور تتو بودھنی پتر کا دور (۱۸۴۳ء-۵۶ء)

البتہ اس پیچیدہ اور گوناگوں تحریک کا جسے "بنگلا رجاگرن" کہا گیا ہے، ادبی سرگرمیاں صرف ایک پہلو تھیں۔ کسی قدر وسیع معنی کے اعتبار سے اس تحریک میں بنگالی احیائے علوم، اصلاحِ دین (مذہبی اور سماجی سرگرمیاں) اور بالآخر، سیاسی بیداری شامل تھیں۔ یہ اُن تاثرات کا مرکب تھا جو برطانوی حکمرانوں کے طرز کے شہری متوسط طبقے کے ساتھ بڑھتے ہوئے رابطے سے ہمارے عوام میں پیدا ہوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کا آغاز کلکتے میں ۱۸۱۵ء میں رام موہن رائے ۱۷۷۴ء-۱۸۳۳ کی سرگرمیوں کے ساتھ ہوا اور انیسویں صدی کے نصف آخر میں درجۂ کمال کو پہنچا۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ "بنگلا رجاگرن" کی ابتدا ۱۸۱۷ء میں ہندو کالج کلکتہ کے قیام کے ساتھ ہوئی۔ ہندو کالج کے قیام سے ایک نئی محرک قوت وجود میں آئی یعنی بنگال کا روشن خیال شہری متوسط طبقہ یا تعلیم یافتہ بھدر لوک۔ بھدر لوک یعنی شرفا نے تقریباً سو سال تک بنگال کی زندگی اور اُس کے اندازِ فکر کی تشکیل کی۔ یعنی پہلی عالمگیر جنگ (۱۹۱۴ء-۱۸) تک جن سے قومی اور بین الاقوامی افق پر نئی قوتیں ابھریں۔ چنانچہ کم از کم چالیس سالہ پرانی نوآبادیاتی تحریکِ اصلاح ۱۸۵۷ء کے روشن خیال طبقے کی پشت پر تھی۔ روشن خیالوں کی دو پشتوں نے شہری متوسط طبقے کے آزادانہ نظریات کے زیرِ اثر پرورش پائی تھی۔ انھوں نے ہندوستانی جاگیردارانہ رسم و رواج کے بوجھ کو اتار پھینکنے

(۱۸۲۶-۹۹ء) نے گزشتہ دس بارہ سالوں میں بنگالی نثر کی خاص ترقی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے تین سربرآوردہ شخصیتوں کا ذکر کیا یعنی ایشور چندر ودیا ساگر، تتو بودھنی صحافیوں کے اکشے کمار دت (۱۸۲۰-۸۶ء) اور راجندر لال مترا (۱۸۲۲-۹۱ء) جو ہندیات کے بلند درجہ عالم تھے اور جو ۱۸۵۱ء سے "وودھارتھ سنگرہ" کے مُدیر تھے۔ یہ ایک باتصویر ماہانہ رسالہ تھا جو آثارِ قدیمہ، علمِ حیوانات، صنعت وحرفت اور ادب کے لیے وقف تھا۔

راج نرائن بوس اپنے آپ کو اور مشہور شاعر ٹیگور کے والد دیوندر ناتھ ٹیگور کو انتہائی حسین تخیلی نثر کے اولین لکھنے والوں میں شمار کر سکتے تھے اور کم از کم ایک اور ادیب پیاری چند (۱۸۱۴-۸۳ء) کو بھی جو "ٹیک چند ٹھاکر" کے نام سے پہلا بنگالی ناول بعنوان "الالیر گھر بر دُلال" "ماسک پتر کا" کے صفحات میں اشاعت کے لیے لکھ رہا تھا۔ (۱۸۵۴ء)۔ یہ رسالہ رادھا ناتھ سکدر (۱۸۱۳-۷۰ء) جو ایورسٹ کی دریافت کے سلسلے میں مشہور ہے اور پیاری چند نے مل کر جاری کیا تھا۔

عبوری دور کی شاعری نے (جیسی کہ استاد وطن پرست شاعر ایشور چندر گپت یا گپت کوی (۱۸۱۲-۵۹ء) کرتے تھے) انگریزی پڑھے لکھے طبقے کی خدمات حاصل کر لی تھیں۔ ان میں رنگ لال بندوپادھیائے (۱۸۲۷-۸۷ء) بھی شامل تھا جو مقتدر انگریزی شعرا کا مانا ہوا مداح تھا۔ بنگالی شاعری اب اس باکمال مائیکل مدھوسودن دت (۱۸۲۴-۷۳ء) کی آمد کی منتظر تھی جو ۱۸۵۶ء میں مُدراس سے کلکتہ واپس آیا۔

بنگالی ناٹک اور سٹیج ۱۷۹۵ء میں روسی گیراسم لیبے ڈف کی بدولت جدید فن سے روشناس ہو چکا تھا اور اُس نے ترقی کی راہ دیکھ لی تھی۔ سنسکرت ہی نہیں شیکسپیر کے ناٹکوں کو بھی کسی قدر تصرف کے ساتھ اپنایا جا رہا تھا۔ سماجی اصلاح اور تفریحِ طبع کے لیے جدید بنگالی ناٹک کی ابتدا "کلین کل سرسو" سے ہوئی جو رام نارائن ترک رتن (۱۸۲۲-۸۵ء) نے لکھا اور ۱۸۵۴ء میں شایع ہوا۔ یہ ناٹک پہلی بار مارچ ۱۸۵۷ء میں کلکتہ کے نوتن بازار کے سٹیج پر کھیلا گیا۔ اس وقت جب کہ بارک پور میں سپاہی پہلے ہی سرکشی پر مائل تھے۔ لیکن بنگالی تھیٹر ۱۸۵۶ء میں ہی "عہد سرپرستی" میں وارد ہو چکا تھا جب کالی پرسن سنہا (۱۸۴۰-۷۰ء) کا جوراسنکو ہاؤس سٹیج وجود میں آیا۔ پیک پرا باغ اسٹیج اس کے دو سال بعد (۱۸۵۸ء) قائم ہوا۔

بنگالی ناٹک اور سٹیج نے شہری دولت مندوں، غائب باش زمینداروں اور اعلیٰ طبقوں کی سرپرستی میں بغاوت ہی کے زمانے میں جنم لیا۔ اضطراب اور فتنہ و فساد کی وجہ سے ان کے

جذبہ تھا، یہ ان کی دلیری تھی۔ یہ اس بات کا ناقابلِ تردید ثبوت تھا کہ بنگال کا روشن خیال طبقہ، (جسے کہہ سکتے ہیں کہ اعلیٰ طبقات کے ساتھ وابستہ تھا) مظلوم کسانوں کی بہبودی کی خاطر اپنے تمام تر جوش اور حسنِ تدبیر کے ساتھ لڑ رہا تھا اور سماج کے تمام طبقوں کے راہنماؤں کی حیثیت سے بنگال کی قومی زندگی میں اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا۔

اس لیے ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے دوران بنگال کے روشن خیال طبقے کے طرزِ عمل سے متعلق کسی محدود طبقاتی نظریے نے اُنیسویں صدی کے بنگال کی زندگی اور ادب کے بہت سے طالبعلموں کی تسلی نہ ہوگی۔ بغاوت ۱۸۵۷ء کی ماہیت سے متعلق تاریخ کا آخری فیصلہ خواہ کچھ ہی ہو، بنگال کے عوام اور بنگال کے روشن خیال طبقے کا شعور اُس وقت ہندوستانی لوگوں اور عہدِ مابعد کے ہندوستانی روشن خیالوں کے شعور سے مختلف تھا اور اُن حالات میں یہ اختلاف ناگزیر تھا۔ نہ صرف لکھنؤ کے سابق ڈروزین راجہ دکشنا رنجن مکرجی جیسے آزادی پسند امرا اس بغاوت کے مخالف تھے بلکہ یو پی کے بنگالی کلرکوں نے بھی نعرۂ جہاد پر کان نہ دھرے۔ درگا داس بندوپادھیائے (۱۸۳۵ - ۱۹۲۲ء) کے مشاہدات جو بعد میں "وِدرِوہ بنگال" (ہفتہ وار "ونگواسی" کے صفحات اس کے قوم پرست مُدیر کی ترغیب پر) میں بیان کیے گئے۔ ظاہر ہے کہ یو پی میں بغاوت (یعنی بریلی) اس کو اپنے آقاؤں کے تئیں وفاداری سے منحرف نہ کر سکی۔

اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرنا ہوگا کہ بنگال کے روشن خیال طبقے کی نگاہ میں بغاوت ۱۸۵۷ء کا مطلب کیا تھا، نیز اس کے اسباب کا بھی بخوبی تجزیہ کرنا ضروری ہے۔ اگرچہ روشن خیال طبقے کی جماعتی خصوصیات کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے جس کی خوشحالی کا مدار بڑی حد تک برطانوی حکومت پر تھا۔ جیسا کہ ہمیں معلوم ہے روشن خیال طبقہ اپنے عقیدوں میں راسخ تھا۔ وہ فوجی بغاوت کو محض ایک اتفاقیہ، بے ساختہ جاگیردارانہ اور رجعت پسندانہ مہم تصور کرتا تھا اور اس کی بنا پر اپنے شہری متوسط طبقے کے آزادانہ نظریات سے منحرف نہ ہو سکتا تھا۔

بنگالی ادب اُن جدید خیالات اور اسالیب کو بلا تامل قبول کرنے پر آمادہ تھا جو انگریزی زبان اور ادب کے طفیل تعلیم یافتہ بنگالی پر آشکار ہوئے۔ اب ہم اس جدید بنگالی ادب کا مختصر جائزہ لیتے ہیں۔

۱۸۰۰ء اور ۱۸۵۶ء کے دوران بنگالی نثر علم و دانش کے وسیلے کی حیثیت سے وجود میں آ چکی تھی۔ ۱۸۵۶ء کے "تتو بودھنی پترکا" میں لکھتے ہوئے "بابائے قوم پرستی" راج نرائن بوس

(ہندی و بنگالی) کی اشاعت بغاوت کے دوران بند کردی گئی اور ایک اور اخبار "ہرکارو" پر مقدمہ چلایا گیا۔ باقی پریس اور ادب پر بغاوت دشمنی کا الزام رکھتے وقت ہمیں اس حقیقت پر مناسب توجہ دینا ضروری ہے جو ہم بعد میں کریں گے۔ بہرحال ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادبی اور تمدنی سرگرمیوں کو دبانے میں یہ اقدامات ناکام رہے۔ یہ سرگرمیاں تیزی سے جاری رہیں اور اُن پر بغاوت کا کوئی اثر نہ پڑا۔

اب ہم اس وقت کے ادب سے کچھ نمایاں مثالیں پیش کرتے ہیں۔

"اللیر گھریر دُلال" مصنفہ "ٹیک چند" ۱۸۵۸ء میں شایع ہوئی۔ یہ ایک اخلاقی ناول ہے جس میں تعلیم اور جدید تمدن کی حمایت کی گئی ہے اور معاصرانہ زندگی اور بعض شالی شخصیتوں کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔ اور مسائل سے اس کا کوئی سروکار نہ تھا اگرچہ حبِ وطن کا جذبہ اس وقت (۱۸۵۷-۵۸ء) کے بنگالی ادیبوں کی تصانیف کا اکثر موضوع تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، ایشور گپت نہ صرف عبوری دور کا ایک شاعر تھا بلکہ وطن پرست شاعر بھی۔ وہ اس قدر انتہا پسند تھا کہ اس کی رائے ہیں "غیر ملکیوں کے دیوتا کے بجائے اپنے وطن کے کتے کو عزیز رکھنا بہتر ہے۔"

اس کا کلام ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے علاوہ قحط اور اس قسم کی دوسری آفات کے ضمنی حوالوں سے پُر ہے لیکن باغیوں کی ہیبت ناک دلیری اور مظالم کا ذکر شعروں میں ایہام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ۱۸۵۹ء میں (جب ملکہ کی براہِ راست حکومت شروع ہو چکی تھی) اس نے اپنی موت سے پہلے جو طنزیہ گیت (چٹان) نیل کاروں کے متعلق لکھا تھا وہ لب و لہجہ میں بالکل صاف ہے۔ "ہم بنگالی محض مویشیوں کا ایک گلہ ہیں، اے ماتا ملکہ وکٹوریہ!" بظاہر شاعر طنزاً التجا کرتا ہے "ہم سینگ مارنا بھی نہیں جانتے۔ ہم صرف چارا، گھاس اور بھوسا چاہتے ہیں۔ اپنے گورے افسروں کو اس بات کی اجازت نہ دیں کہ وہ ہمیں اس (چارے وغیرہ) سے محروم کریں۔"

بنگالی شعرا اور ادیب غم و غصہ میں اپنے ہم وطنوں کو اُن کی بزدلی پر لعن طعن کرتے رہے۔ تحریک سودیشی کے زمانے (۱۹۰۵ء) تک بنگالی شاعری میں یہ موضوع تکرار کے ساتھ آتا ہے اور ایک حد تک بنگالی انقلاب پسندوں کی اُس بیباکانہ ہمت کا موجب ہے جس کا وہ اظہار کرتے رہے۔ بہرحال حبِ وطن ۱۸۵۰ء سے پہلے بھی بنگالی ادب کی بنیادی غذا تھا اور ٹاڈ کی تصنیف "اینلز آف راجستھان" (Annals of Rajasthan) نے (جس کا بعد میں ترجمہ کیا گیا) بنگالیوں کے تخیل کو اُسی وقت سے مشتعل کیا تھا۔

یورپی طرز کے جدید ناٹک کے شوق میں کمی نہ آئی۔ یہ ان کے شوق ہی کا نتیجہ تھا کہ ناٹک کی دو باکمال ہستیاں سامنے آئیں، مائیکل مدھوسودن دت اور دینا بندھو مترا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت روشن خیالوں کے کسی طبقے نے باغی سپاہیوں اور اُن کے راہنماؤں کی شجاعت و ہمت کی داد نہیں دی پھر بھی یہ بات قابلِ غور ہے کہ کوئی بھی مصنف، خواہ وہ چھوٹا تھا یا بڑا اور خواہ وہ انگریزی سرکار کے نمک خوار طبقۂ امراء سے تعلق رکھتا تھا، اس بات کو نہ بھولا کہ حبِ وطن ایک اچھا وصف ہے اور سبھی نے بھارت ماتا کی خستہ حالی اور غیروں کے ہاتھوں اُس کی غلامی کا رونا رویا ہے اور اپنے قارئین کو اتحاد، ہمت اور آزادی حاصل کرنے کی تلقین کی ہے۔

جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے، وہ کرتے یہ تھے کہ تاریخ ہند کے برطانیہ سے پہلے کے دور کا کوئی موضوع لے لیتے اور یونوں کی مذمت کی جاتی (تحقیق لغات کی رو سے یون، یونانی تھے لیکن اس ضمن میں بظاہر اُن سے مرادِ مسلم حملہ آور بھی تھے اور کنایہ کے طور پر برطانوی حکمرانوں کی طرف بھی اشارہ تھا) یا پُرانوں اور قدیم گرنتھوں سے کوئی کتھا کہانی لے کر ایسی مثال پیش کی جاتی جس میں فاتح مفتوح اور ظالم مظلوم ہو کے رہ گیا ہو۔

یہ بات بھی محلِ غور ہے کہ اس وقت علمی کاوشیں زیادہ تر انگریزی زبان میں ہوتی تھیں، بالخصوص عوامی زندگی کے مسائل پر بحث و مباحثہ زیادہ تر انگریزی ہی میں ہوتا تھا اگرچہ "سم واد پربھاکر" (۱۸۳۱ء مگر ۱۸۳۹ء سے روزانہ) اور "سوم پرکاش" (۱۸۵۸ء) کے طفیل بنگالی صحافت (آغاز قریب ۱۸۲۰ء) کافی ترقی کر چکی تھی۔

"دی ہندو پیٹریٹ" (۱۸۵۴ء) کے ہریش چندر مکرجی ایک قابل آدمی اور انگریزی زبان کا پرزور انشا پرداز تھا جو بغاوت کے دوران حاکم اور محکوم دونوں (بالخصوص لارڈ کیننگ) کی نگاہ میں یکساں طور پر قابلِ اعتنا تھا۔ ہریش چندر نے ایک طرف باغی سپاہیوں کو گمراہ اور توہم پرست قرار دیا اور دوسری طرف بغاوت کو فرو کرنے میں اعتدال سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ نیل کاروں کی مذمت میں اُس کی تحریروں اور تقریروں سے آگ برستی تھی اور ۱۸۶۱ء میں اپنی قبل از وقت موت سے پہلے متواتر تین سال تک بنگالی کاشتکاروں کے اُس بے غرض علمبردار نے وقت اور روپیہ صرف کرنے میں کوئی دریغ نہ کیا اور ایک قومی شخصیت بن گیا اگرچہ نیل کاروں کے ہاتھوں مقدمہ بازی میں تباہ و برباد ہو گیا۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس وقت پریس (انگریزی تھا یا بنگالی) ادب دوستوں کی نئی پود کا گہوارہ تھا۔ دو زبانوں میں شایع ہونے والے اخبارات میں سے ایک، "سماچار سدھا درشن"

بیلگاچیا اسٹیج کے سرپرستوں نے مائیکل مدھوسودن دت کی خدمات ڈراما "رتناولی" کے
انگریزی ترجمے کے لیے حاصل کیں جسے وہ اسٹیج کر رہے تھے (جولائی ۱۸۵۸ء) اس کے بعد مدھوسودن
اُن کے لیے بنگالی زبان میں طبعزاد ڈرامے لکھنے لگا۔ اس طرح مدھوسودن نے بنگالی ادب کی طرف
رجوع کیا۔ پھر کیا تھا، ناٹک، سوانگ، رزمیہ اور عشقیہ نظموں کا تانتا بندھ گیا جو پوری رنگینی اور آب و تاب
کے ساتھ بیک وقت سُرعت کے ساتھ شایع ہونے لگیں۔ "سرمشٹھا" سب سے پہلے لکھا گیا (جنوری ۱۸۵۹ء)
اور اسٹیج پر اس کی نمایش ہوئی (ستمبر ۱۸۵۹ء) اُس وقت جب کہ پہلی آزاد نظم "تلوتم سمبھو کویہ حصہ اول"
حیرت زدہ قارئین کی خدمت میں لکھ کر پیش کی جا رہی تھی (جولائی، اگست ۱۸۵۹ء) "وودھ ارتھ سنگرہ"
مصنفہ راجندر لال مترا کے صفحات میں) المیہ "پدماوتی" (۱۸۶۰ء) اس وقت تصنیف ہوا جب "میگھنادودھ
کویہ" (۱۸۶۱ء) "برجانگنا کویہ" (۱۸۶۰-۶۱ء) اور "ویرانگنا کویہ" (۱۸۶۲ء) نے دنیا میں
تہلکہ مچا دیا۔ نشاۃ ثانیہ کی مثالی ذہنیت
شاعر قدیم زمانے کے پُرشوکت خیالات کے نشے سے سرشار تھا۔
کے ساتھ مدھوسودن نے دو معاشرتی مزاحیہ ناٹک بھی لکھے۔ ۱۸۶۱ء میں "ایکی کی بالے سبھیتا" (کیا
یہ تہذیب ہے؟) میں اس نے اپنے ہمخیال انگریزی تعلیم یافتہ بنگالیوں کی بداخلاقی اور بدمستی کی
ملامت کی۔ "بروسا لیکیر گھرے روم" ۱۸۶۰ء میں بنگال کے قدامت پسند بزرگوں کی اوباشی اور
عیاری پر اتنے ہی لگتے ہوئے طنز کیے گئے۔
اُس کی کسی تصنیف میں کوئی سیاسی پہلو نکالنا ممکن نہیں۔ عظیم رزمیہ "میگھنادودھ کویہ"
(۱۸۶۱ء) کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک باغی یا حملے کے شکار حکمران (راون اور اس کا بہادر بیٹا)
کو ہیرو کا درجہ دیا گیا لیکن اس میں بھی اوّلاً جاگیرداری کے خلاف مدھوسودن کی اپنی بغاوت کا اظہار تھا یعنی
ہندومت کے تسلیم شدہ دیوتاؤں اور قوانین کے خلاف۔ اور دوسرے ملٹن کے اثر کا اظہار تھا جس نے
ناد انستہ طور پر شیطان (پیراڈائز لاسٹ Paradise Lost) کو ایک شکست خوردہ گراہم لین
ہیرو بنا دیا۔
لیکن مدھوسودن کی اپنی عقابی پرواز قلیل عرصے کی تھی (۱۸۵۹-۶۲ء)۔ ۱۸۶۲ء کے بعد اُس
نے چتردس پدی کوتالی یعنی سانیٹ (۱۸۶۶ء) کے علاوہ کچھ نہیں لکھا۔ اِن سانیٹ میں اس نے بڑے
غمگین لہجے میں اپنی امیدوں، ناامیدیوں اور اپنے یقین کا ذکر کیا ہے۔
مدھوسودن خود دلیر تھا اور اُسے ضرور خفت محسوس ہوئی ہوگی جب اس نے دیکھا ہوگا کہ پادری

ادب میں اس حبِ وطن کی نئی صورت ۱۸۵۸ء میں طویل رزمیہ نظم " پدمنی اپاکھیان" میں ظاہر ہوئی۔ شاعر رنگ لال بندوپادھیائے بائرن، مور اور سکاٹ کا پکا مداح تھا۔ اس رزمیہ میں کوئی شعریت نہیں ہے لیکن اس کے ہیرو بھیم سنگھ نے چتوڑ کے کشتیریوں کو جس طرح خطاب کیا اس پر شاعر صدق دل سے چیخ اٹھا۔

"کون ہے جو غلام بن کے رہنے پر رضامند ہے ؟ کون اس طرح رہنے پر آمادہ ہے ؟
کون بیڑیاں پہننا چاہتا ہے ؟ آہ! بیڑیاں پہننا!"

ان ناٹکوں میں جو جوراسانکو یا بیلگاچیا باغ میں کھیلے جا رہے تھے، بغاوت ۱۸۵۷ء کے واقعات کا کوئی براہ راست یا بالواسطہ معاصرانہ حوالہ نہیں ہے۔ کالی پرسن سنہا کے " وکرم اروشی" (۱۸۵۷ء میں سٹیج ہوا) "ساوتری ستیہ وان"، (۱۸۵۸ء میں اسٹیج ہوا جب "کلین کل سرسو" بھی اسٹیج پر کھیلا گیا) اور رام نارائن کے "رتناولی" (بیلگاچیا باغ میں ۳۱ جولائی ۱۸۵۸ء کو سٹیج پر کھیلا گیا) میں اس کا کوئی نشان نہیں ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ نثر اور نظم دونوں میں " نیل ودروہ" سے متعلق سیدھے اشاروں کی جھلکیاں موجود تھیں۔ ۱۸۵۹ء کے بعد اس بغاوت نے بحران کی صورت اختیار کر لی۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کو دبا دیا گیا۔ بغاوت کے بعد کے ادب میں بنگالی ادب نے اپنے تخلیقی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیزی سے ترقی کی۔ ابھی اُسے اس واقعے پر مڑکر نگاہ ڈالنے کی فرصت نہیں تھی۔

روشن خیال طبقے کے انسان دوستی اور حب وطن کے تمام ترجذبات نے نیل ودروہ میں اظہار کی راہ پائی۔ اس کے علاوہ یہ انقلاب نہ تھا بلکہ ایک بغاوت جس کے لیے وہ تیار نہ تھے۔ ودیا ساگر کے زمانے کے لوگوں کے لیے انسانیت کوئی بے معنی لفظ نہیں تھا۔ یورپی نیلکاروں نے جن کی پشت پر برطانوی سرکار تھی، ہریش چندر مکرجی کے سے انسانوں کو برباد کیا اور پادری جے۔ لانگ جیسے مبلغ کو قید کروایا (کیوں کہ اس نے ناٹک "نیل درپن" کا انگریزی نسخہ شایع کیا جیسا کہ ہم بعد میں ذکر کریں گے) لیکن بغاوتِ نیل بھی اس جوش و خروش کو جذب نہ کر سکی جو پیدا ہو چکا تھا۔ اب ہم ۶۲-۱۸۵۹ء کے بنگالی ادب کے ممتاز شاہکاروں کا ذکر کرتے ہیں جب نوجوان کیشب چندر سین (۸۴-۱۸۳۸ء) کی زیر سرکردگی اصلاحی تحریک کے ساتھ ساتھ ادبی نشاۃ ثانیہ بار آور ہوئی۔

طبقوں میں "غدر" کی کامل مذمت بھی ترک ہوتی جا رہی تھی۔ "امرت بازار پتریکا" اس کی ایک مثال تھی (۱۸۶۸ء)۔ جب بنکم چندر چٹوپادھیائے (۱۸۳۸-۹۴ء) ۱۸۶۵ء میں "درگیش نندنی" (۱۸۶۵ء) کی اشاعت کے ساتھ ادب کے افق پر نمودار ہوئے تو ہمارے ادب میں قوم پرستی کا رنگ غالب آ رہا تھا۔ اگر ہم بھودیو چندر مکھوپادھیائے کی طویل داستان "انگوری بنی ے" کو نہ شمار کریں تو "درگیش نندنی" بنگالی زبان میں پہلا تاریخی رومان تھا۔

اب تخلیقی خود اعتمادی کے اعتبار سے زیادہ اطمینان کا دور شروع ہوا۔ ۱۸۷۲ء (قومی میلہ اور پہلے پبلک اسٹیج کے قیام کا سال) میں "ونگ درشن" کے سنگِ بنیاد رکھے جانے پر بنکم نے بنگالی قوم پرستی کے فلسفہ کی ترتیب کا کام سنبھالا۔ اب (۱۸۶۸ء کے لگ بھگ) لفظ "قوم" کی قیمت اور وقعت بڑھ گئی تھی۔ اور نب گوپال مترا جو تحریک جاتیہ میلہ (۱۸۶۷ء) کی روحِ رواں تھا نب گوپال "قومی" کہلاتا تھا۔ برہمو آزاد خیالی اور شری کیشب چندر سین اور اس کے ساتھیوں کی اصلاحی تحریک بظاہر ابھی زندوں پر تھی لیکن تنقیدی قدامت پسندی (بنکم کی راہنمائی میں) قومی افتخار اور قومی تمدن کی بنا پر منظم ہو رہی تھی جس میں مغرب کی عقلیت پرستی اور سائنس کی نئی روح پھونکی گئی (اور ان کی نگاہ میں "قومی" کا مطلب "ہندو" تھا جیسا کہ "ہندو میلہ" سے ظاہر تھا) برطانوی حکومت بھی اُس وقت ہندوستان میں اپنے شہنشاہیت پرستی کے رنگ میں ظاہر ہو رہی تھی اور اُس کی ترقی پسندانہ روش پر یقین روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا۔ لارڈ لٹن کی تشدد کی پالیسی (۱۸۷۶-۸۰ء) نے ہندوستانیوں کی آنکھیں کھولنے میں اور بھی مدد دی۔

آزاد خیالوں نے ایک نیا سیاسی ادارہ قائم کیا (جس کا نام انڈین ایسوسی ایشن تھا ۱۸۷۵ء) سریندر ناتھ بنرجی نے سارے شمالی ہندوستان میں مہمیں منظم کیں (۱۸۷۷-۷۸ء) ۱۸۶۵ء اور ۱۸۸۵ء کے دوران (۱۸۸۲ء بنکم کے "آنند مٹھ" کی اشاعت اور سیاسی نقطہ نظر سے البرٹ بل شورش کا سال تھا) ادب پورے شباب پر تھا۔

شعرا، ناول نگار اور انشا پرداز سب ہی ترقی کر رہے تھے۔ اپنی بساط کے مطابق انھوں نے مقابلے کی ٹھان لی۔ یہ تعداد میں بیسیوں تھے اور تقریباً سبھی نے برطانوی دور سے پہلے کے تاریخی ماخذوں یا ہندو پُرانک گرنتھوں سے ایسے موضوع چنے جن میں حملہ اور اس کا مقابلہ کرنے والوں یا ظالم اور مظلوم کا مقابلہ تھا اور پھر ہندوستان پر غیر ملکی غلبے کے

ہے۔ لانگ کو "نیل درپن" کا انگریزی ترجمہ شایع کرنے کی وجہ سے جرمانے اور قید کی سزا دی گئی ہے۔ "نیل درپن" مدھوسودن سے لکھوایا گیا تھا جو اُس کے نام کے بجائے "ایک ویش واسی" کے نام سے شایع ہوا تھا۔

یاد رکھنا ہوگا کہ اس عہد آفرین ڈرامے "نیل درپن" کے اصل کو بھی پہلے ۱۸۶۰ء میں ڈھاکے سے گمنام شایع کرنا پڑا۔ ڈراما نگار دینا بندھو مترا کو خود اپنے کو کینچت پتھی کین یعنی "راہ گیر" کا نام دینا پڑا۔ لانگ کے مقدمے سے بخوبی ظاہر ہے کہ حریت پسند روشن خیال طبقے کو بغاوت ۱۸۵۷ء تو درکنار، نیل کے جھگڑے کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کی آزادی حاصل نہ تھی اس لیے یہ قرینِ قیاس ہے کہ اگر کسی ہمعصر مصنف کو باغی سپاہیوں کے ساتھ کوئی ہمدردی تھی تو وہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال کر ہی ہمدردی ظاہر کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے اُسے طنزیہ اشاروں سے کام لینا پڑا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں یعنی ۱۸۶۶-۶۹ء کے دوران ایسے ایک دو محتاط اشاروں کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے بعض اشارے "امرت بازار پترکا" (بنگالی) کے سسیر کمار گھوش کے ابتدائی تبصروں (۱۸۶۹ء) میں موجود ہیں۔ موصوف نے ۱۸۵۷ء کی لڑائیوں کو اکثر آزادی کی جنگوں کا نام دیا، مثلاً ۲۸ مئی ۱۸۶۹ء) ان لڑائیوں کے لیے (۳ مارچ ۱۸۷۰ء کو) "غدر" کا لفظ استعمال کرنے پر اعتراض کیا اور اس بات کی تائید کی کہ ۱۸۵۷-۵۸ء کی جنگ اتحاد نہ ہونے کی وجہ سے ناکام ہوئی۔ نوآبادیوں میں ملکی صنعت و حرفت کی تباہی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کی وجہ سے لوگ مایوس ہو کر جان دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ "سپاہیوں کا غدر" جسے ہم پسند نہیں کرتے اس کی مثال ہے۔

ایک اور دلچسپ حوالہ "ہتم پینچر نقش" (۱۸۶۲-۶۴ء) یعنی ہتم اُلو کے خاکے" میں ملتا ہے ہتم سے مراد وہی نوجوان انتہا پسند کالی پرسن سنہا تھا جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اُس نے بغاوت کے خاتمے پر ملکہ وکٹوریہ کے تئیں وفاداری کا اعلان کرنے کے لیے گوپال ملک کے باغ میں راجہ رادھا کانت دیو کی قیادت میں ہندوستانیوں کے اجتماع کا ذکر کیا۔ ہتم کے ناقابلِ تقلید انداز میں ان کے منہ سے کہلوایا گیا: "ماتا! ہم تیری بنگالی بھیڑیں ہیں۔ ہم اہلِ امریکہ کا پارٹ ادا کرنے کی خواہش نہیں رکھتے" یعنی بغاوت اور آزاد ہونے کی خواہش نہیں رکھتے۔

البتہ اس میں شبہ ہے کہ جب بغاوت رونما ہوئی تو کوئی بنگالی (اس کا درجہ اور تعلیم کچھ بھی ہو) ۱۸۵۷ء کے باغیوں کے ساتھ خاص ہمدردی رکھتا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ تعلیم یافتہ

کلیہ کے طور پر یہ کہنا بے جا ہوگا کہ بنگالی ادیب اس بعد کے زمانے میں بھی صریحاً بغاوت ۱۸۵۷ء
کی حمایت یا مذمت کرتے رہے۔ نوآبادیاتی متوسط طبقات اور اُن کے ادیبوں اور مفکروں کی ذہنیت میں
طبعی تضاد پایا جاتا تھا۔ مثلاً جو لوگ جاگیرداری کے سخت مخالف تھے، وہ شہنشاہیت پرستی کے کسی قدر کم
مخالف تھے اور جو لوگ قطعاً شہنشاہیت پرستی کے مخالف تھے وہ بعض اوقات قوم پرستی کے جذبۂ بال
کے سبب جاگیردارانہ نظریات اور رسوم و آداب کی حمایت کرتے تھے۔ چند آزاد خیال دونوں میں توازن
قائم کرنا چاہتے تھے۔ البتہ ہمارے تمام ہندو یا برہمو ادیبوں میں جمہوری رنگ پھیکا رہا۔

ایک تیسری حقیقت یہ ہے کہ معاصرین کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے ساتھ بعد میں بھی کوئی لگاؤ
پیدا نہ ہوا۔ پنڈت شوناتھ شاستری نے رام تانو لاہری اور اس کے عہد کے حالات کے تذکرے (۱۹۰۴ء)
میں اسے متوازن پیرائے میں بیان کیا ہے۔ لیکن اس نے اپنی آپ بیتی (۱۹۱۸ء) میں اس بحث سے
مصلحتاً احتراز کیا ہے۔ راج نارائن بوس نے ۱۸۸۸ء میں اپنی آپ بیتی کا تذکرہ لکھتے ہوئے سپاہیوں
سے متعلق بنگالیوں کے خوف اور شک کی تصویر کھینچی ہے جس سے ظاہر ہے کہ وہ بنگالیوں کی نگاہ میں کس قدر
بیگانے تھے۔ دیوندر ناتھ ٹیگور نے اپنی آپ بیتی (مرتبہ ۱۸۹۵ء) میں جو ۱۸۹۸ء میں شایع ہوئی، بڑی
احتیاط کے ساتھ سیاسیات سے اجتناب کیا۔ اس نے شملہ کی پہاڑیوں میں بغاوت کا آنکھوں دیکھا حال بیان
کیا۔ اس نے دیکھا کہ دہشت اور خوف سے فرنگی ہر طرف بدحواس تھے "غدر" سے کم از کم یہ حقیقت
ثابت ہو گئی کہ تمام فرنگی سورما نہیں تھے جو حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہوں اور بغاوت کو جس طریقے
سے فرو کیا گیا کہ اس سے ظاہر ہو گیا کہ برطانوی حکمراں طبقے سے دانش مندی اور انصاف پروری کی توقع
نہیں کی جا سکتی تھی۔ انیسویں صدی کے آخری بیس سالوں میں ادب میں اس احساس کا اظہار بڑھتا گیا۔

خلاف اپنے خیالات اور جذبات پیش کیے۔ ادب تو قوم پرستی اور آزادی کا طرفدار تھا بعض وقات پردے کے پیچھے سے یہ حقیقت جھلکتی تھی جیسا کہ بنکم کے "آنند مٹھ" اور ہیم چندر بندوپادھیائے (۱۸۳۸ء ۱۹۰۳ء) کے نعرۂ آزادی "بھارت سنگیت" (۱۸۷۰ء) میں ہوا۔ نابن چندر سین کی "پلاسیر یدھ" (۱۸۷۵ء) میں موہن لال کا بھی ایسا ہی نعرہ لیکن دفتری حکومت کی نگاہِ غضب سے بچ گیا۔

۱۸۵۷ء کی بغاوت کو اب رانی لکشمی بائی، کنور سنگھ اور تانتیا ٹوپے وغیرہ جیسے رہنماؤں کی قیادت میں بہادر جواں مردوں کی قوم پرستانہ جد و جہد تصور کیا جاتا تھا۔ البتہ اس بغاوت کو بے سود قرار دیا گیا اور یہ بھی خیال تھا کہ اس میں ہندوستانی والیانِ ریاست اور برطانوی ملازمت میں بھاڑے کے آدمیوں نے غداری کی۔ رجنی کانت گپت کی یادگار تصنیف "سپاہی یدھیر اتہاس" (سپاہیوں کی جنگ کی تاریخ) کی پہلی جلد ۱۸۷۶ء میں شایع ہوئی۔ یہ یقیناً برطانوی ماخذوں تک محدود تھی اور خیالات کے اظہار میں احتیاط رکھی گئی تھی لیکن "اتہاس" کا مقصد بلاشبہ واضح ہے۔ ہندو قوم پرستی ایک نئی قوت تھی اور اس کی نگاہ میں ۱۸۵۷ء کے سپاہیوں کا مذہبی خوف اور تعصب مضرت رساں اور ناگوار نہ تھا جیسا کہ ہم عصر ہندو اور برہمو آزاد خیالوں (۱۸۵۷-۶۱ء) کی نظر میں تھا۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے جو اس وقت سترہ سال کے نوجوان تھے "بھارتی" کے صفحات میں (۱۸۷۸ء) فوجی غدر کے سورماؤں کو کھلم کھلا خراجِ تحسین ادا کیا اگرچہ ان کی کوششیں بے سود ثابت ہوئیں۔ انھوں نے بالخصوص رانی لکشمی، تانتیا ٹوپے اور پیرِ ضعیف کنور سنگھ کو شجاعت اور حب الوطنی کے پتلے اور قومی ہیرو قرار دیا جب کہ برطانوی مورخین نے انھیں روسیاہ اور رسوا کرنے کی بڑی کوشش کی۔ البتہ وہ ہندویت پرست نہ تھا۔ ۱۸۹۸ء میں رابندر ناتھ نے اپنے افسانے "دراشا" میں کمال استادی کے ساتھ ایک باغی سورما کی تصویر پیش کر کے ہندویت پرستی کے ڈھول کا پول کھولنے کی کوشش کی۔ دیوندر ناتھ کے بیٹے اور راج نارائن کے مداح کے لیے بغاوت احیائے مذہب کے اعتبار سے کسی تقدس کی حامل نہ تھی۔

چنانچہ خیالات (۱۸۶۴-۸۵ء) کی فضا میں تدریجی تبدیلی ہمیں تسلیم کرنی چاہیے، نیز ہمیں ان نفسیاتی اور جمالیاتی پیچیدگیوں اور تدبیروں کو سمجھنا چاہیے جو فنی تخلیق کے عمل کے دوران شعوری اور غیر شعوری طور پر سماج کے ڈھانچے میں انقلاب پیدا کرتی ہیں۔ یہ قیاس کرنا جائز ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے بنکم چندر کی تصنیف "آنند مٹھ" (۱۸۸۲ء) پر اثر ڈالا ہو گا جس کا موضوع بظاہر ۱۷۷۸-۷۹ء کی سنیاسی بغاوت تھا۔ "ویر باہو ودھ کاویہ" (۱۸۶۴ء) اور "ورتر سنہار کاویہ" (۱۸۷۵-۷۷ء) "بھارت سنگیت" (۱۸۷۰ء) اور ہیم چندر کی دوسری نظموں میں یہ ... طور سے ظاہر تھا۔

کرنے کے لیے روایتی لوک گیتوں کا پرچار کیا بلکہ عوام میں انگریزوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اس قدر جوش کے ساتھ اُبھر رہا تھا کہ ۱۸۵۷ء سے متعلق لوک گیتوں کی بھرمار ہو گئی۔ یہ لوک گیت گمنام مگر ذہین عوامی شعرا نے مرتب کیے تھے۔ یہ گیت خالص لوک گیت ہیں کیوں کہ بے ساختہ کہے گئے ہیں بغاوت (۱۸۵۷ء) کو بے دردی کے ساتھ دبا دیا گیا۔ اس کے بعد لگ بھگ سو سال تک برطانوی حکومت کا دہشتناک دور رہا۔ اس دور میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر کوئی گیت لکھنا یا گانا اپنے آپ کو جیل خانے میں ڈالنا یا اس سے بھی زیادہ مصیبت میں گرفتار کرنا تھا۔ باوجود اس کے جدید دور کے کسی بھی قومی واقعے کے مقابلے میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر زیادہ لوک گیت موجود ہیں۔ اس مقالے میں میں بعض گیتوں کا ترجمہ پیش کر رہا ہوں تاکہ اس زمانے میں رہنے والے لوگوں کے سیاسی نظریے کی وضاحت ہو سکے اور یہ بھی بتایا جا سکے کہ ان میں سب سے زیادہ حساس یعنی عوامی شعرا بغاوت کے واقعات سے کیسے متاثر ہوئے۔

اس قومی بغاوت کے آغاز کو اُن دلوں کے نفسیاتی ماحول کے ساتھ مذکورہ ذیل گیت[۱] میں بیان کیا گیا ہے:

"یہ سن چودہ کا واقعہ ہے۔ میرٹھ میں یکایک اس کا آغاز ہوا

بادل[۲]، کاراپٹ[۳] کی پریذیڈنسیوں اور بنگال کے وسیع علاقوں میں پھیل گئی

لیکن فرنگی[۴] کو جو سر پر منڈلانے والی آفت سے پریشان تھا ایک ناپاک تدبیر سوجھی

کیوں کہ بھیانک کالی[۵] دیوی ولایت[۶] کا بیڑا غرق کرنے والی تھی

نئے کارتوسوں میں گائے اور سؤر کی چربی لگی ہوئی تھی

اور ہندوستانی فوجی[۷] رنجیدہ ہو کر بغاوت میں کار بائن داغ رہا تھا

دھول رام کہتا ہے: سال چودہ میں انگریز کلکتے سے چپکے سے کھسک گیا۔"

احواشی لوک گیت: ابرار ۱۸۵۷ء۔ ۲۔ بادل: بمبئی۔ ۳۔ کاراپٹ: مدراس۔ ۴۔ فرنگی: گورا یورپی۔ ۵۔ کالی: تباہی کی دیوی۔ ۶۔ ولایت: انگلینڈ، سپاہی: ہندوستانی فوجی ۸۔ دھول رام، اس لوک گیت کا مصنف)

فرنگی کا سابقہ خوف جاتا رہا کیوں کہ وہ سر پر منڈلانے والی نئی مصیبت سے پریشان تھا۔ تباہی کی دیوی یعنی کالی نے ولایت کو غرق کرنے کا فیصلہ کر لیا کیوں کہ فرنگی نے ان کارتوسوں میں جو ہندو اور مسلمان فوجیوں کے استعمال کے لیے مخصوص تھے خفیہ طور پر گائے اور خنزیر کی ناپاک چربی استعمال کی تھی۔ اور یہ جو انگریز کے کلکتے سے چھپ کر نکلنے کی تصویر کھینچی گئی ہے وہ محض خیال کی پرواز نہیں ہے۔

پی۔ سی۔ جوشی

۱۸۵۷ء سے متعلق لوک گیت

ہندوستان میں دیہاتی راگ رنگ عوام کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے روایتی ذرائع تھے۔ اس کی شہادت موجود ہے کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو منظم کرنے والوں نے لوگوں کو بیدار کرنے کی غرض سے کمال استادی کے ساتھ اور موثر انداز میں ان سے کام لیا۔ ٹریویلین کا بیان ہے کہ "تیوہاروں اور تماشوں میں جن گڑیوں سے تھیٹر میں کام لیا جاتا وہ عجیب زبان میں بولنے لگتیں اور خطرناک ناچ دکھانے لگتیں۔ پنواڑے اور لاونیاں (لوک گیت کی طرز جو رقت اور لطیف جذبات پیدا کرتی ہے) تھانوں کے قریب گائی جاتیں۔ آلہا اودل (رزمیہ گیت جو خون کو جوش میں لاتا ہے) سے بھی کام لیا جاتا۔ کلکتے سے پنجاب تک رات کو خطرناک تماشے دکھائے جاتے۔ خانہ بدوش عورتوں کو بھی کام میں لایا جاتا۔ نفرت پیدا کرنے میں ان کا بلا کا اثر تھا۔ بہشتیوں نے پانی مہیا کرنے سے انکار کر دیا۔ مامائیں ملازمت چھوڑ کر چلی گئیں۔" آگے بھی لکھتا ہے: "دو موضوع ایسے تھے جن کو پیش کرنے میں کٹھ پتلی والوں کو انتہائی مسرت ہوتی تھی۔ ایک تھا مغلوں کا زوال اور دوسرا تھا انگریزوں پر فرانسیسیوں کی فتوحات۔ ایک کا مقصد تماشائیوں کے دلوں میں نفرت پیدا کرنا تھا اور دوسرے کا حقارت"[۲]

(نوٹ مصنف: میں درج ذیل حضرات کا تہ دل سے ممنون ہوں جنھوں نے اس مقالے میں شامل لوک گیتوں کے جمع کرنے اور ان کی جانچ پڑتال کرنے میں مجھے مدد دی:۔
شری ورنداون لال ورما (جھانسی)، ڈاکٹر اودے نارائن تیواڑی (الٰہ آباد یونیورسٹی)، ڈاکٹر کے ایس اپادھیائے (بنارس)، شری گنیش چوبے، مہاراج کمار درگا شنکر پرشاد سنگھ (تمل ہنمرس)، اور شریمتی مہاشویتا بھٹاچاریہ (کلکتہ)۔ میں شری شمشیر بہادر سنگھ، اونکار ناتھ کچرو، دائی، لول پوری اور سنیل جنا کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ان لوک گیتوں کا ترجمہ کر کے میری امداد کی۔ پی۔ سی۔ جے۔)

* صرف اس بغاوت کو منظم کرنے والے اعلیٰ طبقے نے ادنیٰ درجہ کے لوگوں میں انقلاب کا پرچار

دیکھو، آہا، دیکھو۔"

میرٹھ اور دہلی کے گردو نواح کے تمام علاقوں کے کسانوں کی بڑے پیمانے پر بغاوت میں شرکت سے بغاوت نے عوامی رنگ اختیار کر لیا تھا۔ علی گڑھ میں امانی سنگھ ہیرو تھا جو عام کسانوں کے طبقے سے اٹھا تھا۔ ان چند سطور سے جو امانی سے متعلق ہیں اُن دنوں کے مقامی باغی راہنماؤں کا دم خم ظاہر ہوتا ہے:

"امانی ؟ ہاں، یہی میرا نام ہے
تف، اگر میں گنگا جل نہیں پیتا"

دریائے گنگا کا پانی پینے سے مُراد گنگا کے کنارے کا سارا علاقہ آزاد کرانے اور اس کا پوتر جل پی کر فتح منانے کا عزم تھا

ہندوستان کے دوسرے حصّوں کی طرح اس خطّے میں بھی بھابھی اور دیور کا رشتہ گہری دوستی اور گستاخی کی اجازت کا ناتا ہے۔ باغی سپاہیوں سے متعلق ایک قدیم روایتی گیت ہے جو عورتیں گاتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ کس طرح خواتین موت کو للکارنے والے جوانمردوں کی بہادری پر فخر کرتی تھیں گویا وہ اُن کے اپنے ہی ہیں:

"فوج نے قلعے پر حملہ کر دیا ہے
میرا دیور بھنبھناتی گولیوں کا سامنا کر رہا ہے
میرے پیارے نے ایک فرنگی کو ہلاک کر دیا ہے
میرے دیور نے دو فرنگیوں کو پکڑ کر کوٹھری میں ڈال دیا
میں نے اس کو ملامت کی اور وہ غصّے سے لال پیلا ہو گیا
وہاں دوسری طرف حکم صادر کیا گیا
اور فرنگی فوجیں
تیار ہو گئیں اور قلعے پر دھاوا بول دیا
لیکن دیکھو، میرا دیور
اب بھی بے خطر
ان سے لڑ رہا ہے گویا ایک کھیل ہے
او پیاری سکھی!

کے اور مایسن نے بھی "غدر" کا حال بیان کرنے میں اس دہشت کا ذکر کیا ہے جو کلکتے کے گورے باشندوں پر طاری تھی۔

ذیل کا چھوٹا سا گیت جو حسنِ بیان کا مرقع ہے اُن دنوں کے انقلابی جوش کا تصور پیش کرتا ہے۔

"دریا میں تلاطم بپا ہے
انگلستان بہت دور ہے
جلدی کر جلدی، اے
دغا باز فرنگی! بھاگ جا"

قومی بغاوت میرٹھ میں شروع ہوئی۔ جب میرٹھ میں بغاوت پھوٹی اور انگریزوں کو خوب پیٹا گیا تو اس کی ایک دل آویز تصویر اس گیت میں کھینچی گئی جو میرٹھ سے متعلق تھا؟ اس میں خود اعتمادی کی سپرٹ نمایاں ہے

"آہا! آؤ اور دیکھو
میرٹھ کے بازار میں
فرنگی کو گھیر کر مارا گیا ہے
گورے کو گھیر کر پیٹا گیا ہے
میرٹھ کے کھلے بازار میں
دیکھو! آہا: دیکھو اُسے کس طرح پیٹا جا رہا ہے،
اس کی بندوق چھین لی گئی ہے
اس کا گھوڑا مرا پڑا ہے
اس کا ریوالور ٹوٹ پھوٹ گیا ہے
میرٹھ میں سرِ بازار
اسے گھیر کر پیٹا جاتا ہے
دیکھو، آہا، دیکھو
فرنگی کو گھیر کر پیٹا جاتا ہے
میرٹھ میں سرِ بازار

کا نمائندہ تھا۔ بد اطوار، مسرف اور نا اہل۔ پھر بھی لوگوں کو اس کے ساتھ ہمدردی تھی کیوں کہ قومی حکومت اسی کی ذات کے ساتھ وابستہ تھی۔ اپنی قوم کے حکمراں کو بلا لحاظِ استحقاق غیر ملکی حکومت پر ترجیح دی جاتی ہے۔ دوسرے، اودھ کے وطن کو "ملک" کہا جاتا ہے۔ مشترکہ مادرِ وطن کی حیثیت سے ہندوستان کا تصور ابھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ ان کی نگاہ میں ان کا اپنا وطن (اودھ) ہی ان کا اپنا ملک ہے۔ تیسرے، یہ حقیقت ظاہر ہے کہ دوسرے ملکوں پر قبضہ جمانے کے لیے انگریز صرف اپنی قوت پر انحصار رکھتے ہیں۔ چوتھے، غیر ملکی حملے کی مزاحمت نہ کرنے اور کسی کے ہتھیار نہ اٹھانے پر شدید درد و کرب کا اظہار کیا گیا۔ کھوئی ہوئی آزادی پر قومی توہین کے شدید احساس نے اودھ کو ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا گڑھ بنا دیا۔

مذکورۂ ذیل سطور میں ان واقعات کا بیان ہے جو لکھنؤ میں رونما ہوئے۔ یہ سطور ایک گیت "لکھنؤ کے اندر" سے لی گئی ہیں:

باغ عالم[1] میں گولیاں برس رہی ہیں
مچھی بھون[2] میں توپیں گرج رہی ہیں
بیلی گارڈ میں تلواریں چل رہی ہیں
تیروں کی بوچھار سے فضا میں تاریکی چھا گئی ہے
اب دیواروں کے باہر فوجی اپنی قسمت کو رو رہے ہیں
پھاٹک کے اس پار کوتوال اپنے مشیر پر سوگوار ہے
محل میں بیگمات میں ماتم بپا ہے
اُن کے بال بکھرے ہوئے اور پراگندہ ہیں
میگزین میں کوئی توپوں کو سنبھالنے والا نہیں
فیلخانہ میں کوئی ہاتھیوں کی دیکھ بھال کرنے والا نہیں۔
جنگی اور تیز گام گھوڑے شہر میں بلا سائیس آوارہ ہیں
میرے تمام ساتھی بھی پیچھے کھو گئے ہیں۔"

(حواشی گیت: ۱۔ باغ عالم: لکھنؤ کی ایک بستی جسے برطانوی فوجی کمان نے لکھنؤ پر حملہ کرنے کے لیے اڈے کے طور پر استعمال کیا۔ ۲۔ مچھی بھون: لکھنؤ کے اندر ایک پرانا کچا قلعہ جسے انگریزوں نے مستحکم کیا اور اس نے کر کے اسے اپنا گڑھ بنایا۔ لیکن بغاوت کے دوران جب وہ اس پر قبضہ نہ رکھ سکے تو اسے خالی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

میں نے اُسے بہت سمجھایا بجھایا
(لیکن وہ ایک نہیں سُنتا)
اب گولے بھی ختم ہو چکے ہیں
(لیکن) وہ کہتا ہے: "میں ہتھیار نہیں ڈالوں گا"
پس وہ مطلق پروا نہیں کرتا
آہ! میرا چھوٹا دیور!"

۷ر فروری ۱۸۵۶ء کو انگریزوں نے اودھ کا الحاق کر لیا تھا اور اُس کے نواب واجد علی شاہ کو باقاعدہ جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ مذکورۂ ذیل گیت[۱] اس واقعہ کی تصویر پیش کرتا ہے۔

حضرت[۱]! جب سے حضور جلاوطن ہوئے ہیں
ہمارا وطن بالکل سنسان و ویران نظر آتا ہے
بادشاہ سلامت شان و شوکت سے محروم ہیں
بازی ہاری گئی۔ اب خیال[۲] کہاں
بیگمات[۳] سوار کر کے دور جلاوطن کر دی گئیں
اور ہمیشہ کے لیے اپنے وطن کو خیرباد کہہ گئیں
انگریز[۴] تمام تر قوت اور زور کے ساتھ چڑھ آیا
تاکہ ملک پر قابض ہو جائے
کسی بشر نے بھی مزاحمت نہ کی
کسی نے اس کے مقابلے پر ہتھیار نہ اٹھائے
انگریز نے قیصر باغ تباہ و برباد کر دیا
ہمارا بادشاہ کلکتہ کو روانہ ہو گیا
ہمارے لیے کون سا دلاسا اور کون سا سہارا چھوڑ گیا؟"

(حواشی لوک گیت: ۱ حضرت، کلمۂ احترام، مراد بادشاہ اودھ ۲۔ خیال: ایک مقبول سُر یا راگنی۔ ۳۔ بیگمات: بادشاہِ اودھ کے حرم، رانیاں۔ ۴۔ انگریز: انگلستان کے لوگ)

یہ گیت دردناک ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ وطن پر انگریزوں کے قبضے کے بعد لوگ کس طرح غمزدہ ہوئے۔ کچھ نکات قابلِ غور ہیں۔ اولاً واجد علی شاہ ایک زوال پذیر جاگیردارانہ حکومت

نہیں ہے۔ انگریز ریونیو کمشنر گبنس کا اپنا بیان ہے: "ہم تعلقداروں کو جاگیروں کی رشوت دے رہے ہیں۹۔" اس کا مقصد یہ تھا کہ باغیوں کے محاذ کے اتحاد کو توڑا جائے اور برطانوی حکومت کی بحالی کے لیے بارسوخ حمایت کرنے والے حاصل کیے جائیں۔

رانی جھانسی اس قومی بغاوت میں ایک ہیروئن بن کر سامنے آئی۔ سرہیو روز مشہور برطانوی سپہ سالار تھا جس نے انگریز فوجوں کے ساتھ اس پر چڑھائی کی اور بالآخر وسطی ہندوستان کو از سرِنو فتح کیا۔ اس مہم کے خاتمے پر جب وہ تھک کر چور ہو گیا تو پونہ کی ٹھنڈی ہوا میں آرام کرتے ہوئے اس نے سرکاری رپورٹ میں یہ لکھا: "اگرچہ وہ ایک عورت تھی لیکن باغیوں کی سب سے زیادہ بہادر اور بہترین فوجی راہنما تھی۔ باغیوں میں ایک مرد تھی۔" وہی خراجِ تحسین جو برطانوی جرنیل نے بے دریغ اُسے ادا کیا مذکورۂ ذیل لوک گیت میں محبت آمیز لہجے کے ساتھ ادا کیا گیا ہے:

"جوانمردوں کی طرح وہ بہادری کے ساتھ لڑی
رانی جھانسی
ہر منڈیر پر اس نے ایک توپ نصب کر دی
اور دوزخ کی آگ برسنے لگی
خوب لڑی مردانی جھانسی والی رانی
خوب بہادری کے ساتھ!"

اس گیت کا مصرع 'خوب لڑی مردانی جھانسی والی رانی' ایک بہت ہی مقبول جدید نظم کی بنیاد ہے جس سے شریمتی سبھدرا کماری چوہان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔

رانی کس طرح اپنے ساتھیوں میں جوش پیدا کر سکتی تھی، اس کا اظہار کئی لوک گیتوں میں کیا گیا ہے۔ غلام غوث خاں رانی کے توپخانے کا میر توپچی تھا اور اس کا دوست اور رفیق خداداد خاں قلعہ جھانسی کے بڑے پھاٹک کا دربان تھا۔ دونوں ۲ر اپریل ۱۸۵۸ء کو قلعے کی آخری خندق کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوئے۔ اس گیت میں خداداد کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"بھائی! ہمیں ایک دن تو مرنا ہی ہے
میں آج کے دن کا انتخاب کرتا ہوں
اپنی رانی کے لیے میں اپنی جان قربان کر دوں گا
میں اپنی تلوار کے ساتھ فرنگی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گا

۲. بیلی گارڈ: برٹش ریزیڈنسی کی عمارت کا مشہور نام (بغاوت کے دوران اس کا محاصرہ کیا گیا لیکن انگریزوں نے کامیابی کے ساتھ اس کی حفاظت کی.

شکست کے بعد یہ گریہ وزاری کی تصویر ہے۔ اس میں ملک کی قسمت اور اس کے مستقبل کے بارے میں کسی اعتماد کا اظہار نہیں ہے۔ یہ بعد میں پیدا ہوا جب عوام نے اس شکست سے مفید سبق حاصل کیا۔

رانا بینی مادھو جاگیرداروں کی نسل سے تھا۔ دیہاتیوں کو جمع کرنے اور برطانوی حکام کو بھینوں للکارنے سے ہر دل عزیز ہیرو بن گیا تھا۔ اس جاگیردار محبِ وطن کے بارے میں یہ گیت بغاوت کے دوران بہت مقبول ہوا اور اس کے بعد بھی اس کی مقبولیت قائم رہی:

"ہے رام! اودھ میں رانا بہادر کے سپاہیوں نے
کیا قیامت بپا کردی!
بار بار صلح جوئی کی پیش کش میں
انگریزی لاٹ[۴] نے یوں التجا کی: "او بھائی رانا! آؤ ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ
اس کے عوض میں لندن سے
تمہارے لیے فوجی اعزازات حاصل کروں گا
اودھ میں ایک صوبہ[۵] بنا کر تمہارے اختیار میں دے دیا جائے گا"
لیکن رانا نے ایسے تمام پیغامات کے جوابات میں لکھا:
"تم صدر جو چالاکی سے کام لیتے ہو لاٹ صاحب! یہ کوشش مت کرو
مجھ میں جب تک دم ہے تم جان لو کہ میرا واحد عزم یہ ہے
کہ تمہاری جڑیں کھود ڈالوں اور تمہیں باہر نکال پھینکوں
تمام زمیندار متحد ہیں
اور انگریز اُن کے سامنے خوف وہراس سے کانپ رہے ہیں
پھوٹ اُن کو ایک دوسرے سے جدا کر دے گی
اور اُن کے قلعے کی بنیادیں تباہ کر دے گی۔"

(حواشی گیت: ۴. لاٹ: برطانوی گورنر ۵. صوبہ: پرانت، پراونس)

اودھ میں انگریزوں کی طرف سے صوبے کی رشوت پیش کرنے کی کوشش محض شاعرانہ تخیل

اور لوگوں کی رگ رگ میں کیا خود اعتمادی سمائی ہو گی، اس کا اندازہ اس لوک گیت[۱۴] سے کیا جاسکتا ہے:

"آنکھوں میں امنڈتے آنسوؤں کے ساتھ
مغرور یوگ رو کر بولا:
'میں اپنی پیاس بجھانے کی خاطر
ایک کٹورے پانی کے لیے تمہارے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہوں
اور پھر نرمی کے لیے التجا کرتا ہوں'
وہ مقبول کنورا حاصل کرنے کے لیے
توپیں ہمارے حوالے کردو
بارود گولہ بھی اور
اپنی تلوار بھی!"

رانی کی نیک مثال اور جاں نثاری ہندوستان کے بے شمار بیٹوں اور بیٹیوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ وہ قومی تحریک کی زندۂ جاوید ہستیوں میں سے ایک ہے۔ ایسے گیت اس کی دائمی یاد کو قائم رکھتے ہیں۔

کنور سنگھ ۱۸۵۷ء کا ایک اور ہر دل عزیز راہنما ہے جس کا لوک گیتوں میں اکثر ذکر آیا ہے۔ چار کروڑ بھوجپوری اُسے "باپو" کہتے ہیں اور اس کی پرستش کرتے ہیں۔ مقبولیت کے لحاظ سے وہ رانی جھانسی کا ہم پلہ ہے۔ کلکتہ اور لکھنؤ کے درمیانی علاقے میں اور گنگا کے دونوں طرف انگریز اُس سے جتنا خوف کھاتے تھے اسی قدر عوام اس سے محبت رکھتے تھے۔

۱۸۵۷ء میں کنور سنگھ پچھتر سال کا ہو چکا تھا پھر بھی وہ مغربی بہار اور مشرقی یوپی کے علاقے یعنی اپنے وطن بھوجپور میں نہ صرف جدوجہد میں کود پڑا بلکہ اس کی راہنمائی بھی کی۔ بڑھاپے پر بھی اس نے انگریزوں کے خلاف جم کر معرکہ آرائیاں کیں اور طویل گوریلا جدوجہد کی تنظیم کی۔ دیناپور کی باغی رجمنٹیں اس کے جھنڈے تلے جمع ہو گئیں۔ باندہ، کانپور، لکھنؤ اور اعظم گڑھ کی جانب تمام راستے کوچ کیا اور دریائے گنگا کو پار کر کے وطن کو لوٹ آیا اور اپنی جنم بھومی آزاد شدہ جگدیش پور میں لڑتے لڑتے جان دی۔

مایسن نے اسے "اُن تین ہندوستانیوں میں شمار کیا ہے جنھیں "غدر" نے ابھارا اور جو مدبر جنگ ہونے کا دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھے۔ باقی دو تانتیا ٹوپے اور مولوی اودھ ہیں۔"[۱۵] فارسٹ

اور دنیا سے ہمیشہ یاد رکھے گی:

ایک بہت ہی موثر گیت ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے کس طرح
فوج بھرتی کی اور کس طرح عوام الناس میں سے اس نے بہادر جنگجو پیدا کیے اور کس طرح اس نے معمولی
ہتھیاروں سے انھیں لیس کیا:

"خاک و سنگ سے
اس نے فوج بنائی
محض جھاڑیوں سے
تلواریں تیار کیں
اس نے پہاڑ کو گھوڑا بنایا
اس طرح اس نے گوالیار کی جانب کوچ کیا:"

ایک ماہر سپہ سالار کی طرح رانی نے آگ لگاتے ہوئے پسپا ہونے کی پالیسی پر عمل کیا۔ ذیل
کے گیت میں جالون اور کالپی کے درمیان درختوں کا ذکر ہے جب جھانسی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا:

"درختوں کو گرادو
رانی جھانسی نے حکم دیا
ایسا ہو کہ فرنگی ہمارے سپاہیوں کو
اُن پر پھانسی دینے کے لیے لٹکائیں
بزدل انگریز چلا کر کہہ سکے
اُن کو درختوں میں پھانسی پر لٹکا دو،
اور جلتی دھوپ میں
اُن کو سایہ نہ ملے۔"

الٰہ آباد سے کانپور کو نیل کی فوج کے کوچ کے دوران اور دوسری لڑائیوں میں باغی سپاہیوں
اور کسانوں کو بڑے پیمانے پر پھانسی دی گئی۔ رانی کی کمال دانشمندی یہ تھی کہ برطانوی شہنشاہیت
پرست کمانڈروں کی بر گیر دہشت انگیزی کی چالوں کے خلاف اس نے بڑے پیمانے پر جلانے کی
پالیسی مرتب کی۔

رانی کی زیرِ قیادت باغی سپاہیوں میں حب وطن اور دلیری کی کیا روح پھونکی گئی ہوگی

اے بچے! وہ اسّی سال کا تھا
اے بچے! جب وہ چلتا تھا تو اس کا سر ہلتا تھا
اے بچے! اس کے بال بگلے کی مانند سفید تھے
اے بچے! وہ بتیس کے بتیس دانت کھو چکا تھا
اے بچے! اس دن ہمارے بابا نے اپنی تلوار اٹھائی"

۲۵ر جولائی کو دیناپور رجمنٹ کی بغاوت کے بعد جب سپاہی اس کے ساتھ شامل ہو گئے تو کنور سنگھ نے ضلع کے صدر مقام آرہ کو آزاد کرا لیا اور ۲۹ر جولائی کو گنگی کی جنگ میں ڈنبر کے تحت برطانوی فوج کو شکست دی۔ پہلی ہی جنگ نے کنور سنگھ کی دھاک باندھ دی۔ مگر انگریزوں نے بکسر سے آئر کے زیر کمان ایک اور حملہ کر دیا۔ ۷ر اگست کو بی بی گنج کی لڑائی لڑی گئی۔ انگریز بہتر طور سے مسلح اور لیس تھے۔ کنور سنگھ نے ڈٹ کر مقابلہ کیا اور دشمن کو پریشان اور کمزور کر دیا۔ بعد میں کمالِ استادی کے ساتھ پسپا ہوا اور کامیابی کے ساتھ ساری فوج بچا کر لے گیا۔ اس جنگ کو ذیل کے سوہر[۱] میں بیان کیا گیا ہے (سوہر ایک لوک گیت کی طرز ہے) جسے عورتیں بڑے جوش و خروش کے ساتھ گاتی ہیں:

"یہ بھادوں کے مہینے کی ایک رات تھی
آسمان پر کالے بادل چھائے ہوئے تھے
بابو کنور سنگھ آدھی رات کو
لڑنے کے لیے نکل پڑا
فرنگی خوف سے کانپتے تھے
آسمان سے موسلا دھار بارش ہو رہی تھی
میدانِ جنگ میں بندوقوں
سے گولیاں برس رہی تھیں
بابو کنور سنگھ کا گھوڑا کلیل کرتا ہوا
آگے بڑھا
وہ گورا فوج کے سپاہیوں کے سر قلم کرتا رہا
ڈلکی چال چلتے ہوئے گھوڑے کے ہر سم کی ٹاپ کے ساتھ
دھڑام سے سر کٹ کر گر پڑتے

نے "دی ہسٹری آف میوٹنی" میں کنور سنگھ کے عزم راسخ، جوشِ عمل اور دلیری کی داد دی جن کے طفیل اُسے اپنے ساتھیوں کی اطاعت اور عقیدت حاصل ہوئی۔"

جس چیز کا کنور سنگھ حامی تھا اور جس کی خاطر وہ لڑا اس کی تصویر ایک پُر درد لوری میں کھینچی گئی ہے

"آہ! اے میرے بچے! اس دن ہمارے بابا نے تلوار اٹھائی
اے بچے! ہماری عزت اور ثروت کو بچانے کے لیے
ہمارے دھرم اور گئو کی حفاظت کی خاطر
اے بچے! ہیراؤں کی معافی کی زمین کو بچانے کی غرض سے
ماتاؤں اور بہنوں کو بے حرمتی سے بچانے کے لیے
اے بچے! آباؤ اجداد کے ننگ و ناموس کی حفاظت کی خاطر
اے بچے! جب قہر کی گھڑی ہمارے سر پر تھی
اس دن ہمارے بابا نے اپنی تلوار سونتی!"

٭ ٭ ٭

اے بچے! جب مرہٹوں نے اپنی جانیں قربان کی تھیں
اور سکھوں کے ساتھ مرتے دم تک لڑتے رہے
اے بچے! پیشواؤں کے بیٹوں نے غلامی قبول کر لی
اے بچے! شہنشاہِ دہلی بھی کنگال ہو گیا تھا
انھوں نے بھیک پر بھیک مانگی مگر کوئی خیرات نہ ملی
اے بچے! اس دن ہمارے بابا نے تلوار اٹھائی

٭ ٭ ٭

اے بچے! ہماری توپوں میں پھوڑے اور بڑھے
اے بچے! ہماری بندوق کی نالیوں کو زنگ لگ گیا ہے
اے بچے! ہم نے تلواروں کی فولاد سے درانتیاں بنائیں
اے بچے! بھوجپوریوں نے اپنی لاٹھیاں بھی ایک طرف پھینک دی تھیں
اے بچے! اس دن ہمارے بابا نے اپنی تلوار اٹھائی

"اس نے لکھا: 'اے حوالدار میری بات سنو
میں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی ہے
انگریزوں کے لچھن بُرے ہیں
وہ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہم
ان کے ساتھ مل کر کھانا کھائیں
وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہم ان کے ساتھ بیٹھ کر پئیں!

(نوٹ ۱۔ انگریزوں کے ساتھ کھانے پینے کا مطلب اپنی ذات برادری سے خارج ہونا تھا)

وہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم کارتوسوں کو
اپنے دانتوں سے کاٹیں!'"

(نوٹ ۲۔ نئی انفیلڈ رائفلوں کے ساتھ جو کارتوس دیے گئے تھے اُن کے ساتھ ایک کاغذ چپکایا گیا تھا جس میں گائے اور سور کی چربی استعمال کی گئی تھی۔ اس کاغذ کو دانتوں سے کاٹا جاتا تھا اس لیے ہندوستانی سپاہی ان کارتوسوں کو کاٹنا مذہب کے خلاف سمجھتے تھے۔ اس سے ان کے مذہب میں خلل پڑتا تھا۔)

"حوالدار نے یہ پڑھا
اس نے کیا پیغام بھیجا؟
حوالدار خود چل کر جگدیش پور آیا
(اور اس نے یہ کہا)

'او بابو! میری سوگند سنو جو میں نے کھائی ہے
کارتوس کو میں کبھی بھی اپنے دانتوں سے نہیں کاٹوں گا
ان کا پانی کبھی بھی نہیں پیوں گا
میں برہمن ہوں یا راجپوت،
شیخ ہوں یا سیّد ہوں،
میں مغل ہوں یا پٹھان،
ان کے کارتوس کو ہرگز نہیں کاٹوں گا
او بابو! میری سوگند سنو!'"

ایک بار جب وہ گوروں کے نرغے میں آگیا
وہ حیرت انگیز طریقے سے لڑا
اس نے گھوڑے کی باگ کو دانتوں میں دبالیا
اور دونوں ہاتھوں سے لڑتا رہا
اس کا گھوڑا جنگ کی چال کے طور پر چکر کاٹ کر دوڑتا رہا
تلوار کے ساتھ تلوار جھنجھناتی تھی
بی بی گنج میں ایک خوں ریز جنگ ہوئی
توپیں گرجتی تھیں اور سنگینیں چمکتی تھیں
حریف ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے
آئر دہشت زدہ تھا
وہ عالمِ مایوسی میں اپنی چھاتی کو پیٹتا تھا
کہنے لگا "یہ بابو ایک جادوگر ہے
وہ شیر کی مانند تیزی سے جھپٹتا ہے
خوش نصیب ہے وہ ماں جس نے
پہاڑ کی مانند تناور بیٹا جنا!
انگریزی راج تباہی کے کنارے پر ہے
ہاں! اب یہ نہیں بچ سکتا
میں یہاں بے بس ہوں۔ یہاں کنور سنگھ
کے سے سورما کے ساتھ لڑائی ہے!"
شاعر ناتھ "سوہر" راگنی الاپتا ہے
کنور کا نام زندۂ جاوید ہے!"

کنور سنگھ اور اس کے چھوٹے بھائی امر سنگھ کی مدح میں مکمل پنوارے بھی ہیں جنگ دلور[۱۹] پر ایک پنوارے کی چند سطور نیچے پیش کرتا ہوں جن میں اُس زمانے کے ماحول کی عکاسی ہے اور اُن خیالات اور جذبات کا بیان ہے جو باغیوں کی تحریک کا موجب تھے۔

سپاہی رجمنٹوں کے ساتھ کنور سنگھ کے رابطے کو یوں بیان کیا گیا ہے:

اے ٹھاکرو! جب تم غیر سے رحم کی درخواست کرتے ہو،
تم سنگھ[1] یعنی شیر کہلانے کے مستحق نہیں ہو
صرف وہی اس نام کے حق دار ہیں جن کے
پنجے ہاتھیوں کو مار گراتے ہیں نہ کہ مسکین
اپنے آبا و اجداد کے اوصاف سے غافل ہو کر تم غیروں کی خوشامد کرتے ہو
ناز و نعمت اور کاہلی کے پھندوں میں تم زندگی کے بیش بہا دن کھو رہے ہو
سبحان اللہ! کیا شان ہے ان ٹوٹی پھوٹی حقیر جھونپڑیوں کی اور
اُن کی مٹی کی دیواروں پر گھاس کی
تُف والیانِ ریاست کے ان بلند اور فلک بوس راج محلوں[3] پر!
محلات کو لوٹنے والوں کے لیے جھونپڑیاں قہرِ الٰہی ہیں
اگر وہ جھونپڑیوں کا رخ کریں گے تاکہ انھیں لوٹا جائے تو مفت میں
وہ موت کے منھ میں چلے جائیں گے۔

(حواشی گیت ۱۔ سنگھ: راجپوتوں کی عرفیت جس کا مطلب ہے 'شیر'
۲۔ ٹھاکر: راجپوت سردار یا رئیس۔ لفظی معنی 'آقا۔ مالک'
۳۔ راج محل: شاہی محل)

مجھے کسی ہم عصر شاعر کا علم نہیں جو اتنی شدید قوم پرستانہ عقیدت رکھتا ہو اور جس نے ایسی دنیاوی حقیقت شناسی کا اظہار کیا ہو۔ ہم عصر لوگوں کے دلوں پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کا کتنا گہرا اثر ہوا ہوگا جس نے سورج مل جیسے قدامت پسند درباری شاعر کو اپنے جاگیردار سرپرستوں کے ساتھ اپنا تعلق قطع کرنے اور ان کی صاف صاف مذمت کرنے پر آمادہ کیا۔

اگر درباری شعرا اس قدر متاثر ہو سکتے تھے تو اس میں شک نہیں کہ عوامی شعرا نے اور زیادہ کھل کر لکھا۔ والیانِ ریاست کے بعد جودھپور میں سب سے زیادہ بارسوخ آدمی اودا کا ٹھاکر تھا جس نے نہ صرف اپنے آقا یعنی مہاراجہ کے خلاف بغاوت کی بلکہ اپنے آقا کے آقا یعنی انگریز کے خلاف بھی۔ اُس نے کسانوں اور کچھ وطن دوست جاگیردار سرداروں کو بھی اپنے گرد جمع کیا۔ اُس نے جودھپور کے راجہ کی فوجوں کو ناکوں چنے چبوائے۔ برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ، مانک میسن کو جنگ میں ہلاک کیا اور راجپوتانہ میں گورنر جنرل کے برطانوی ایجنٹ، لارنس کو بھینوں مقابلے کے لیے للکارا۔ اودا کی

بہار کے لوگوں کی نگاہ میں کنور سنگھ کی یاد کا مطلب تھا غیر ملکی غلامی سے نجات پانا۔ ہر سال ہولی (رنگوں کا تیوہار) کے دوران وہ اس کی یاد میں گیت گاتے ہیں اور اس سوگند کو دہراتے ہیں:

"او بابو کنور سنگھ!
ہم اپنے کپڑوں کو کبھی پوتر کیسری رنگ میں
نہیں رنگیں گے جب تک تمہاری حکومت پھر بحال نہ ہو جائے
اِدھر سے انھیں گھیرنے کے لیے
فرنگی آئے
اور اُدھر سے
دونوں کنور بھائی نمودار ہوئے
طرفین سے توپوں نے اس طرح آگ برسائی
جس طرح ہولی کا رنگ آزادانہ چھڑکا جاتا ہے
درمیان میں گھمسان کا رن پڑا
او بابو کنور سنگھ! اب ہم کبھی اپنے کپڑوں کو
پوتر کیسری رنگ میں نہیں رنگیں گے جب تک
تمہاری حکومت بحال نہ ہو جائے"

باغی شمالی ہندوستان اور بمبئی کے درمیان راجپوتانہ بیچ کی ایک کڑی تھی اور بمبئی میں انگریزوں کا پہلا ہندوستانی اڈہ تھا۔ نہ صرف راجپوتانہ کے لوگوں کی بلکہ سارے ملک کی نگاہیں راجپوت والیانِ ریاست پر گڑی تھیں کہ وہ بغاوت کریں گے اور انگریزوں کو سمندر میں پھینکنے میں مدد دیں گے۔ لیکن یہ جاگیردار حکمراں برطانوی اقتدار سے چمٹے رہے اور حبِّ وطن کی فرض کی پکار کو نہ سنا۔ سورج مل ہندی کا مشہور درباری شاعر تھا جس نے والیانِ ریاست کو قومی بغاوت میں شامل ہونے کے لیے ترغیب دینے کی انتہائی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ اس نے پُرزور الفاظ میں اپنے غم و غصّہ کا اظہار کیا۔ ذیل میں اس کے چند دوہے پیش کیے جاتے ہیں:

"سؤر سبزہ زار کو برباد کرتے ہیں۔ ہاتھی جنگل کو گندا لاتے ہیں
جب کہ شیر خطرہ سے غافل ہو کر [illegible] طرف ..."

کے تعاقب میں ہے!
لیکن اودا کے گھوڑے انھیں پچھلی ٹانگوں
کے ساتھ دولتّی مار رہے ہیں
وہ جنگ کو جاری رکھے ہوئے ہیں
جنگ میں ڈٹے رہو
آخر ہماری فتح ہوگی!
او لڑتے رہو، جنگ جاری رکھو"

(حواشی گیت: ۱۔ بنیا: بیوپاری اور سود خور ۲۔ راجہ: بادشاہ، حکمران ۳۔ ٹنگالی: خاندانی دلیری)

اس گیت میں خندق کی روح سمائی ہوئی ہے اور عظیم خود اعتمادی کے جذبے سے معمور ہے۔ "راجہ" کا پارٹ کس قدر سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے؟ "وہ گوروں کے ساتھ شامل ہے اور ہم پر چڑھائی کر رہا ہے"۔ یہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے گرانقدر تجربوں کا نتیجہ تھا کہ ہمارے ہموطنوں نے ہندوستانی جاگیرداروں کے پارٹ کی چال کو سمجھ لیا اور اُن سے قطع تعلق کر لیا حالاں کہ ان کو اب تک روایتی راہنما تصوّر کیا جاتا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی بغاوت نے اس بات کے لیے راستہ ہموار کر دیا کہ شہنشاہیت پرستی کے خلاف ہندوستانی تحریک جاگیرداری کے خلاف تحریک کی صورت بھی اختیار کرے یعنی مستقبل میں فتح کے لیے صحیح تدبیر جنگ دریافت کی جائے۔

۱۸۵۷ء سے متعلق یہ لوک گیت نہ صرف فی الواقع ۱۸۵۷ء کے دنوں کی روح کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ یہ ہماری عظیم قومی میراث کا بیش بہا جُز ہیں۔ ان میں ہماری اولین بلند درجہ قوم پرستانہ نظمیں موجود ہیں اور اس بنا پر ہمارے قومی سیاسی ترکے کا حصّہ ہیں۔ انھی میں ۱۸۵۷ء کی قومی بغاوت کے دوران عوام کے نظریوں، جذبات اور ارمانوں کے ثبوت پائے جاتے ہیں چنانچہ یہ ہماری قومی تحریک کی بیش قیمت تاریخی دستاویزات ہیں۔

حواشی

۱۔ ٹریویلین: "کانپور شارٹ نیریٹوز" (Cawnpur Short Narratives)
۲۔ کے: "ہسٹری آف دی سپاہی وار" جلد اوّل صفحہ ۲۴۶۔ ایف
۳۔ "ان دی ایر فورٹین" (In the Year Fourteen) از انڈین اینٹی کواٹری (۱۹۱۱ء)
۴۔ علاقہ برج سے بتوسط کے۔ ایل۔ چنچرک حاصل کیا گیا
۵۔ یہ گیت نیز امانی سنگھ سے متعلق گیت بھگوان سنگھ وتی، ہتھرس کی وساطت سے حاصل کیا گیا۔

جد وجہد کی راگنی لوک گیتوں میں الاپی گئی ہے۔ ذیل کا گیت مقبولِ عام[۲] ہے جو ہولی کے زمانے میں عام طور پر گایا جاتا ہے:

"ہمارے کالی چمڑی والے جوانمرد بنے' کی چراگاہوں میں ڈیرہ
ڈالے ہوئے ہیں
ہمارا راجہ گوروں کے ساتھ ہے
وہ ہم پر چڑھائی کر رہا ہے
گورے فرنگیوں نے کالی ٹوپیاں اوڑھ رکھی ہیں
ہا! کالی ٹوپیوں والے گورے پھیل کر
ہم پر حملہ کر رہے ہیں۔

ٌ ٌ ٌ

اجنبی کی توپوں کے گولے خاک پر پڑ رہے ہیں
لیکن آہا! ہماری توپیں ان کے خیموں کو تباہ کر رہی ہیں،
یہ ذی شانِ اودا ہے!
آہا! کیا خوب شاندار اودا!
اے اودا! تو ایک ستون ہے
جو ملک کی چھت کا سہارا ہے

ٌ ٌ ٌ

آہا! جب ہماری توپیں سر ہوتی ہیں
اراولی کی پہاڑیاں بھی کانپ اٹھتی ہیں!
اودا کا سردار دیوی ٹنگالی سے دعا کر رہا ہے
واہ وا، کیا خوب جنگ ہو رہی ہے!
اودا جنگ جو سپوتوں کا وطن ہے
واہ وا، جنگ جاری ہے!

ٌ ٌ ٌ

ہاہ! راجہ کا رسالہ اپنے ہی کالے ہموطنوں

حصّہ سوم

۶۔ "انڈین اینٹی کواری" (۱۹۱۱ء) "سانگس اباؤٹ دی کنگ آف اودھ" (Songs about the King of Oudh) انڈین سول سروس کے ولیم کروک نے دیہاتیوں سے راہ ورسم پیدا کرکے جمع کیے۔
۷۔ ایضاً۔
۸۔ ایضاً۔
۹۔ منقول از تصنیف فارسٹ: انڈین میوٹنی" جلد دوم۔
۱۰۔ "انڈین اینٹی کواری": "سانگس آف دی میوٹنی" مصنف ڈبلیو۔ کروک۔ کروک نے یہ گیت ضلع اٹاوہ کے ایک دیہاتی اسکول ٹیچر سے حاصل کیا۔ میں نے الہ آباد کے ڈاکٹر اودھے نارائن تیواڑی اور بنارس کے ڈاکٹر کے۔ ایس۔ اپادھیائے کے توسط سے اس گیت کے متن کا بھوجپوری نسخہ کے ساتھ موازنہ کرایا۔
۱۱۔ مہاشوتیا بھٹاچاریہ: "جھانسیر رانی" (بنگالی) سے۔
۱۲۔ ایضاً۔
۱۳۔ شری ورنداون لال ورما، جھانسی، سے۔
۱۴۔ ایضاً۔
۱۵۔ مالیسن: "ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی" جلد دوم صفحہ ۴۵۲۔
۱۶۔ شری درگا شنکر پرساد سنگھ سے جو کنور سنگھ کی اولاد سے تھا۔
۱۷۔ ایضاً۔
۱۸۔ ایضاً۔
۱۹۔ ماہانہ رسالہ "بھوجپوری" کے رسالہ کنور سنگھ سے
۲۰۔ راجستھان کے سہ ماہی "پرم پرا" کے خاص شمارہ شاعری بعنوان "گولا ہٹ جا" سے۔
۲۱۔ ایضاً۔

جیمز برائن

بغاوتِ ہند اور برطانوی رائے

۱۸۵۷ء کی بغاوت کی جو تصویر انگریزی طلبا کے سامنے کئی پشتوں سے پیش کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ برطانوی باشندے اُن مظالم پر خوفزدہ ہو کر متحد ہو گئے تھے جو جاہل اور توہم پرست ہندوستانیوں نے انگریز مردوں، عورتوں اور بچوں پر ڈھائے جب کہ وہ دور دراز برِصغیر میں برطانوی سلطنت کا بوجھ فرض سمجھ کر اُٹھائے ہوئے تھے۔ وسیع علمی وسائل حاصل ہونے کے باوجود ایسا معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی عوام کے اصلی تاثرات جاننے کی غرض سے معاصرانہ وسائل کی کوئی خاص تحقیق نہیں کی گئی۔ (یہ کوتاہی بذاتِ خود تاریخی اہمیت کی حامل ہے) لیکن اب یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ برطانوی رائے کی جو تصویر آج تک خاص و عام نے قبول کی وہ حقائق کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتی۔

یہ مختصر مطالعہ خاص طور سے برطانوی مزدوروں کے طبقے کے تاثرات سے متعلق ہے لیکن اِسے برطانیہ کے شہری متوسط طبقے کے مختلف تاثرات کے سیاق وسباق میں دیکھنا ضروری ہے جس میں تین باتوں کے سلسلے میں اختلافات نظر آتے ہیں۔ اختلافی مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستان سے متعلق برطانوی پالیسی میں عیسائیت کا کیا پارٹ ہو۔ کیا ہندوستانیوں کو "واحد دینِ برحق" قبول کرنے پر مائل کیا جائے یا انھیں "کافرانہ بت پرستی اور توہمات" میں مبتلا رہنے دیا جائے؟ دوسرا اختلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کے حامیوں اور مخالفوں کے درمیان تھا۔ تیسرے اختلاف میں ایک طرف وہ لوگ تھے جو ہندوستان کو برطانوی قلمرو میں شامل کرنے کی کوشش کو ایک غلط قدم سمجھتے تھے ــــ دوسری طرف وہ لوگ جو اس جرأت مندانہ اقدام کو برطانوی تاریخ میں ایک سنہری ورق تصور کرتے تھے اور ہندوستان کو برطانیہ کے شہنشاہی تاج کا سب سے زیادہ تابناک ہیرا بنانا چاہتے تھے۔

کے تحت لانے کا منصوبہ باندھ رکھا تھا، اپنی دلائل میں عیسائیت کے سوال کو نظرانداز کردیا۔
آزاد خیال 'کابڈن'، اور کرسچین سوشلسٹوں کا ردِعمل قابلِ ذکر ہے۔ کابڈن نے نجی طور پر
ھا: " مذہب کے شیدائی جو ہمیں یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کو عیسائی بنانے کے لیے اس پر قبضہ رکھنا
ہیے، میرے خیال میں جو کچھ وہاں ہوا ہے اس کی بنا پر انھیں یقین ہو جانا چاہیے کہ ایک قوم کو عیسائی
نے کے لیے لال کوٹ بھیجنا تبلیغی کوششوں کے حق میں خدا کی برکت حاصل کرنے کا موزوں ترین
یقہ نہیں ہے۔" لیکن اس نے مزید کہا: "مجھے معلوم ہے کہ اس وقت جب کہ اس ملک کا مزاج بگڑا
ا ہے، اُن عقیدوں کی تلقین کرنا بے سُود ہے لیکن اگر مجھے مجبور کیا جائے کہ میں آج کے موضوعات پر عوام
ے سامنے اپنی رائے پیش کروں تو میں اس اہم ترین موضوع کو نظرانداز نہ کرسکوں گا۔ اس لیے میں اپنی چادر
لک) کے اندر ہی پاؤں سمیٹے رکھنا چاہتا ہوں کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ میرے خیالات کے اظہار کا یہ موزوں
قع نہیں ہے جس سے کسی فائدے کا امکان ہو۔"۵

بغاوت کی وجہ سے کرسچین سوشلسٹوں کو ایک سخت خلجان سے گزرنا پڑا۔ چارلس کنگسلے نے
ے۔ ڈی۔ مارس کو لکھا کہ "میرا ایمان ہندوستان میں قتلِ عام کی وجہ سے متزلزل ہو چکا ہے۔ اس کے
وجود جو اخلاقی مسائل وابستہ ہیں اُن سے میں بدحواس سا ہو گیا ہوں۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟
ضرت عیسیٰ بہرحال بادشاہ ہیں۔"۶ مارس نے اپنے دوست لڈلو کو لکھا، "ہندوستان کی خبروں سے
ن تمام سوالات کی یاد تازہ ہوتی ہے جن سے ماضی میں لسبن کے زلزلے کے وقت ہم دوچار تھے۔"۷
س بات سے کنگسلے اور مارس کو قلق تھا وہ یہ تھی کہ خدا نے کیسے گوارا کیا کہ اس کے "عیسائی"
ندے" کافروں کے ہاتھوں قتل ہوں۔ حادثہ لزبن کی طرح اس وقت بھی یہ سوال کیا گیا کہ آیا یہ
ناہ کی سزا تھی یا کفر کے حق میں دلیل؟ کچھ تکلیف دہ غور و فکر کے بعد تینوں دوست اپنے ایمان
ر قائم رہے۔ مارس کو اس عقیدے میں تسکین ملی کہ ہمیں اپنے سوا کسی دوسرے پر الزام نہ دھرنا
اہیے اور اس پشیمانی اور ندامت کا اظہار ہمارے افعال میں ہونا چاہیے۔"۸ اُس نے ہندوستانی
حران سے متعلق اپنے 'پانچ واعظ' میں یہ خیال ظاہر کیا کہ "ہمیں ہندوستان کی سلطنت کو قائم
کھنے کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے۔"۹ کنگسلے نے اپنی بدحواسی پر تو قابو پالیا لیکن ایسا معلوم ہوتا
ہے کہ وہ پبلک میں خاموش رہا۔ لڈلو نے جلد ہی یہ لکھنا شروع کیا "اگر ہندوستان مطمئن او
وشحال ہو، مغرب میں سیکسنی وسائل مضبوط ہوں اور مشرق میں وفادار مسلمانوں اور سکھ (جو
-ہند میں جھونکے جا سکیں) ہمارے ساتھ ہوں تو انگلستان بلا خطر دنیا کو للکار سکتا ہے۔"۱۰ عیسائی

برنیں اختلافات جدا گانہ نہ تھے بلکہ ان کے باہمی تعلق ہی کی وجہ سے وہ تذبذب پیدا ہوا جو بغاوت کا مقابلہ کرنے میں حکمراں طبقے نے ظاہر کیا۔ اختلاف کا ایک اور نکتہ بھی قابلِ ذکر ہے یہ اختلاف اُن مبینہ مظالم کے بارے میں تھا جو باغیوں سے منسوب کیے جاتے تھے۔ اطلاعات کی صداقت پرکھنے میں شہری متوسط طبقہ بے شک اُن اختلافات سے متاثر ہوا۔ لیکن ان اطلاعات پر بعض لوگوں نے جس طرح شک کا اظہار کیا وہ اُسی قدر قابلِ ذکر ہے جس قدر اُن لوگوں کا جوش وخروش جنھوں نے انتقام کی حمایت اور تعریف کی۔ برطانیہ کے اسکولوں کے بچے اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔

ہندوستان میں عیسائیت سے متعلق پریوی کونسل کے کلرک گریول، کو ہندوستان میں فوجوں کے کمانڈر انچیف اینس کی طرف سے ایک خط ملا جو شورش برپا ہونے سے عین پہلے لکھا گیا تھا۔ اینس نے "ایسی بے اطمینانی کے عجیب احساس کا ذکر کیا جو ہندوستانی فوجیوں میں پھیلی ہوئی تھی اور جس کی بنا مذہبی اسباب بھی تھے اور یہ شک بھی کہ ہم ان پر عیسائیت ٹھونسنے میں زبردست طاقت کا استعمال کرنے والے ہیں۔" گریول نے لکھا: "یہ حقیقت نہیں ہے لیکن ہندوستانیوں کو اُس وقت تک یقین نہ آئے گا جب تک اگزیٹر ہال اور مشنریوں کو ان علاقوں میں من مانی کرنے کی اجازت ہے۔"[1] بعد میں اس نے "ہندوستان کو عیسائی بنانے کے شاندار منصوبے" کا ذکر کیا "جس کی تعمیل میں کلیسا کے ادنیٰ واعلیٰ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔"[2] "ٹائمز" اُن میں سے تھا جو یہ محسوس کرتے تھے کہ "وہ مقصد جس کے لیے ہمیں ہندوستان پر قبضہ رکھنا چاہیے مستقبل میں لوگوں کو عیسائی اور مہذب بنانا ہے۔"[3] "مارننگ پوسٹ" کی یہ رائے تھی کہ "ہم نے ہر تعصب کو، خواہ وہ ہندو کا تھا یا مسلمان کا، لاڈ پیار سے بگاڑا، اس کی پرورش اور ناز برداری کی خواہ کتنا ہی غیر معقول، کتنا ہی بیہودہ اور کتنا ہی ہمارے احساسات، جذبات اور خیالات کے منافی تھا۔"[4] لیکن گلیڈسٹون نے بالکل چپ سادھ رکھی۔* وہ طلاق بل میں الجھا ہوا تھا۔ ڈسرائیلی نے جو لارڈ پامرسٹن کی حکومت کا تختہ الٹنے پر تُلا ہوا تھا اور جس نے ہندوستان کو برطانوی تاج

(* نوٹ متعلقہ گلیڈسٹون: "مکمل" نہیں۔ مارلے اپنی تصنیف "لائف آف گلیڈسٹون" میں بغاوت کو نظرانداز کر دیتا ہے۔ منی پینی اور بکل کی تصنیف "لائف آف ڈسرائیلی" جلد اول ۱۸۹۵ء میں تنقید ملاحظہ فرمائیں۔
۱۲ر اکتوبر ۱۸۵۷ء کو بمقام چیسٹر سوسائٹی آف فارن مشنز کے نام ایک خطبے میں گلیڈسٹون نے کہا: "میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں کہ میں نے پچھلے پچیس سالوں میں ہندوستانی سلطنت سے متعلق پالیسی کی مضرت رساں مثالیں دیکھی ہیں، ایسے اقدامات کیے گئے جن میں انصاف کا شائبہ نہیں۔ تاریخ انگلستان کے ماتھے پر یہ کلنک کا ٹیکہ ہے۔" "پیپلز پیپر" ۱۷ر اکتوبر ۱۸۵۷ء)

ہے کہ روز بروز مستورات کلکتے میں وارد ہو رہی ہیں جن کے کان اور ناک کٹے ہوتے ہیں اور جن کی آنکھیں نکال دی گئی ہیں۔ معصوم بچوں کو خاص کر مخصوص کیا گیا ہے کہ ماں باپ کی آنکھوں کے سامنے انھیں ایسی ایسی اذیتیں دیں جو سوچی بھی نہیں جا سکتیں۔ ماں باپ کو ان مظالم کا تماشائی بنایا گیا۔ ان کو اپنے بچوں کے اعضا سے کٹے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کھلائے گئے اور بعد میں انھیں دھیمی آنچ پر جلا کر ہلاک کیا گیا۔"[18]

خاتون جن کے خط کا ذکر ہے وہ گورنر جنرل کی بیٹی لیڈی کیننگ تھی۔ بعد میں لارڈ شیفٹس بری نے دباؤ پڑنے پر اپنے بیان کی تصحیح کر دی۔ اس نے تسلیم کیا کہ "میں نے خود خط کو نہیں دیکھا بلکہ اس کے بارے میں سنا ہے۔"[19] اس بات کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ ایسا کوئی خط لکھا بھی گیا تھا۔

اس بات کا ثبوت کہ لارڈ شیفٹس بری نے انتقام کے حق میں اپنی رائے برقرار رکھی ایک خط سے ملتا ہے جو اس نے مارٹن ٹپر کو لکھا۔ یہ بکنگھم محل میں ایک ہر دل عزیز شاعر تھا۔ اُن نظموں کے علاوہ جس میں اس نے دہلی کی مکمل تباہی اور مجرموں کے لیے قطار در قطار "پھانسی کے تختے" نصب کرنے کا تقاضا کیا۔ اُس نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ "وکٹوریہ کو ہندوستان کی ملکہ بننا چاہیے۔"[20] شیفٹس بری نے لکھا: "میں تمھارے ساتھ اتفاق کرنے پر بہت مائل ہوں کہ اکثر لوگ جب انتقام کو خدا کے ساتھ منسوب کرتے ہیں تو وہ اس لفظ کے مفہوم کو بالکل نہیں جانتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انجیلِ مقدس میں انتقام انصاف کا کامل ترین اور بلند ترین ارتقا ہے۔ سپاہی اپنے جرائم کے خود گواہ ہیں۔ اُن کے جرم کو ثابت کرنے کے لیے کسی شہادت کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے میں انسانی حکومت مختار ہے۔ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ آئینی حکومت کو تمام کارروائی کا اختیار ہو نہ کہ نجی قانونِ سزا کا اس میں دخل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہم سرکار سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ سزا دینے میں سختی، عزم اور مستعدی سے کام لے۔"[21]

کابڈن نے مظالم کی داستانوں کو تسلیم کیا لیکن جان برائٹ کو اس نے لکھا: "یہ ظاہر ہے کہ جو سلوک انگریزوں نے ہندوستانیوں کے ساتھ روا رکھا ہے اس کے پیشِ نظر اُن سے محبت یا احترام کی توقع نہیں ہو سکتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم ہندوستان میں اپنی رعایا کو (ہندوستانیوں) حبشی کے عام لقب سے نوازتے ہیں۔ یہ سب کچھ گوارا ہو جاتا (گو کسی قدر مشکل ہے)، اگر انگریز جن کے ساتھ ہندوستانیوں کا رابطہ تھا اعلیٰ اوصاف اور اعلیٰ دماغی صلاحیتوں سے کام لیتے۔ جو غلطیاں ماضی میں انگریزوں سے سرزد ہوئی ہیں اور اس سے زیادہ خونریزیاں جو اس وقت عمل میں آ رہی ہیں اور جو اُن بے گناہ

سوشلزم شہنشاہیت پرستی کے ساتھ مصالحت کر رہی تھی۔

اب ایسٹ انڈیا کمپنی کے چند ہی دوست رہ گئے تھے۔ کابڈن نے لکھا: "ہم سب جانتے ہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایشیا جانے کا کیا مقصد تھا۔ یہ مقصد اجارہ داری تھا۔ یہ اجارہ داری نہ صرف غیر ملکیوں کے خلاف بلکہ اپنے باقی ہموطنوں کے خلاف بھی"۔ اس کا خیال تھا کہ کمپنی کو برقرار رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں تھا کیوں کہ "کمپنی نے اپنے آپ کو ایسے جرائم کے ارتکاب کا اہل ثابت کیا ہے جو کسی ایسے وحشی قبیلے سے بھی نہ سرزد ہوتے جن کے بارے میں ہم نے ڈاکٹر لونگ اسٹون کی داستان میں پڑھا تھا اور جنھوں نے لونگ سٹون سے پہلے کسی عیسائی یا فرنگی کی شکل بھی نہ دیکھی تھی۔" "دی انڈین ریفارم سوسائٹی" مختلف خیالات رکھنے والے لوگوں کے لیے ایک پلیٹ فارم تھی ــــ ارنسٹ جونز، و منشوری، کے لیے یہ ایک مفید پلیٹ فارم ثابت ہوا ــــ یہ سوسائٹی زیادہ تر مانچسٹر کے اُن کارخانہ داروں کی رائے کی عکاسی کرتی تھی جو ہندوستان میں امریکہ کی جگہ ایک متبادل روئی کی رسد قائم کرنا چاہتے تھے۔ اس سوسائٹی نے کمپنی کے اختیارات میں کمی، ہندوستانیوں کے ساتھ بہتر سلوک اور اُن پر عائد کیے جانے والے محصول سے متعلق اصلاحات کا مطالبہ کیا۔[۱۲] "دی ویکلی ڈسپیچ" نے جس کا مقصد اخبار پڑھنے والے مزدور طبقے کی توجہ سماجی اور معاشی نظام کے خلاف بغاوت کی طرف سے ہٹانا تھا، یہ رائے ظاہر کی کہ "اگر ہم ہندوؤں اور مسلمانوں سے اُن کے جرائم کا انتقام لیں اور فرنگی حکّام کو چھوڑ دیں جن کی بداعمالی ان جرائم کا موجب ہوئی تو یہ نامردی اور بے دینی ہوگی۔"[۱۳] ادنیٰ طبقوں کی بے چینی کو کمپنی* کی مخالفت میں بدل دینا سہل تھا۔ "دی ڈیلی ٹیلیگراف" نے کمپنی کی اس بنا پر مذمت کی کہ حکومت کی باگ ڈور ایک "واحد طبقے"[۱۴] کے ہاتھ میں دے دی گئی ہے۔ "دی سٹینڈرڈ" نے کمپنی کی مذمت کے ساتھ یہ سفارش بھی شامل کر دی کہ وسط ہفتے میں روزے کے دن اور روزِ شفاعت مالک مزدوروں کو پوری اجرت ادا کریں ــــ معلوم ہوتا ہے اس تجویز پر عمل نہیں کیا گیا۔[۱۵] "دی نان کنفارمسٹ" نے بھی کمپنی پر حملہ کیا۔[۱۶] لارڈ پامرسٹن جو ہندوستان کے معاملات پر اظہارِ رائے میں بے ساختہ اور بے لاگ تھا، جھٹ اس نتیجے پر پہنچا کہ کمپنی کو بند کر دینا چاہیے۔"[۱۷]

مظالم کے سوال پر لارڈ شیفٹس بری سب سے زیادہ صاف گو تھا۔ اس نے اعلان کیا: "میں نے خود ہندوستان میں مقیم ممتاز ترین خاتون کا لکھا ہوا ایک خط دیکھا ہے جس میں یہ بیان کیا گیا

(* نوٹ متعلقہ کمپنی: اس نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ "اگر ہم سپاہیوں کو کچل دیں تو خدا اتنا ہی خوش ہوگا جتنا اہلِ برطانیہ ہوں گے۔" ۲۲ اگست ۱۸۵۷ء)

تک لوٹنے کی تجویز کی مخالفت کی۔ اُس نے اپنے قارئین کو یاد دلایا کہ "ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ انھیں آدمیوں (باغیوں) کو، جب یہ ہماری ملازمت میں تھے، ہم نے دوسروں پر اسی قسم کے مظالم ڈھانے میں آلۂ کار بنایا۔"۲۹ "دی نان کنفارمسٹ" نے اس بات سے اتفاق ظاہر کیا کہ ہندوستان میں امن بحال کرنے میں اور قانون کی برتری قائم کرنے سے پہلے سختی سے کام لینا پڑے گا، لیکن یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کر لیا کہ "جو کچھ بھی کرنا ضروری ہے وہ عیسائی سپرٹ کے مطابق کرنا چاہیے، نہ کہ جوشِ جنون سے غضب ناک ہو کر۔"۳۰ "دی ڈیلی ٹیلیگراف" نے اعلان کیا کہ "سخت انتقام اور عبرت ناک سزا کی ضرورت کی ہر طرف سے حمایت ہو رہی تھی۔"۳۱ "دی مارننگ پوسٹ" نے اعلان کیا کہ "ہر انگریز نے جو اپنے سینے میں مرد کا دل رکھتا ہے، اپنے وطن کے ساتھ یہ پیمان باندھا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت اگر کسی اور وجہ سے نہیں تو کم از کم اس مقصد کے لیے تو ضرور قائم رہے گی کہ اُن مسلمان اور برہمن شیطانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جائے جنھوں نے انگریز خواتین اور دوشیزاؤں پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے ہیں۔"۳۲ انتہا پسند "نیو کاسل کرانیکل" نے، جو اب مالک، جوزف کوون کے شہنشاہیت پرستی کے بڑھتے ہوئے جوش کی عکاسی کرتا ہے، برطانوی تاج کے تحت اس شاندار نوآبادی کا ذکر کیا اور کیننگ کی رحم دلی پر یوں نکتہ چینی کی: "اب رحم کھانے کا وقت نہیں ہے، ہمارا انتقام ایسا تیز، خونریز اور اس قسم کا ہونا چاہیے کہ مستقبل میں دہلی کے ذکر پر ہی ہماری ہندوستانی رعایا کانپ اُٹھے۔ اُن کو اس طرح نیست و نابود کرنا چاہیے کہ گویا جنگلی جانور ہیں۔"۳۳

برطانیہ کے دولت مند طبقے سے متعلق ایک آخری نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ یعنی شہنشاہیت پرستانہ نظریہ جس نے اختلافات پر اپنا رنگ چڑھایا جیسا کہ سابقہ اقتباسات سے ظاہر ہے۔

یہ خیریت گزری کہ بغاوت جنگِ کریمیا یا ایران پر فوج کشی کے ساتھ ساتھ رونما نہیں ہوئی "دی ٹائمز" نے لکھا: "اگر بغاوت ہونی ہی تھی تو اس کا اس سے بہتر موقع نہ ہو سکتا تھا۔" پھر اس نے لکھا: "اب سوال فقط یہ ہے کہ ہندوستانیوں پر کون حکومت کرے گا کیوں کہ وہ اپنے آپ پر حکومت کرنے کے کبھی بھی قابل نہ ہوں گے۔" اس نے بتایا کہ "جنگِ برما کے بعد سے کہیں بھی ہمارے اقتدار کو زک نہیں پہنچی۔ اودھ کا امن کے ساتھ الحاق کر لیا گیا ہے۔ پنجاب ہمارے تحت ایک صوبہ بن گیا ہے بلکہ پیگو بھی ایک نفع کا سودا ثابت ہونے لگا ہے۔"۳۴ لارڈ شیفٹسبری نے بھی یہ رائے ظاہر کی کہ "بغاوت سازگار وقت پر ہوئی۔" اس نے اپنا بیان ان الفاظ کے ساتھ ختم کیا "اس میں خدا تعالیٰ کا ہاتھ تھا۔ ان تمام واقعات سے ثابت ہو گیا ہے کہ خدا نے یہ کام ہمیں بحیثیت قوم سپرد کیا

فرقوں پر ہماری ابتدائی جارحیت کی وجہ سے آئندہ سرزد ہوں گی، اُن سب کا خمیازہ ہمیں یا ہماری اولاد کو بھگتنا پڑے گا۔ شورش کے شروع میں ہمارے افسروں نے جو خطوط لکھے اُن کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہر ماتحت کو بھی اختیار حاصل تھا کہ وہ جتنے ہندوستانیوں کو چاہے پھانسی دے دے یا گولی مار دے۔ وہ اس خونریزی کا ذکر اس حقارت کے ساتھ کرتے تھے گویا جنگلی جانوروں کے شکار کا ذکر کر رہے ہوں۔"[۲۲] لیکن یہ نجی خیالات تھے۔ کابڈن اور برائٹ دونوں کو ۱۸۵۷ء کے عام انتخابات میں شکست ہوئی تھی۔ کابڈن اس سال کے بیشتر عرصے کے دوران بیمار رہا اور اس نے بغاوت سے متعلق علانیہ کوئی بات نہ کی۔ جان برائٹ نے جو برمنگھم میں پارلیمنٹ کا ضمنی انتخاب لڑ رہا تھا اعلان کیا، "ہندوستانی بغاوت کی کامیابی سے ہندوستان میں افراتفری پیدا ہو گی اور میرا خیال ہے کہ اس بغاوت کو دبانا ہندوستان پر رحم کرنا ہے۔"[۲۳]

ایف۔ ڈی۔ مارس نے ایک مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا، "ایسی درگزر جو جرم سے نفرت نہ ظاہر کرتی ہو، جو اس کے انسداد کی کوشش نہ کرتی ہو، جو جرم کی سزا دینے سے کتراتی ہو وہ زبانی نہیں ابلیسانہ معافی ہے۔"[۲۴] ڈسرائیلی کو شک تھا (لیکن اس نے اپنے شکوک کو لیڈی لنڈن ڈیری کے گوش گزار کرنے کے لیے محفوظ رکھا) کہ ان "مظالم کی بہت سی تفصیلات جن سے ملک کے جذبات مجروح ہوئے تھے، من گھڑت کہانیاں ہیں۔"[۲۵] جو ڈکنس نے "دی ٹائمز" کے نام ایک طویل خط لکھا جس میں اُس نے اس نظریے سے اتفاق ظاہر کیا کہ سراسر ایک ہندو بغاوت تھی اور "بے حرمتی اور ایذا رسانی کی بیشتر کہانیاں محض فرضی قصے ہیں۔"[۲۶] لیکن اس رائے کا اظہار انتقامی کارروائیوں کے شروع ہونے کے بعد ہوا اور اس رائے کو ان برعکس اطلاعات کی روشنی میں دیکھنا چاہیے جو اس اخبار میں نمایاں طور پر شایع ہوئیں اور جن میں سے ایک میں تو بے حد تہمت تراشی سے کام لیا گیا، "میرے قبضے میں بہت سے خطوط ہیں جن سے اور بھی شدید تر مظالم کی مثالوں کا پتہ چلتا ہے لیکن مظلوم یا ان کے متعلقین ان کے ناموں اور حالات کے اظہار سے ہچکچاتے ہیں۔"[۲۷] "دی ٹائمز" اداریہ کے اعتبار سے اُن اخبارات میں پیش پیش تھا جنھوں نے "عبرتناک سزا" کا مطالبہ کیا، ایسی عبرت جس کا چرچا برطانوی ہندوستان کے دیہات میں آنے والی پشتوں تک رہے۔"[۲۸] انتہا پسند "مارننگ سٹار" نے کج روی اختیار کی جس میں برائٹ کی انتخابی مصروفیتوں اور مانچسٹر کی تجارتی توقعات کی عکاسی تھی۔ اس نے کیننگ پر حملہ کیا۔ اس کی "رحمدلی" کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی بغاوت سے پہلے کی پالیسیوں کی بنا پر۔ لیکن اس نے انتقامی کارروائی کی مخالفت کی۔ اُس نے ایک خط شایع کیا جس میں اُس نے دہلی کو تین دن

سے کیا جائے کہ مخالفت کا سوال بھی نہ پیدا ہو سکے۔"[45] ملکہ کے شوہر کی بھی رائے یہی تھی، "جس چیز کو سوچ کر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں وہ اُن لوگوں پر گولی چلانے کا خیال ہے جو ہماری ہی وردی پہنے ہوئے ہیں۔ بہرحال ممکن ہے نتیجہ اچھا نکلے۔ اب ہم یقیناً ایک معقول فوجی نظام قائم کریں گے۔"[46] بین الاقوامی صورتِ حال پر بغاوت کا کیا اثر مرتب ہوا؟ اس پر فکرمندی کے ساتھ بحث کی گئی۔ کیا نپولین سوم برطانیہ کی پشت میں چھرا بھونکنے کے موقع کو غنیمت جانے گا؟ پامرسٹن نے کچھ بے دلی کے ساتھ خوشی کا اظہار کیا جب بلجیم نے بغاوت کو دبانے میں مدد دینے کے لیے ایک فوجی دستہ بھیجنے کی پیش کش کی اور نیویارک سے جہاں ہیولاک کی موت پر جھنڈے نگوں کر دیے گئے یہ اطلاعات پہنچیں کہ اس مقصد کے لیے پچاس ہزار مجاہد آسانی کے ساتھ بھرتی کیے جا سکتے ہیں۔"[47]

غرضیکہ یہ ظاہر ہے کہ برطانوی مزدور طبقہ تو درکنار دولت مند طبقے پر بھی ردِ عمل کی مختلف صورتیں تھیں۔

البتہ ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ ہمیں اس سلسلے میں کثیر دستاویزات، دیہاتی گھروں اور پادریوں کے مکانات سے اس قسم کے خطوط، سیاسی روزنامچے، پارلیمنٹری تقریریں اور فاضلانہ اداراتی مضامین حاصل ہو سکتے ہیں۔ غالباً ہمیں کبھی بھی یہ معلوم نہ ہوگا کہ ان جگہوں پر کیا گفتگو ہوتی تھی جہاں انگلستان کے مزدور اکٹھے ہوتے اور روزمرہ کے واقعات پر بحث کرتے تھے۔ کوئی دستاویزات دستیاب نہیں ہیں۔ شاید ان کا وجود ہی نہیں ہے۔ البتہ ردِ عمل کے آثار پائے جاتے ہیں اور ممکن ہے کہ مزید تحقیق سے نئی باتوں کا انکشاف ہو۔

۱۸۵۷ء میں برطانوی تجارت کی توسیع کے زیرِ اثر منشوریت کی مجاہدانہ تحریک ڈھیلی پڑ رہی تھی۔ سوشلزم جس نے برطانوی مزدور طبقے میں جنم لیا تھا، عارضی طور پر کمزور ہو گئی تھی۔ اینگلز نے ۱۸۸۵ء میں لکھا: "۱۸۴۸ء کے فرانسیسی انقلاب نے انگلستان کے متوسط طبقے کو بچا لیا۔ فتحیاب فرانسیسی مزدوروں کے اشتراکی اعلانات سے انگلستان کا نچلا متوسط طبقہ ڈر گیا اور برطانوی مزدور طبقے کی محدود مگر حقیقی تحریک کا شیرازہ بکھر گیا۔ منشوریت کی تحریک ۱۰ اپریل ۱۸۴۸ء کو خارجی طور پر ناکام ہونے سے پہلے ہی داخلی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ مزدور طبقے کی سرگرمی کو پسِ پشت ڈال دیا گیا۔ سرمایہ دار طبقے کی ہر محاذ پر جیت ہوئی۔[48] اس کے بعد وہ پچیس سالہ دور شروع ہوا جس میں انگلستان دنیا بھر کا "صنعتی مرکز" بنا رہا اور اس کے اقتدار کو چنوتی دینے والا کوئی نہ تھا۔

---

(۱) گرینول۔ اندراج ۲ر اکتوبر ۱۸۵۷ء: فی الحال ہماری حالت ایک بے وقعت قوم کی سی ہو گئی ہے۔)

ہے کہ ہم اُن لاکھوں انسانوں کی تہذیب کو ترقی دیں اور خدا کے مولودِ مسعود (حضرت عیسیٰ) کے دین کی اشاعت کا کام کریں۔"۳۵ لارڈ برآم نے "سخت سزا"۳۶ کا مطالبہ کیا۔ لارڈ گرے کی ریفارم کیبنٹ کا رکن ہونے کے بعد سر جیمز گراہم نے اب قدامت پسندانہ خیالات اپنا لیے تھے۔ اس نے اعلان کیا کہ "سلطنت کھو دینے سے ہمارا زوال شروع ہو جائے گا۔ اس کے قائم رہنے سے یہ ثابت ہوگا کہ ہم ابھی تنزل کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔"۳۷ "دی ڈیلی ٹیلیگراف" نے لکھا: "بزدلانہ خیالات اور افسردہ جذبات کسی سلطنت کی مجالسِ شوریٰ میں دخل نہیں پاتے جب تک زوال کا دور نہ آ جائے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسا دور ابھی نہیں آیا۔"۳۸ "دی نان کنفارمسٹ"۔ جو "برطانیہ صغرا" کے نظریہ کی عکاسی کرتا تھا، اُس کا یہ خیال تھا کہ شاید یہ بغاوت چین کی معرکہ آرائیوں میں ہماری بے جا مداخلت اور ایک انگریز وزیر کو ایران کے ساتھ جنگ چھیڑنے کی اجازت دینے کی پاداش ہے۔"۳۹ "دی نیو کاسل کرانیکل" نے ریکے اور ڈریک کا ذکر چھیڑا اور امید ظاہر کی کہ "خوش حالی اور عیش و عشرت کی صدیوں نے انگریزوں کو بے باکی اور مردانہ جرأت کی اس سپرٹ سے محروم نہیں کیا جس سے عہدِ الزبیتھ کے انگریز مشہور ہوئے۔"۴۰ ناول نگار تھیکرے نے اپنی خاندانی دولت جو اُسے ہندوستان سے حاصل ہوئی تھی، جوئے میں گنوا دی۔ جب وہ پارلیمنٹ کا رکن منتخب ہونے کے لیے آکسفورڈ کے ووٹروں کی حمایت حاصل کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا، اس وقت اس نے بغاوت کو دبانے کے موضوع کو اپنے پروگرام کا حصہ بنایا۔"۴۱ ڈسرائیلی نے برطانوی تاج اور ہندوستان کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے کی وکالت میں اپنی تمام فصاحت و بلاغت صرف کر دی۔ اُس نے دور اندیشی سے یہ بھانپ لیا کہ ان علاقوں پر صرف جبر کے ساتھ حکومت کرنا ممکن نہیں بلکہ منصبِ شاہی کی عظمت اور تقدیس بڑھانے کی ضرورت ہے تاکہ ہندوستان کے ساتھ برطانیہ کا ارتباط برقرار رہے۔"۴۲ ملکہ وکٹوریہ کو اس بات کا احساس ہوا کہ "مجموعی صورتِ حال کریمیا کی نسبت زیادہ تشویش ناک ہے جہاں جنگ شرافت کے ساتھ لڑی گئی اور جہاں عورتیں اور بچے محفوظ تھے۔"۴۳ اس نے اس موقع کو غنیمت جان کر مسلح افواج میں اضافہ کی تاکید کی۔ اس نے لکھا: "پچھلے بیس برسوں میں سلطنت کی وسعت تقریباً دوگنی ہو گئی ہے لیکن ملکہ کی فوجوں کی تعداد اسی قدیم پیمانے پر قائم ہے۔"۴۴ کیننگ کے خط سے اس کا ارادہ اور بھی پختہ ہو گیا: "انگلستان کے اقتدار کو سخت دھکا لگا ہے اور اس کے اقتدار میں اعتماد اسی صورت میں بحال ہو سکتا ہے کہ ساری ہندوستانی سلطنت میں قوت کا طویل اور متواتر مظاہرہ ایسی انگریزی فوج کی موجودگی

ہاتھوں میں محفوظ رکھ سکتے ہیں جب تک ہم غارت گری، الحاق اور مظالم کی پالیسی کو : بدلیں، مستقبل میں ہندوستانیوں کو رحم و انصاف کی ضمانت نہ پیش کریں اور اُن کی موجودہ ناامیدی اور غم و غصہ کو نہ رفع کریں۔ ہندوستان برطانوی تجارت اور صنعت و حرفت کے لیے ایک وسیع میدان ثابت ہو سکتا ہے بشرطیکہ انگلستان اور ہندوستانی باشندے اسے ایسا بنائے رکھیں۔ اس لیے انگریزوں کو اس بات کا دھیان رکھنا چاہیے کہ ہم اپنی بدنظمی اور طبقہ امرا کی حماقت کی وجہ سے مشرق کے اس سنہری باغ کو اپنے قبضے میں رکھنے کا سنہری موقع نہ کھو دیں۔"۵۲

ارنسٹ جونز ۵۳ کو مدت سے ہندوستان میں دل چسپی تھی۔ ۱۸۵۳ء ۵۴ میں اس نے اخباری مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ ۱۸۵۱ء میں جب وہ جیل میں تھا، اُس نے ایک طویل نظم بعنوان "ہندوستان یا نئی دنیا کی بغاوت" لکھی تھی۔ جب شورش بپا ہوئی تو یہ نظم دوبارہ شایع ہوئی۔ اس کے دیباچے میں جونز نے شہنشاہی نعرے میں مشہور ترمیم کی۔ شہنشاہی نعرہ یہ تھا: "برطانوی سلطنت پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا۔" اُس نے اس میں یہ تبدیلی کی: "اس کی نوآبادیوں پر آفتاب کبھی غروب نہیں ہوتا لیکن خون بھی کبھی خشک نہیں ہوتا۔"

اب جونز منشوریوں کی مجاہدانہ روایت کو برقرار رکھنے میں اکیلا رہ گیا۔ ایسا دکھائی دیتا تھا کہ وہ جد و جہد کو ترک کر دے گا اور دولت مند طبقے کے ساتھ مصالحت کرے گا۔ ہندوستانی لوگوں کے حق میں اس کا آخری جہاد اُس کی انقلابی زندگی کا شاندار نقطۂ عروج تھا۔

۴ جولائی کو جونز نے اپنی مہم کا آغاز کیا۔ اس نے اعلان کیا کہ "انصاف اور مصالحت کی پالیسی سے ہندوستانیوں تک آخری شورش کافی مدت کے لیے ملتوی ہو سکتی تھی۔" اس نے تنبیہ کی "انگلستان کے مزدورو! تمھیں ایسی انتہائی غیر منصف اور غاصب سلطنت کے قیام کے لیے خون بہانا پڑے گا اور اس کا بار اٹھانا پڑے گا جس سے زیادہ سیاہ دھبہ انسانی تاریخ کے ماتھے پر دوسرا نہ ملے گا۔ ہموطنو! تم کو جاننا چاہیے کہ ہندو اس حق کے لیے لڑ رہے ہیں جو تمام بنی نوع انسان کی نگاہ میں مقدس ترین حق ہے۔ پولینڈ، ہنگری، اٹلی اور آئرلینڈ کے لوگوں کا نصب العین اس سے زیادہ مقدس اور منصفانہ نہیں تھا۔ دنیا کی ایک انتہائی عظیم الشان تحریک کو دبانے میں تم سے خون اور خزانہ صرف کرنے کا تقاضہ کیا جائے گا۔ ہموطنو! تمھیں دوسروں کی آزادی سلب کرنے میں مدد دینے کے بجائے کوئی بہتر کام انجام دینا چاہیے یعنی اپنی آزادی کے لیے جد و جہد کرنی چاہیے۔"

۱۱ جولائی کو اس نے پُرامید ہو کر حکمراں طبقے میں خوف کے آثار کی طرف اشارہ کیا۔ "دی ٹائمز"

چوں کہ ہندوستانی بغاوت اسی پچیس سالہ دور میں رونما ہوئی اس لیے برطانوی مزدور طبقے میں کسی اجتماعی ردِ عمل کی توقع نہ ہوسکتی تھی بلکہ اس کا تھوڑا سا جو ردِ عمل ہوا وہی حیرت کی بات ہے۔

"رینلڈز نیوز پیپر" مزدور طبقے کے غیر سوشلسٹ نظریے کا ترجمان تھا۔ اس نے فوراً باغیوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ ۵ جولائی ۱۸۵۷ء کو اس نے "اس ہولناک انتقام کا ذکر کیا جو (اگر دنیا میں کہیں انصاف باقی ہے) برطانوی حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے بے مثال جرائم کی پاداش میں نازل ہوگا۔" اس نے اعلان کیا، "گو ہم باغی رجمنٹوں کے مظالم کی مذمت کرتے ہیں لیکن ہماری ہمدردی طاقتور کے مقابلے میں کمزور کے ساتھ، ظالم کے خلاف جدو جہد کرنے والے مظلوموں کے ساتھ، اذیت، غارت، غلامی اور توہین کے شکار اُن ہندوستانیوں کے ساتھ ہے اور ہمیشہ رہی ہے جو اپنے ظالم، بے درد، غارت گر اور عیار آقا کے آہنی جوئے سے رہا ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری ہمدردی باغیوں کے ساتھ ہے، اُن سرکش شہیدوں کے ساتھ ہے جنھیں "دی ٹائمز" اور اُس کے ساتھی گولی مار کر، پھانسی دے کر اور سولی پر چڑھا کر عبرتناک سزا دینا چاہتے ہیں۔" جب مظالم کو بڑھا چڑھا کر مشتہر کیا گیا تو اس اخبار نے لکھا: "ہم یہاں گھر میں بیٹھے تصویر کا صرف ایک رُخ دیکھ رہے ہیں۔ انگریزوں کی طرف سے حد درجہ اشتعال انگیزی ہوئی ہے۔"[۴۹] اُس نے ہندوستان کے واقعات کو برطانیہ میں آزادی کے خاتمے کے ساتھ وابستہ کیا۔[۵۰] جب روزے کے دن شعبدے کا مظاہرہ ہوا تو اس اخبار نے "جنگجو اور مطلب پرست چرچ" کے رویّے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے لکھا: "اکثر اشخاص اپنے خطبات میں آمادہ بہ جنگ اور انتقام جو ثابت ہوئے۔ وہ خون کے پیاسے اور روپیہ کے بھوکے تھے مگر رحم سے متعلق انھوں نے چُپ سادھ لی۔" نان کنفارمسٹ جادو بیان "مونٹ بنک سپرجن" کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔ اس نے کرسٹل پیلیس میں اُس بیس ہزار کے مجمع کے سامنے تقریر کی جس نے اس تماشے کے لیے پیسے خرچ کیے تھے۔ "سپرجن نے 'خون کے بدلے خون' کی تلقین کی اور مجمع کے جذبات کو بھڑکانے کے لیے اس نے حقیقت کو مسخ اور تاریخ کو نظر انداز کیا۔ اس نے انھیں بتایا کہ "سپاہی محبِ وطن نہیں باغی ہیں کیوں کہ انھوں نے برضا و رغبت انگریزوں کی غلامی قبول کی تھی۔" بے شک! وہ اسی طرح اپنی آزادی سے دست بردار ہوئے جس طرح ایک مسافر اپنے بٹوے سے دست بردار ہوتا ہے جب ڈاکو اُسے پستول دکھاتا ہے۔"[۵۱] یہ مذمت قطعی تھی لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رینلڈ کا اخبار اب شہنشاہیت پرستی کا شکار ہونے لگا تھا۔ اُسے صرف یہ فکر تھی کہ برطانوی نظام میں اصلاح کر کے ہندوستان پر قبضہ برقرار رکھا جائے۔ "ہم اس وقت تک ہندوستان کو نہ چپ رکھ سکتے ہیں اور نہ اپنے

بھی نہیں کہا۔" اُس نے ہندوستان کی بدنظمی کا تمام تر الزام ایسٹ انڈیا کمپنی پر رکھنے کے منصوبے سے آگاہ کیا۔ "کمپنی کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ہوم گورنمنٹ (برطانوی حکومت) قائم کرنا گویا ایک لٹیرے کو ہٹا کر دوسرا لٹیرا مسلط کرنا ہے۔" اس نے پھر اعلان کیا کہ " ہندو حق بجانب ہے، ہندو کا مقصد نیک ہے۔ خدا ہندو کے مفاد کی حفاظت کرے!" اس نے وہ تمام انتقامات گنوائے جو "ٹائمز" نے بیان کیے تھے اور یہ رائے پیش کی: "یہ عیسائیت اور تہذیب کا نمونہ ہے! اس کے بعد ہندوستانیوں کے مظالم کا ذکر ہم کس منھ سے کرتے ہیں"۔

"پیپلز پیپر" کے اسی پرچے میں بغاوت سے متعلق مزدوروں کے رویے کی بھی دل چسپ عکاسی تھی۔ "تقریباً دو سو بے کمیشن افسر اور سپاہی چیتھم اور راچسٹر کے شہروں میں مارچ کرتے ہوئے دکھائی دیے اور بہت سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا کیوں کہ یہ خوش وضع جوانوں کا دستہ تھا۔ یہ حال ہی میں ہندوستان سے لوٹے ہیں۔ یہ دس سال کی ملازمت کے معاہدے کے تحت بھرتی ہوئے تھے۔ چنانچہ اس مدت کے ختم ہوتے ہی انھوں نے سبکدوشی حاصل کر لی۔ دو پونڈ کے عطیے اور نئی وردی کی ترغیب کے باوجود انھوں نے مزید ملازمت سے انکار کر دیا۔"

۲۹ر اگست کو جونز نے فوجی صورت حال کا ایک اور جائزہ لیا۔ اُسے اب بھی امید تھی کہ بغاوت کامیاب ہو گی۔ اس نے "اس سماج کی حد درجہ مصنوعی حالت پر جد و جہد کے اثرات بیان کیے جس کا مدار ساکھ پر ہے، جب کہ ساکھ کا مدار امن وامان پر ہے۔" دوسری قومیں برطانیہ کی تجارتی برتری کو خطرے میں ڈال دیں گی جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ مزدور طبقے کو خوراک کی گرانی، قلیل اُجرت اور تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

۵ر ستمبر کو اس نے پھر اس بیان کو دہرایا کہ، "بغاوت اتنی انصاف پر مبنی، اتنی برتر اور اتنی ضروری ہے کہ اس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ حیرت اس بات کی نہیں کہ سترہ کروڑ لوگوں نے تھوڑے تھوڑے حصوں میں بغاوت کی بلکہ حیرت اس بات کی ہے کہ انھوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ ہتھیار نہ ڈالتے اگر اُن کے اپنے ہی حکمراں اُن سے غداری نہ کرتے۔ وہ یکے بعد دیگرے غیر کے ہاتھوں بک گئے۔ چنانچہ بادشاہ، والیانِ ریاست اور امرا ہمیشہ اسی ملک کے بدخواہ اور اس کے لیے باعثِ لعنت ثابت ہوئے جس کا انھوں نے ہر دور میں نمک کھایا۔" اُس نے اِس بات پر زور دیا کہ انگریز مزدور طبقے کو "ہندو بھائیوں کے ساتھ ہمدردی ہونا چاہیے۔ ان کا مفاد تمہارا مفاد ہے اور ان کی کامیابی بالواسطہ طور پر تمہاری بھی کامیابی ہے"۔

۱۲ر ستمبر کو اس نے قلتِ وقت کی طرف اشارہ کیا جو ہندوستان میں رونما ہونے والے

کے "سٹی پیج" (city Page) میں ایک دہشتناک رائے کا اظہار تھا: "انگلستان کے بنک میں سونے چاندی کے ذخیرے میں مسلسل اضافے اور اچھی فصل کی توقع کے باوجود جو سرد بازاری صرافہ میں چھائی ہوئی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہندوستان سے متعلق تشویش دوسرے تمام امور پر غالب ہے اور اگر کسی سمجھوتے سے پہلے کل کوئی المناک خبر آجائے تو اس سے غالباً خوف و ہراس پھیل جائے گا۔" اس نے ملکہ وکٹوریہ کی طرف سے بیگم اودھ کے خیر مقدم پر بھی توجہ مبذول کی "اس سے پہلے باریابی کی اجازت کیوں نہیں دی گئی؟ کیا اس لیے کہ بیگم اودھ ایسی خفیف لغزش کی مرتکب ہوئی تھی جس سے بکنگھم پیلس کے اخلاقی معیار کو صدمہ پہنچا تھا۔ اب تخت سے معزول بیگم کا استقبال ہو رہا ہے۔ معیارِ اخلاق بالائے طاق رکھ دیے گئے۔ بادشاہی فقیری کے ساتھ بے تکلف ہونے لگی۔ معاملے کی اصلیت یہ ہے: رشوت خوروں نے ایک شاہی خاندان کو اس کی میراث سے محروم کر دیا تھا (مالِ حرام بود بجائے حرام رفت) اور رشوت خوروں کے ملک کی ملکہ معظمہ نے ہندوستانی بیگم کی طرف سے منھ موڑ لیا۔ اب اس کا بہت احتمال ہے کہ رشوت خوروں کا مالِ غنیمت چھن جائے۔ اس لیے ملکہ کو در بدر پھرنے والی بیگم کی دلجوئی کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے کیوں کہ لٹیروں کو امید ہے کہ اُسے آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے۔"

یکم اگست کو جونز نے لکھا: "جیسا کہ ہم اپنے قارئین کو شروع ہی سے یقین دلا چکے ہیں' یہ بغاوت فوجی غدر نہیں بلکہ قومی بغاوت ہے۔" اس نے پھر پُرامید انداز میں لکھا کہ "اس سے باقاعدہ تیاری کے آثار ظاہر ہیں۔ کیا یہ محض کسی حکمراں کے ساتھ جنگ ہے جو ہم بہت بار لڑ چکے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ یہ ایک قوم کے ساتھ جنگ ہے اور اس میں اتنے لوگ شامل ہیں جتنے کہ ہندوستان کے اندر کبھی ہمارے خلاف جنگ میں شامل نہ ہوئے تھے۔" اُس نے ان اشتعال انگیز خیالات میں اس تنبیہہ کی آڑ لی کہ "باغیوں میں پھوٹ پڑنے کا امکان ہے اور ان سے غیر متوقع احمقانہ حرکت سرزد ہو سکتی ہے۔ ایک بات کا ہمیں یقین ہے خواہ بغاوت دب جائے یا نہ دبے، یہ ہمارے ہاتھ سے ہندوستان کے نکلنے کا پیش خیمہ ہے۔ ہمارا مشورہ یہ ہے، ہندوستانی قوم کی آزادی کو تسلیم کرو۔ سو سال ہوئے دنیا کی پھیری لگانے والے، لیڈن ہال اسٹریٹ کے تاجر لٹیروں کی ایک جماعت حیلے بہانے بنا کر چپکے سے سلطنتوں کے اس عظیم جمگھٹ میں وارد ہوئی اور اس کا ہیرا (یعنی آزادی) چُرا لیا۔ اس سو سالہ عہدِ حکومت میں جرائم کے ہزاروں سال سمٹے ہوئے ہیں۔" اس نے تسلیم کیا کہ باغیوں نے بھی مظالم ڈھائے ہوں گے لیکن اس نے انگریزوں کی اشتعال انگیزی کا خاص طور سے ذکر کیا اور جنگِ جزیرہ نما (Peninsular War) کے دوران برطانوی فوج کے قتلِ عام کی یاد دلائی۔ کیا اس وقت "ٹائمز" نے اس کی مذمت کی؟ نہیں، ایک لفظ

کا دن کیا ہے ؟ اس کی وقعت محض ایک عیارانہ مذہبی رسم سے زیادہ نہیں۔ اس کا مقصد غریبوں کی الماریوں کو خالی کرنا اور اُن کے پیٹ پر پتھر باندھنا ہے ۔"

اُس نے ریلوے کمپنی کے اس اعلان پر تبصرہ کیا کہ "تفریحی گاڑیاں اتوار کے دن کی طرح چلیں گی تاکہ لوگ حسبِ خواہش کرسٹل پیلیس میں سپرجن کا مجمع دیکھنے یا گرین وچ کی سیر کے لیے جا سکیں۔" اس پرچے میں ایک خط بھی شایع ہوا جس پر دستخط کی جگہ یہ درج تھا "وقت سب کو آزماتا ہے۔" معلوم ہوتا ہے یہ خط جونز نے لکھا تھا۔ اس میں بغاوت کے برطانوی مظلوموں کی مدد کے لیے امدادی فنڈ کا ذکر تھا۔ "میں تاکید کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اگر کوئی مزدور اس فنڈ کے لیے ایک پیسہ بھی چندہ دے گا تو یہ ایک جرم ہوگا۔ تمھیں غارت گری اور دغابازی کے اس ابلیسانہ نظام سے کوئی سروکار نہیں جسے خودغرض احمقوں اور زمین ہتھیانے والوں کی ایک جماعت نافذ کیے ہو۔ چندے کی وصولی ان لوگوں تک محدود ہونی چاہیے جن کے ہاتھوں میں ہندوستانی بر چہ زر یعنی ہندوستانی ہنڈیاں ہیں۔ ان لوگوں تک جنھوں نے ہندوستان پر فوج کشی اور ڈاکہ زنی سے ہاتھ رنگے ہیں۔" جنگ کریمیا کے مصیبت زدگان کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اس کا مقابلہ اُس نے اُس سلوک کے ساتھ کیا جو اب اینگلو انڈین لوگوں کے لیے تجویز کیا گیا ہے۔ اُس نے ان بڑی رقوم کا بھی ذکر کیا جو شاہی خاندان اور اس کی شادیوں کے لیے مہیا کی گئیں۔ "اس شاہانہ اور شاندار دولت و ثروت کا موازنہ اس فاقہ کشی کے ساتھ کرو جو اس ملک کے بدبخت اور خستہ حال تاجروں کی میراث ہے — غریب عوام۔ ذرا خیال کرو میاں بیوی کو ایک قلعے میں پھینک دیا جاتا ہے جسے یونین ہاؤس کہتے ہیں۔ جوں ہی وہ داخل ہوتے ہیں ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ نوجوان بچوں کو میلوں دور بھیج دیا جاتا ہے۔ انھیں جئی کا پتلا دلیا اور پانی سا شوربا کھلایا جاتا ہے جو انسان کے کھانے کے لائق نہیں۔ جیسا کہ پچھلے ہفتے سینٹ پنکراز کے محتاج خانے سے اطلاعات پہنچی ہیں۔" آخر میں اُس نے مزدوروں سے اپیل کی کہ وہ اپنا روپیہ سیاسی سرگرمی کے لیے محفوظ رکھیں۔ "اپنے گھر کی حالت دیکھو، اپنے مفادات پر توجہ دو۔ چندہ اکٹھا کرو اور منظم ہو جاؤ۔"

۱۹ اکتوبر کو اس نے مظالم پر بحث کرتے ہوئے اپنی رائے ظاہر کی کہ ان کے بیان میں "خوفناک مبالغہ" سے کام لیا گیا ہے۔ لیکن "اگر وہ ثابت بھی ہو جائیں تو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ انھیں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔" امریکہ کی جنگِ آزادی سے متعلق برطانوی دستاویزات کو ذرا ذہن میں لائیں۔ ہم نے امریکی ہندوستانیوں کو بھرتی کیا اور فی سر ایک رقم مقرر کی۔ جتنے مرد، عورتوں اور بچوں کے سر وہ برطانوی کیمپ میں لائیں گے اس کے مطابق انھیں رقم ادا کی

واقعات کا نتیجہ تھا اور تجارت کے مستقبل کے بارے میں مایوس کن پیشگوئیاں کیں: "بغاوت کو دبانے کے اخراجات ٹیکسوں سے پورے کیے جائیں گے یعنی انگریز مزدور طبقے کی جیبوں سے۔" اس نے سوال کیا: "کیا انگریز مزدوروں کو اس رقم کی ادائیگی میں کوئی دل چسپی ہے؟ کیا ہندوستانی حکومت سے انھیں پھوٹی کوڑی کا بھی فائدہ پہنچا ہے؟ انھیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ پھر فائدہ اٹھانے والے کون ہیں؟ امرا اور رؤسا، زمین دار اور سرمایہ دار، یعنی طبقۂ امرا کی اولاد جنھوں نے وہاں روپیہ اینٹھنے، لوٹ مار کی اور جبر و ستم کی تعلیم حاصل کی۔ کیا ہم نے ہندوستان کو کنگال نہیں کر دیا جب سے یہ انگلستان کی ملکیت بنا؟ کیا ہم نے اسے برباد نہیں کیا اور اسے گداگر بنا کے نہیں رکھ دیا؟ بیوپار کی کیا حالت ہوتی اور ہندوستان کی منڈی کی کیا صورت ہوتی اگر ہم نے خود مختار حکومتوں کے ساتھ دوستانہ ملک کی حیثیت سے تجارت کی ہوتی؟"

اس مضمون میں اس نے ظلم و ستم کی داستانوں کے سلسلے میں بھی یہ سوال کیا: "اذیت رساں کون ہیں؟" اُس نے ۱۸۵۵ء میں مدراس میں مظالم کے مبینہ سبب کی تحقیقات کرنے والے کمیشن کی شہادت کا آئرلینڈ کے ایک اخبار سے حوالہ دیا۔۔۔

۱۹ ستمبر کو اس نے اس بات کا جواب دیا کہ اس کا رویہ غلط فہمی پر مبنی ہو سکتا ہے۔ اس نے کہا: "جمہوریت میں استقامت ضروری ہے۔ خدا بلاشبہ حق اور انصاف کا طرفدار ہے اور انسان کو بے شک حق اور انصاف کا طرفدار ہونا چاہیے۔ کوئی انسان یہ نہیں کہہ سکتا: 'میں ننگری کے ساتھ ہوں اور ہندوستان کا مخالف ہوں'۔ اگر وہ یہ کہتا ہے تو وہ سراسر جھوٹ بولتا ہے۔ نہ صرف اپنے خلاف بلکہ اصول کے خلاف، سچائی کے خلاف اور عزت کے خلاف۔ اگر ہندوؤں کا ساتھ دینا ایک غیر انگریزی فعل ہے تو ظلم کوشی، سفاکی اور فوج کشی کی حمایت کرنا اس سے زیادہ غیر انگریزی حرکت ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ انگلستان بدلے بلکہ اپنی آواز، جو انگریز عوام کی آواز ہوگی دوسروں تک پہنچائے اور چیخ کر کہے کہ: 'حق حق ہے اور سچائی سچائی'؛ حق ہندوؤں کی طرف ہے۔ خدا کرے فتح بھی ان کا ساتھ دے! انگریز قوم اتنی بلند ہمت اور طاقت ور ہے کہ وہ اپنی امنگوں اور اپنے عمل میں انصاف پسند اور یکرنگ ہو سکتی ہے۔"

۴ اکتوبر کو جونز نے آنے والے روزے اور شفاعت کے قومی دن* پر طنزاً یہ لکھا: "روزے

(* حاشیہ متعلقہ روزِ شفاعت و روزہ: "یہ بارش کا سنسان دن تھا۔ جو مزدور طبقے کے لوگ روزہ رکھتے تھے وہ بھی خوشی سے نہیں بلکہ مجبوراً کیونکہ وہ اس دن اپنی روزی نہیں کما سکتے تھے۔ وہ مغموم و مجبور گلیوں میں پھرتے تھے اور ایسے کلمات نکالتے تھے جو مناجات کے عین برعکس تھا۔" نیو کاسل کرانیکل۔ ۹ اکتوبر ۱۸۵۷ء)

تھے۔ پھر وہ اپنے زرعی آلات گرو رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے بعد سختی سے وصول کرنے والی برطانوی سرکار کو واجب الادا رقوم ادا کرنے کے لیے انھیں بیجوں کا غلّہ فروخت کرنا پڑا جس سے وہ بھکاری بن گئے۔ انھیں یاد ہے کہ جب کاشتکاری ناممکن ہوگئی تو انھوں نے کھیتوں سے دست بردار ہونا چاہا کیوں کہ وہ کھیتی باڑی کے قابل نہیں تھے لیکن در اصل انھیں اس زمین کا ٹیکس بھی ادا کرنے پر مجبور کیا گیا جس میں انھوں نے کبھی بھی کاشت نہ کی تھی۔ انھیں یاد ہے کہ جب وہ اپنے دوستوں سے قرض لینے میں ناکام رہتے تو کس طرح انھیں اذیت دی جاتی۔ کس طرح انھیں دن کی جھلسنے والی گرمی میں پاؤں کے تلوؤں سے لٹکایا جاتا یا ٹانگوں کے ساتھ پتھر باندھ کر انھیں سر کے بالوں سے لٹکایا جاتا۔ کس طرح اُن کے ناخنوں کے اندر تیز لکڑی کی پچریں ٹھونکی جاتیں۔ کس طرح باپ بیٹے کو اکٹھا باندھ دیا جاتا اور ایک ساتھ انھیں کوڑے لگائے جاتے تاکہ ایک کی اذیت سے دوسرے کا درد بڑھے۔ کس طرح عورتوں کو چابک سے پیٹا جاتا اور ان کے پستانوں سے بچھو باندھ دیے جاتے۔ کس طرح اُن کی آنکھوں میں سُرخ مرچیں ٹھونسی جاتیں؟ یہ سب چیزیں انھیں یاد ہیں۔ اور یہ مدراس کی عرضداشت، کمشنروں کی سرکاری رپورٹوں اور برطانوی پارلیمنٹ میں ثابت ہو چکی ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں بھولے کہ کس طرح پولیس ان کے پیچھے لگادی گئی اس کی تنخواہ اس قدر قلیل تھی کہ وہ لوٹ مار سے اپنا گزارہ کرتی۔ ان قانون کے محافظوں کو چور بننے پر مجبور کیا گیا اور پھر برطانوی سرکار اس نظام سے چشم پوشی کرتی۔" ۱۲ جون کو اس نے لکھا: "ہمدردی کی سنہری کڑی ٹوٹ گئی ہے۔ ایسی خلیج کو خون اور فولاد نہیں پاٹ سکتے جسے حکومت کی بدنظمی، ظلم اور جبر نے پیدا کیا ہے اور جو اتنی وسیع ہے جتنا انگلستان اور اُس کی سلطنت کے درمیان فاصلہ ہے۔" ۱۹ جون کو اس نے اپنے اس دعوے کو دہرایا کہ "ساری قوم ہمارے خلاف ہے۔"

بغاوت کے آخری مرحلے کے دوران "دی پیپلز پیپر" کی مالی مشکلات بڑھتی گئیں۔ جون ۱۸۵۸ء میں اس اخبار نے دم توڑ دیا۔ اگرچہ کچھ دنوں کے لیے اس کی بجائے شایع ہونے والے اخبار "لندن نیوز" میں جونز کو پاؤں ٹیکنے کی جگہ مل گئی لیکن اس اخبار کو ہمیشہ مشکلات کا سامنا رہا۔ اس کا لہجہ کم جنگ جویانہ ہو گیا اور جلد بند ہو گیا۔ البتہ اس میں جونز کے کچھ مضامین ہندوستانی لوگوں کی حمایت میں شایع ہوتے رہے۔ اس کا آخری مضمون ۱۵ اگست ۱۸۵۸ء کو شایع ہوا جب اس نے انڈیا بل کے تحت ہندوستان کی نئی صورتِ حال پر بحث کی۔ اس بل کی رو سے انتظامِ حکومت کی ذمہ داری کمپنی سے پارلیمنٹ کو منتقل ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ پہلے ہندوستان اور رائے عامّہ کے مابین

جائے گی۔ ہم اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن بدبخت مظلوموں کو کیسی ہولناک اذیت کے ساتھ موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔ یہ قرونِ وسطیٰ کا کام نہ تھا بلکہ موجودہ دور میں کیا گیا جس کی یاد ابھی تازہ ہے۔"

اس نے یہ بھی بتایا کہ "انگریزوں نے ہندوستان میں ہلاکت کا ایسا دہشتناک طریقہ ایجاد کیا ہے جس کے تصور سے ہی انسان کانپنے لگتا ہے۔ اُن رحمدل عیسائیوں کو ایک مہذب ترکیب سوجھی ہے۔ وہ زندہ انسانوں کو توپوں کے منہ پر باندھ کر ان کے پرخچے اُڑا دیتے ہیں۔ خون کی بارش ہوتی ہے، انسانی گوشت اور انتڑیوں کے لوتھڑے ہوئے ٹکڑے تماشائیوں پر برستے ہیں۔ اس کام میں تو انھوں نے نیرو کو بھی مات کر دیا ہے۔ یہ اُس انسانی جسم کی تباہی ہے جسے اہلِ گرجا کے قول کے مطابق خداتعالیٰ نے اپنا مشابہہ بنایا۔"

۲۱ر اکتوبر کو اُس نے مظالم کے سوال پر پھر بحث کرتے ہوئے کہا: "باغی غدر کے آغاز سے انجام تک اپنے طرزِ عمل میں عین اپنے مہذب حکمرانوں کے نقشِ قدم پر چلے۔"

۱۴ر نومبر کو اس نے "ہندوسپاہ کی بہادری اور جانبازی کی دوبارہ داد دی۔" ۲۱ر نومبر کو اس نے تنبیہہ کی کہ "خونریزی کا نتیجہ خونریزی اور ظلم کا نتیجہ ظلم ہے۔" ۵ر دسمبر کو اس نے اپنے قارئین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہندوؤں کی کامرانی کی امید ترک کرنے کی کوئی وجہ نہیں لیکن اب برطانوی شہنشاہیت پر کامیاب ضرب کی توقع ماند پڑنے لگی۔ اب بغاوت کا ذکر پہلے کی نسبت کم ہونے لگا۔ ۲ر اپریل ۱۸۵۸ء کو اس نے "ہندوستانی قوم پرستی اور برطانوی جارحیت کے درمیان آخری جدوجہد" کا ذکر کیا لیکن ۱۰ر اپریل کو اس نے جو اشارہ ہندو بھائیوں کی کامیابی کی امید کی طرف کیا اُس کا تعلق فوری امکان سے نہ تھا بلکہ مستقبل کے امکان سے۔ اس نے لکھا: "وہ وقت زیادہ دور نہیں جب ہندوستان کی عظمت کی ترقی برطانوی حکومت کی غلامی سے اس کی آزادی اور کامل خود مختاری کے عین مطابق ہوگی۔" یکم مئی کو اس نے اعلان کیا کہ "بغاوت کا نتیجہ خواہ کچھ ہو ہندوستان انگلستان کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔" ۸ر مئی کو اس نے لکھا کہ اگر ہم دوبارہ ہندوستان کو فتح کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس قدر صلح جوئی سے کام لینا ہوگا جس قدر جنگ جوئی سے۔ لوگ ماضی کو یاد رکھتے ہیں اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے وہ مستقبل سے ڈرتے ہیں۔ اُنھیں یاد ہے کہ ہم نے اُنھیں زمینوں سے جبراً محروم کیا۔ انھیں یاد ہے کہ زمین کے مالکانِ مطلق کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں اور اُنھیں وہی زمینیں ہم سے پٹہ پر لینے پر مجبور کیا گیا جو زمانۂ قدیم سے معمولی لگان پر ان کی ملکیت تھیں۔ اُنھیں یہ بھی یاد ہے کہ اُن کی زمینوں پر اس قدر ٹیکس لگائے گئے جو وہ ادا کرنے کے قابل نہ

کو آزادی حاصل کرنے سے پہلے غیر ملکی غلامی کے سو سال گزارنے تھے۔ بغاوت کی صد سالہ یادگار کے اس سال اس بات کا اعادہ ضروری ہے کہ اس اذیت اور شکست کی گھڑی میں برطانوی مزدور طبقے کی آواز خاموش نہیں تھی۔

حواشی

۱۔ اندراج، یکم مئی ۱۸۵۷ء
۲۔ ۲ر دسمبر ۱۸۵۷ء
۳۔ ۷ر اکتوبر ۱۸۵۷ء
۴۔ ۸ر اکتوبر ۱۸۵۷ء
۵۔ جان مارلے: "لائف آف کابڈن" جلد دوم صفحہ ۲۰۵۔ ایش ورتھ کے نام خط مورخہ ۱۶ر اکتوبر ۱۸۵۷ء
۶۔ چارلس کنگسلے: "ہز لیٹرز اینڈ میمائرز آف ہز لائف" مرتبہ بیوی، جلد دوم صفحات ۲۵۔۲۴
کنگسلے سے مارس کے نام ۳۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء
۷۔ ۲۱ر ستمبر ۱۸۵۷ء
۸۔ ایضاً
۹۔ ایف۔ ڈی۔ مارس: "دی انڈین کرائسس"، پانچ وعظ صفحہ ۱۰
۱۰۔ جے۔ ایم۔ لڈلو "تھاٹس آن دی پالیسی آف دی کراؤن ٹو وارڈس انڈیا" ۱۸۵۹ء صفحہ viii
۱۱۔ مارلے، بحوالہ تصنیف
ایس میکوبان: "انگلش ریڈیکلزم" جلد دوم صفحہ ۳۶۶
۱۳۔ ۲۲ر اگست ۱۸۵۷ء
۱۴۔ ۷ر اکتوبر ۱۸۵۷ء
۱۵۔ ۹ر اکتوبر ۱۸۵۷ء
۱۶۔ ۱۶ر ستمبر ۱۸۵۷ء
۱۷۔ "گریول ڈائری" مرتبہ فلپ وٹ ویل ولسن جلد دوم صفحہ ۵۶۳
۱۸۔ ومبورن، ۲۰ر اکتوبر ۱۸۵۷ء
۱۹۔ "دی ٹائمز"، ۷ر جنوری ۱۸۵۷ء، ۲۰ر فروری ۱۸۵۸ء

کمپنی حائل تھی۔" اب کم از کم مفروضہ طور پر اور عملاً بھی سب کچھ بدل گیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر رائے عامہ کو سوجھ بوجھ اور مستعدی کے ساتھ استعمال کیا جائے تو ہندوستان کے معاملات میں پہلے کی نسبت یہ زیادہ موثر ہوسکتی ہے لیکن کیا ایسا ہوگا؟ کیا یہ عظیم قوم اس ذمہ داری کی وقعت کو سمجھے گی اور اس کی قدر کرے گی جو اس نے قبول کی ہے؟ اب محتاط مطالعے اور مستقل نگرانی کی ضرورت پڑے گی۔ پہلا قدم اس سفاکانہ اور اندھادھند سختی کو روکنا تھا جو ہندوستانیوں پر روا رکھی جاتی تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ اُن انگریز باشندوں کو روکنا چاہیے جو وہاں آباد نہیں ہوتے بلکہ صرف اس لیے جاتے ہیں کہ غریب لوگوں سے جو کچھ ممکن ہو اینٹھ لیں۔"

جونز نے نہ صرف مضامین لکھے بلکہ جلسوں سے بھی خطاب کیا۔ ۱۲ اگست ۱۸۵۷ء کو اس نے "اتنے بھاری جلسے میں تقریر کی کہ شاید ہی کبھی سینٹ جارج ہال، لندن میں منعقد ہوا ہو۔"[۵۵] دسمبر میں اس نے سینٹ مارٹن ہال میں تقریر کی۔ اس نے کہا: "ایک لمحہ کے لیے بھی آپ یہ سمجھیں کہ میں اس طریق کو تسلیم کرتا ہوں جس سے ہندوستان کی حکومت حاصل کی گئی یا اُن ہتھکنڈوں کو جن سے اسے قائم رکھا گیا۔ میں اُسے ایک مہذب ملک کی تاریخ میں شروع سے آخر تک ایک قبیح ترین جرم تصور کرتا ہوں۔"[۵۶] جنوری ۱۸۵۸ء میں اس نے لندن ٹیورن میں منعقدہ ایک جلسے میں تقریر کی جہاں لوگوں نے پُرانے چارٹسٹ جان فراسٹ کی تقریر سننے سے انکار کردیا۔ اس (جونز) نے کہا: "اگر وہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے اختیارات چھین کر سرکارِ برطانیہ کے حوالے کریں گے تو وہ یہ اختیارات بدتر افراد کے ہاتھوں کے سپرد کریں گے۔"[۵۷] اس نے اپریل ۱۸۵۸ء میں برمنگھم میں بھی تقریر کی[۵۸] کوپن ہیگن فیلڈز یعنی مقامِ موجودہ سمتھ فیلڈ میٹ مارکیٹ میں کھلے جلسے منعقد ہوئے جن سے متعلق ایک یادداشت میں قلمبند ہے: "میں لندن کے ایک دور دراز حصے سے چل کر گلیوں میں میلوں کی مسافت طے کرتا ہوا اس کی تقریر سننے وہاں پہنچا۔ یہ ہندوستانی غدر کے دنوں کا واقعہ تھا۔ پُرانا جوش اور پُرانی فصاحت ابھی نمایاں تھی۔ لیکن اس کا چہرہ پژمردہ اور کپڑے تار تار تھے جن سے اس کا رنج والم ظاہر تھا۔ پھٹا پرانا کوٹ گلے تک بٹنوں سے بند اس کی مفلسی کا پردہ دار تھا۔ وہ ایک کھوئے ہوئے مقصد کے ساتھ اپنی وفادارانہ وابستگی کے سبب اس ناداری کی نوبت کو پہنچا تھا۔"[۵۹]

یہ بازی ہاری ہوئی نہیں تھی، ہار صرف عارضی تھی۔ برطانوی مزدور طبقے کو اپنے اُن آقاؤں کے ساتھ تعاون کے ایک دور سے گزرنا تھا اور ان کے دسترخوان پر آراستہ لذیذ اور نفیس کھانوں کے گرے ہوئے ٹکڑوں کو چننا تھا جنھوں نے آدھی دنیا کو لوٹا تھا۔ ہندوستانیوں

۴۵۔ لارڈ کیننگ سے بنام ملکہ وکٹوریہ، ۴ر جولائی ۱۸۵۷ء

۴۶۔ پرنس البرٹ سے بنام پرنس ولیم آف پرشیا، ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء

۴۷۔ "دی ٹائمز" ۱۹ر اگست ۱۸۵۷ء

۴۸۔ "لنڈن کامن ویل" یکم مارچ ۱۸۵۷ء

۴۹۔ ۲۶ر جولائی ۱۸۵۷ء

۵۰۔ ۶ر دسمبر ۱۸۵۷ء

۵۱۔ ۱۱ر اکتوبر ۱۸۵۷ء

۵۲۔ ایضاً

۵۳۔ ملاحظہ فرمائیں "ارنسٹ جونز: چارٹسٹ" انتخاب تحاریر و تقاریر جونز مع تعارف و حواشی۔ مرتبہ جان سیول۔

۵۴۔ "پیپلز پیپر" ۷ر، ۱۴ر، ۲۱ر، ۲۸ر مئی، ۱۱ر، ۱۸ر جون، ۲ر جولائی ۱۸۵۷ء

۵۵۔ ایضاً ۵ر اگست ۱۸۵۷ء

۵۶۔ ایضاً ۱۹ر دسمبر ۱۸۵۷ء

۵۷۔ ایضاً ۲۲ر جنوری ۱۸۵۷ء

۵۸۔ ایضاً ۱۰ر اپریل ۱۸۵۸ء

۵۹۔ ڈبلیو۔ ای۔ ایڈمس، "میمائرز" جلد دوم صفحہ ۲۲۰۔ منقول "تصنیف سید"

۲۰۔ ڈیرک ہڈسن : "مارٹن پٹر ۔ ہز رائز اینڈ فال" صفحہ ۱۹۵
۲۱۔ ایضاً صفحہ ۱۸۶ شیفٹسبری سے پٹر کے نام ۱۰ ؍ نومبر ۱۸۵۶ء
۲۲۔ مارلے : بحوالہ تصنیف صفحہ ۲۰۸
۲۳۔ جی. ایم ٹریویلین : " لائف آف جان برائٹ " صفحہ ۲۶۱
۲۴۔ ایف ۔ ڈی ۔ مارس : بحوالہ تصنیف صفحہ ۱۱
۲۵۔ "ہاوس آف کامنز" ۲۷ ؍ جولائی ۱۸۵۷ء
۲۶۔ ۲۹ ؍ جنوری ۱۸۵۸ء
۲۷۔ ۴ ؍ فروری ۱۸۵۸ء
۲۸۔ ۶ ؍ اگست ۱۸۵۷ء
۲۹۔ ۲۹ ؍ ستمبر، ۵ ؍ اکتوبر ، ۷ ؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء
۳۰۔ ۶ ؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء
۳۱۔ ۸ ؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء
۳۲۔ ۵ ؍ ستمبر ۱۸۵۷ء
۳۳۔ ۱۷ ؍ جولائی ، ۷ ؍ اگست ، ۲۳ ؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء
۳۴۔ ۲۷ ؍ جون ، ۳۰ ؍ جون ، ۲۷ ؍ جولائی ۱۸۵۷ء
۳۵۔ "دی ٹائمز" ۲ ؍ نومبر ۱۸۵۷ء
۳۶۔ پیز تھ : ۲۹ ؍ اکتوبر ۱۸۵۷ء
۳۷۔ " ویکلی ڈسپیچ " ۲۳ ؍ اگست ۱۸۵۷ء
۳۸۔ ۲۹ ؍ جون ۱۸۵۷ء
۳۹۔ یکم جولائی ۱۸۵۷ء
۴۰۔ ۲۰ ؍ نومبر ۱۸۵۷ء
۴۱۔ " ویکلی ڈسپیچ " ۲۶ ؍ جولائی ۱۸۵۷ء
۴۲۔ " ہاوس آف کامنز " ۲۷ ؍ جولائی ۱۸۵۷ء
۴۳۔ ملکہ وکٹوریہ سے بنام کنگ لیپلڈ ، ۲ ؍ ستمبر ۱۸۵۷ء
۴۴۔ ملکہ وکٹوریہ سے بنام لارڈ پالمرسٹن ، ۲۹ ؍ جون ۱۸۵۷ء

اختلافات کے باوجود فرانسیسی اخبارات بعض نکات پر متفق الرائے تھے، مثلاً برطانوی جبر و تشدد کی بے رحمی کی مذمت کے بارے میں۔

"لاسیسل"، نے جس پر انگریز کا حامی ہونے کا الزام تھا، ۱ر نومبر ۱۸۵۷ء کو لکھا: "بدقسمتی سے اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے کہ دہلی پر قبضہ کے بعد ہولناک کشت و خوں ہوا۔ ہمیں ان وحشیانہ اعمال کی مذمت کرنے میں کوئی تامل نہیں جو سپاہیوں کے کسی بھی جرم کی بنا پر حق بجانب نہیں ٹھہرائے جا سکتے۔"
ایک عوامی اخبار "لیس تافیت" نے ۲۹ر اگست ۱۸۵۷ء کو غیظ و غضب کے ساتھ اعلان کیا: "اگر انگریز جبر و ستم کی پالیسی پر مُصر رہیں گے تو بڑی طاقتوں بالخصوص فرانس کو مداخلت کرنی پڑے گی کہ ہندوستان کے لوگوں کو مویشیوں کے ایک حقیر گلّے کی طرح ذبح نہ کیا جائے۔"

فرانسیسی اخبارات نے اتفاقِ رائے سے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بداعمالیوں اور برطانوی آبادکاروں کے اُن طور طریقوں کی بھی مذمت کی جو اُن کے خیال میں بغاوت کے ذمہ دار تھے۔ مصلحت اندیش "ریوو دا داکس ماندے" نے لکھا "کمپنی کو غلامی کے جوئے کو ڈھیلا کرنے کی مطلق فکر نہیں۔ بالخصوص پچھلے دس سالوں میں اس نے بہت ہی بڑے پیمانے پر الحاقات، بے دخلیوں اور ضبطیوں کا دور چلایا ہے۔ اُس نے بندوبست آراضی کا طریقہ بدل دیا ہے اور تمام رسمی معاہدوں کو ناکارہ کر دیا ہے۔" "لیس تافیت" نے اور بھی زیادہ زور کے ساتھ لکھا: "کیا ہندوستان قابلِ نفرت انگریزی غلبہ کے تحت ایک نوآبادی ہے؟ نہیں، انگریزوں نے اُسے ایک بہت بڑا قید خانہ بنا دیا ہے جہاں جا بجا پھانسیوں اور سولیوں کے تختے نصب کیے گیے ہیں۔" فانوئیل خاص طور پر برطانوی مشنریوں کے ہندوستان کو عیسائی بنانے کے جوش کی مذمت کرتا ہے اور کہتا ہے: "انگلستان میں اب لوگوں پر یہ حقیقت آشکار ہونے لگی ہے کہ مشنریوں کی ناعاقبت اندیشی بہت حد تک اشتعال کا سبب ہے۔"

فرانسیسی اخبارات نے عام طور پر اس خیال کو پھیلایا کہ برطانیہ کو بغاوت سے سخت دھکا لگا ہے اور اس سے اُس کو کافی اخلاقی اور مادّی نقصان پہنچے گا۔ مثلاً "لا یونین" کی رائے: "برطانیہ عظمیٰ نے پچھلے پچاس برسوں میں عالمی معاملات میں جو اعلیٰ پارٹ ادا کیا ہے اس میں لازمی طور پر کمی آئے گی۔"
"دجانکوی ایرانتا ایل" نے "ریوو دا پاری" میں اس تصویر کے نقوش کو اور نمایاں کیا: "قسطنطنیہ میں برطانوی اثر و رسوخ کم ہو رہا ہے۔ سویز میں اس کے سر پر خطرہ منڈلا رہا ہے۔ ایران میں ایک مسلح امن کی سی صورت ہے جس سے جنگ کا خطرہ درپیش ہے۔ چین میں یہ مطعون و ملعون ہے۔ ہندوستان میں یہ ڈگمگا رہی ہے اور ترکی بغلیں بجا رہا ہے۔ تمام مشرق میں انگلستان کا وقار خاک میں مل رہا ہے۔"

چارلس فورنین

ہم عصر فرانسیسی پریس

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے بارے میں فرانسیسی عوام کے تاثرات کو قلمبند کرنا کوئی سہل کام نہیں۔ اولاً یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُس وقت فرانس ایک تحکمانہ شہنشاہی حکومت کے تحت تھا۔ لوگوں کو پبلک جلسے منعقد کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ پریس پابندیوں میں جکڑا ہوا تھا جس میں بعض مختلف سیاسی خیالات کے جمہوری رسائل بھی تھے لیکن اُن میں سے کوئی بھی مزدور طبقے کے نظریات کا ترجمان نہ تھا، دوسرے ہندوستان سے بہت کم خبریں آتی تھیں اور جو خبریں آتی بھی تھیں وہ یا تو برطانوی ذرائع سے یا ہندوستان میں مقیم فرانسیسی آبادکاروں سے۔ یہ کبھی واقعات کی تازہ خبریں نہ ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر مئی کی بغاوت کی خبریں فرانسیسی اخباروں میں صرف جون کے آخر میں شایع ہوئیں۔ اس پر طرّہ یہ کہ ہندوستان سے متعلق فرانسیسیوں کا علم بہت محدود تھا۔ اُس وقت فرانس میں ہندوستان پر چند ایک کے سوا جو مقالات شایع ہوتے تھے، اُن میں ہندوستان کی دولت، اس کے دیوتاؤں اور اس کی ایشیائی ذہنیت وغیرہ کے متعلق پرانی روایتی داستانوں کا اعادہ ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی علما ہندوستان کو اپنے برطانوی ساتھیوں کا مخصوص دائرۂ اختیار سمجھتے تھے۔ کم از کم نیشنل لائبریری کے ایشیا سے متعلق شعبے اور "دی ریویو آن ہسٹارک کوسچن" (The Review on Historic Questions) کے مضامین کی تحقیق سے ہم اسی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ ہندوستان سے متعلق کتابوں کی قابلِ ذکر تعداد صرف بیسویں صدی کے اوائل میں شایع ہونا شروع ہوئی۔

البتہ فرانسیسی پریس نے ۱۸۵۷ء کی بغاوت پر کافی توجہ دی۔ مثال کے طور پر ایک آزاد خیال رسالہ "لاسیسل" (Le Siecle) نے ۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو لکھا: "ہندوستان کی بغاوت اس وقت کا واحد اہم واقعہ ہے۔"

تھے کہ بغاوت کی تہہ میں روسی ایجنٹوں کا ہاتھ ہے۔ اس کے برعکس "ریو وی پاری" یا "لیس تافیت" کے جمہوریت پسندوں نے یہ رائے ظاہر کی: "اس امر کی تصدیق ہو چکی ہے کہ مذہب کا سوال تو محض ایک بہانہ تھا۔ اصلی سبب قوم پرستی کے عام جذبہ کی از سر نو بیداری ہے۔" (۳ر اکتوبر ۱۸۵۷ء)

"جنرل دادی بیت" کے خلاف بحث کرتے ہوئے اسی جریدہ نے لکھا: "اب سوال یہ نہیں ہے کہ آیا تمام ہندوستانی کم و بیش مہذب یا کم و بیش متحد ہیں یا نہیں، بلکہ سوال یہ ہے کہ آیا گذشتہ بغاوت کمپنی کی زیادتیوں کا ردِ عمل تھی یا واقعی ایک قومی بغاوت۔"

"لاسیسل" پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جس کا یہ دعویٰ تھا کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہندوستانی آپس میں لڑنا شروع کر دیں گے "لیس تافیت" نے یہ دندان شکن جواب دیا: "یہ ہندوستانیوں کا اپنا کام ہے۔ بہر حال یہ حیرت کا مقام ہے کہ ایک جمہوریت پسند جریدہ غیر ملکی حکومت کے گن گائے۔"

اس کے علاوہ اس ٹھوس اصولی نظریہ کا مدار دوسرے اخبارات کی نسبت ہندوستان کے تاریخی حقائق، بالخصوص برطانوی شہنشاہیت پرستی، کے زیادہ سنجیدہ علم پر تھا۔ مثال کے طور پر مذکورہ ذیل سطور ملاحظہ فرمائیں: "انگلستان کو دولت چاہیے۔ برطانیہ نے جس لیے اور جس طرح فتوحات حاصل کیں اس کی یہ وجہ ہے۔ اسی لیے الحاقات جن سے ہندوستان کے دل کو ٹھیس لگی، ایران کے ساتھ انگریزوں کی جنگ کا موجب ہوئے۔ اسی لیے ہندوستان کی پیداوار جہاں بعض صوبوں میں پوست کے کھیت بکثرت موجود ہیں، انگلستان کا چین کے ساتھ رابطہ پیدا کرتی ہے۔ یہ ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ کون سے رابطے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اینگلو انڈین سلطنت پر متواتر حملے انگلستان کو روسی سلطنت کے روبرو لا کھڑا کرتے ہیں (اتیح دا جانگوی ابرآنتونیل، "ریو دا پاری" ۱۸۵۷ء "ایفیئر دا اندی")

اِسی انداز میں "لیس تافیت" اعتدال پسند جرائد کی اِس خام خیالی کی مذمت کرتا ہے کہ سارے یورپ کا مفاد ہندوستان پر برطانوی حکومت کے قائم رہنے میں ہے: "اگر ہندوستان برطانیہ کے ہاتھ سے نکل جائے تو کیا یہ دولت مند یورپ سے بچ جائے گا؟ اگر ہندوستانی آزادی حاصل کر لیں تو وہ یورپی طاقتوں کے ساتھ تعلقات قائم کرنے میں دیر نہیں کریں گے۔ یہ یورپی ممالک سارے ساحل کے ساتھ ساتھ اپنی ایجنسیاں قائم کریں گے اور آسانی سے اندرونِ ملک کے ساتھ تجارتی تعلقات پیدا کر لیں گے۔ اس صورت میں اس پر کسی کا غلبہ نہ ہو گا اور ہندوستانی جس طرح مناسب سمجھیں گے خود حکومت کریں گے۔"

چنانچہ ۱۸۵۷ء کے جمہوریت پسند برطانوی شہنشاہیت پرستی اور اس کی تباہ کاریوں کے

برطانیہ کے ساتھ معاشی اور نسلی یک جہتی پر زور دینے کے علاوہ فرانسیسی متوسط طبقے کی رائے کو ظاہر کرنے والے اُن تمام مختلف اخبارات کا یہ خیال تھا کہ ہندوستانی حکومت خود اختیاری کے قابل نہیں ہیں اس لیے اُن کی بہبودی اس میں ہے کہ وہ غیر ملکی سرپرستی میں رہیں۔

یک جہتی کا یہ رویّہ بغاوتِ ہند کے انگریز مظلوموں کے لیے چندہ جمع کرنے کی سرکاری مہم میں ظاہر ہوا۔ یہ مہم ناظم پولیس کی سرپرستی میں مانتالامبر کی اس نظم سے شروع ہوئی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی مدح میں لکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ لاپائی نے ستمبر ۱۸۵۷ء میں لکھا: "ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے خاتمے کا مطلب ہوگا تہذیب پر وحشت کی فتح۔" ۹ اکتوبر کو "جنرل دادی بیت" نے اس امّید کا اظہار کیا کہ (سراسر تہذیب کے مفاد میں) "اس خوفناک بحران میں برطانیہ عظمیٰ کو فتح حاصل ہوگی۔"

اُن قدامت پسند اخبارات نے برطانیہ پر جس نکتہ چینی کا اظہار کیا وہ باغی سپاہیوں کے ساتھ ہمدردی کا نتیجہ نہ تھی۔ یہ نکتہ چینی کچھ تو فرانسیسی رائے کی عکاسی تھی جو انگلستان کے ساتھ ہمدردی پر مبنی نہیں تھی۔ ۲ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو "جنرل دادی بیت" نے اس نامعقولیت کا ذکر کیا جو اس وقت بظاہر انگلستان سے منسوب تھی۔ اس کے علاوہ انگلستان کے خلاف کچھ کینہ بھی تھا جس کا اظہار ٹیکے سے متعلق گفتگو میں ہوتا تھا اور اُس وقت اس کا عام چرچا تھا۔ اور پھر اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس وقت فرانس کے قبضے میں صرف ایک بڑی نوآبادی (الجیریا) تھی، فرانسیسی اخباروں کے لیے آبادکاری کی بالعموم مذمت کرنا آسان تر تھا۔

البتہ سرکاری اخبارات عام طور پر انگلستان کے ساتھ اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ "پری ووست پیرادول" نے ۶ نومبر ۱۸۵۷ء کو "جنرل دادی بیت" میں لکھا: "انگلستان ہمارا ساتھی ہے۔ اتحاد کے ٹوٹ جانے کا خطرہ مول لے کر ہمیں انگلستان کی مشکلات سے فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔" حریت پسند اخبارات میں نوآبادیاتی لوگوں کے حق میں سر[illegible]ان دوستی کے دعوے موجود تھے۔ ان لوگوں کو ادنیٰ درجے کے بھا[illegible]صور کی[illegible]ا تھا۔ [illegible]ساہت کے حامی کیتھولک اخبارات ہندوستانیوں کے لیے کوئی ہمدردی نہ ر[illegible] تھے لیکن ۱۸۵۷ء کی بغاوت کو پروٹسٹنٹ انگلینڈ پر ایک زبردست چوٹ سمجھتے تھے۔

اعتدال پسند یا رجعت پسند اخبارات کے مقابلے میں فرانسیسی جمہوریت پرست بغاوت سے پہلے اور باغیوں کی سرکوبی کے دوران انگریزوں کے جرائم کی زیادہ جوش کے ساتھ مذمت کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اعتدال پسند تر اند سنجیدگی کے ساتھ برطانیہ کے اس من گھڑت قصّے پر باور کرتے

شایانِ شان مقام اور اکثر گنج بعد آور دبھی حاصل ہوتا ہے۔۔۔"

اسی طرح فقط فرانسیسی جمہوریت پسند ہی ہندوستان کی تحریک سے متعلق کچھ قابلِ اعتماد واقفیت بہم پہنچاتے ہیں۔

جانکوی ایر آنتونیل اس خیال کو اصرار کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان میں جمہوری قوتیں موجود تھیں۔ وہ دراصل پنچایتیں تھیں۔ میونسپلٹی جو جاگیردارانہ نظام کے تحت قائم رہی ہے، مغلوں کے عہد کی میراث ہے اور انگریزوں نے اسے برقرار رکھا ہے۔ اس کی رائے کے مطابق یہی قوتیں باغیوں کی فتح کی امید دلاتی ہیں۔

کسی اور جگہ اسی مصنف نے "لیس تافیت" کے نام ایک خط میں لکھا:

"نوجوان فرانس اور نوجوان جرمنی کی طرح نوجوان ہندوستان بھی ہے۔ یہ نوجوان ہندوستان شہری اور سیاسی آزادی اور مذہبی رواداری میں اعتقاد رکھتا ہے۔ وہ اصول جن سے یہ نوجوان ہندوستان پیدا ہوا ہے، یورپ کی اٹھارویں اور انیسویں صدی کے اوائل کے اصول ہیں۔ اس زمانے کے ایک ہمعصر راجہ رام موہن رائے نے فلسفہ پرست انگلستان اور فلسفہ پرست اور انقلاب پسند فرانس کا سفر کیا۔ وہ وہاں سے ایک "ایمان" لے کر لوٹا۔"

فانوئیل مذکورہ بالا کتاب کے دیباچے میں اس دینِ فطرت میں عقیدے کی خصوصیات پیش کرتا ہے:

"یہ میرا دین ہے، یہ میرے بھائیوں یعنی برہمو سماج سوسائٹی کے اراکین کا دین ہے۔

"یہ میرا دین ہے جس کی تعلیم ہمارے محترم گرو اور بانیٔ دین راجہ رام موہن رائے نے دی

"آپ اسے عیسائیت کا نام دیں یا اسلام کا یا دینِ فطرت کا، مجھے نام کی کوئی پروا نہیں۔"

پھر اسی مُصنف نے (معلوم ہوتا ہے وہی ایک ہے) ستیاگرہ کے دستور کا ذکر کیا۔ وہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح احتجاج کے طور پر بغاوت سے پہلے تین لاکھ لوگ بنارس کے قریب جمع ہو گئے، انھوں نے کھانا پینا ترک کر دیا اور انگریزوں کو بددعائیں دیتے تھے۔ بالآخر وہ لکھتا ہے: "ستیاگرہ کی اس مثال سے ظاہر ہے کہ ایسی سیرت کے لوگوں کی طرف سے سرگرم مزاحمت کس قسم کی ہوگی۔"

انجام کار فرانس کے جمہوریت پسند اخبارات نے باقی تمام اخبارات کے مقابلے میں نانا صاحب کی شخصیت کو خوب سراہا۔ ماہ ستمبر ۱۸۵۷ء کے دوران "لیس تافیت" نے کئی بار اُسے خراجِ تحسین ادا کیا: "بغاوت کے اس راہنما میں تدبیر جنگ میں کمال مہارت کے ساتھ ساتھ جرأت اور ہمت بھی ہے۔

خلاف ایک واضح مگر کسی قدر نادرست رائے کا پہلے ہی اظہار کر چکے تھے۔

اس ضمن میں فالونیل اور ایل۔ ییگال کی تصنیف "دی انڈین میوٹنی" خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے دیباچے سے ایک طویل اقتباس یہاں نقل کیے جانے کے قابل ہے:

"ہندوستان میں تین مفاد تسلی چاہتے ہیں اور پاتے ہیں۔ کمپنی کا مفاد، عام تجارت کا مفاد، اور طبقۂ امرا کا مفاد۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد تہذیب کے لیے کیا بچتا ہے۔

"کمپنی اپنی فتوحات کی وسعت سے پھولی نہ سمائی اور اُن پر قبضہ رکھنے کے مصارف سے تباہ ہوگئی۔ اس کے بچاؤ کی صرف ایک ہی صورت ہے یعنی ٹیکسوں کی وصولی۔ چوں کہ اس کی نگاہ میں تجوریوں کو بھرنے کے لیے دولت اینٹھنے کے تمام طریقے نیک اور جائز ہیں اس لیے انجام کار نفرت کا شکار ہو جاتی ہے۔ وہ اس نفرت سے باخبر ہے اس لیے وہ مجبوراً حماقت پر اُتر آتی ہے اور اسے اپنی حکومت کے تحفظ کی ضمانت سمجھتی ہے۔ اس سے کسی ترقی کی امید نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہذیب ایک بری اور لاحاصل چیز ہے۔

"بہبودی کے نقطۂ نظر سے تجارت بھی بے سود ہے۔ ہندوستان میں نقل پذیری بھی نہیں جس سے دوسرے ملکوں کے ادنیٰ ترین کارندے بعض باہمی روابط سے مستفید ہوتے ہیں اور ان روابط اور نئے تعلقات کے بڑھنے سے انھیں ایک قسم کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ آقاؤں کی تمام تر توت ایک ایسی چیز کی پیداوار پر مرکوز ہوتی ہے جو ملک کے اندر نہ تو فروخت ہوتی ہے نہ اس کا تبادلہ ہوتا ہے اور نہ ہی صرف ہوتی ہے یعنی افیون جو چین سے برآمد کی گئی اشیا کی قیمت کو متوازن رکھنے میں بے مثال کام انجام دیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانیہ چین سے بہت زیادہ چائے اور ریشم خریدتا ہے جس کی ادائیگی بہ نسبت اس لٹنے سوتی اور اونی مال اور لوہے کے سامان سے نہیں ہو سکتی جو وہاں کھپ سکتا ہے۔ برطانیہ بقیہ رقم نقد یا سونے چاندی کے ڈلوں کی صورت میں ادا نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے اس فرق کو پورا کرنے کے لیے ہندوستان کا پوست اس کے آڑے آتا ہے۔ دس کروڑ انسان اپنا دماغ شل کر کے اور اپنی تمام قوت صرف کر کے ایک ایسی چیز پیدا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو ایک اور دوسرے ملک کے دس کروڑ انسانوں کو مسموم کرتی ہے۔

"یہ ہے ہندوستان میں تہذیب کو سنوارنے والا برطانوی تجارت کا اخلاقی پہلو!

"کمپنی بند ہونے والی ہے۔ اس کے شہری نظام اور فوج کے محکموں میں نادار کنبوں کو بہت سے عہدے مہیا کیے جاتے ہیں۔ بھاری مشاہروں سے اس کے شریف النفس ملازمین کو ان کے

"کون جانتا ہے کہ ہندوستان کے تمام لوگ انگریزوں کا تعاقب کر کے ان کو ملک سے نکالنے کے لیے بغاوت نہیں کریں گے؟ اگر ایسے امکانات تک نوبت آجائے تو فرانس کو دریائے گنگا کے کناروں پر اہم پارٹ ادا کرنا ہوگا اور ہندوستانی اقوام کے وسیع اتحاد کا محافظ بننا ہوگا۔"

یہ جوش اکثر دلکش اور رنگین عبارت میں ظاہر ہوا۔ جانکوی ایرآنتونیل نے ایک خط میں لکھا "تم نہیں جانتے کہ میں کس موقع پر سپاہی بنوں گا۔" اور "لیس تانیت" نے ۱۱ ستمبر ۱۸۵۷ء کو وضاحت کے ساتھ لکھا "ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور پھر دہراتے ہیں: ہماری ہمدردی ہندوستانیوں کے ساتھ ہے کیوں کہ مادرِ وطن کی محبت اور قومی آزادی ہمارے لیے مقدس چیزیں ہیں۔"

ہندوستانی بغاوت کے لیے فرانسیسی جمہوریت پسندوں کی ہمدردی بالکل واضح ہے البتہ نپولین کی آمریت کے تحت اخبارات میں اس جذبے کے اظہار پر کافی پابندی تھی، اس وجہ سے ہم مزدور طبقے کے تاثرات کے براہِ راست اظہار کے علم سے محروم ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جمہوریت پسندوں کے علاوہ فرانسیسی عوام کے بڑے حصے کی رائے کم و بیش بغاوت کے حق میں تھی۔ البتہ یہ سوال اٹھتا ہے کہ آیا ان تاثرات سے باغی ہندوستانیوں کے ساتھ حقیقی ہمدردی کی بجائے اس گہری عداوت کا اظہار تو نہیں ہوتا جو بہت سے فرانسیسی انگلستان کے خلاف رکھتے تھے۔ کیتھولک اخبارات کی ہمدردی کی بظاہر یہی وجہ تھی۔ خواہ کچھ بھی ہو، مفاد کی یکسانیت اور نسلی تعصب کی بنا پر شہری متوسط طبقے کی اکثریت مضبوطی سے انگلینڈ کے ساتھ تھی۔

ناناصاحب اپنی قوم کا بدلہ لینے والے کی حیثیت حاصل کر چکا ہے۔

"باغیوں کا سرغنہ ناناصاحب جسے بعض لوگ ایک خونخوار درندہ قرار دیتے ہیں اُسے کامل شریف النسان کا درجہ دیتے ہیں، ہماری رائے میں مذہب اور حب وطن کے دہرے اثر کے تحت کام کر رہا تھا۔ یہ انسانی سرگرمی کے دو بڑے محرک ہیں۔"

اس واضح نظریے سے جس کی تائید دوسرے فرانسیسی جرائد کی نسبت زیادہ واقفیت پر مبنی ہے۔ جمہوریت پسند جرائد نے متناسب رویہ اختیار کیا۔

انھوں نے باغیوں پر رکھے گئے مجرمانہ مظالم کے الزامات رد کر دیے۔ "سپاہیوں کا طرز عمل خواہ کتنا ہی سفاکانہ ہو، یہ فقط انگریزوں کے اس ظلم و ستم کا شدید عکس ہے جو انھوں نے صدی کے بیشتر حصے کے دوران ڈھایا۔" (لیس تانیت ۳۱ اگست ۱۸۵۷ء)

"ہم قطعی طور پر مطالبہ کرتے ہیں کہ باغیوں کے ڈھائے ہوئے مظالم کا مطلق ذکر نہ کرو۔ ان کا جور و ستم اس المناک ڈرامے کے انجام کا ہلاکت خیز اعلان ہے جس میں انگریز نے آج تک بڑا پارٹ ادا کیا۔" (ایضاً ۲۰ ستمبر ۱۸۵۷ء)

انھوں نے جبر و تشدد میں انگریزوں کی مدد کے لیے فرانسیسی مداخلت کی اطلاعات پر سخت رویہ اختیار کیا۔ بعض انتہا پسند اور رجعت پسند طبقات نے اعلان کیا تھا کہ فرانس کو مداخلت کرنی چاہیے تاکہ صورت حال سے فائدہ اٹھا کر انگلستان سے تلافیِ مافات اور معاوضے کا مطالبہ کیا جائے۔

۲۵ اگست ۱۸۵۷ء کو "لیس تانیت" نے رجعت پسندوں کے اس واویلا کا یوں جواب دیا:

"اگر ہم تلافیِ مافات اور معاوضے کے امکان کو تسلیم بھی کر لیں تو پھر بھی ہم یہ نہیں سمجھتے کہ فرانس کس طرح اُن ہندوستانیوں کے خلاف انگلستان کی مدد کرے گا جو صرف اپنی قومی آزادی کے اصول کی خاطر باغی ہوئے ہیں۔"

لیکن قارئین کے خطوط میں اس سے کہیں زیادہ مطالبے تھے۔ ایک نے لکھا: "ہندوستانیوں کے حق میں مداخلت کرو۔ جہازوں کے تمام دستوں کو سمندر میں ڈال دو۔ ہماری کوششوں کو روس کی کوششوں کے ساتھ شامل کرو۔ ایشیا کے تمام لوگوں سے اپیل کرو، ان کو مسلح کرو، ان کو برطانوی ہندستان کے خلاف جہاد کے لیے بھیجو۔ ظالموں کا تعاقب کر کے انھیں نکال دو۔ مغلِ اعظم کی سلطنت کو دوبارہ قائم کرو۔ صرف یہی پالیسی ہے جو درحقیقت فرانس کی شاندار روایات کے شایان ہے۔"

ایک اور نے ایشیا کی تحریکِ آزادی کا یوں خیر مقدم کیا:

کی دیہات میں کوئی زمین نہ تھی وہ اس زمرے میں شامل نہ تھے)۔[1]

جمہوری پروگرام میں بالخصوص عوامی رنگ پایا جاتا تھا اس لیے جمہوریت پسند اس بات کے مخالف تھے کہ پیڈمانٹ ایک ممتاز ریاست کی حیثیت حاصل کرے جب کہ اعتدال پسند اُسے یہ درجہ دیتے تھے۔ جمہوریت پسندوں کی یہ رائے تھی کہ متحدہ جدید اٹلی کی تشکیل عوام کی قومی اور انقلابی شورش کے ذریعے عمل میں آنی چاہیے نہ کہ سیاسی گٹھ جوڑ اور چال بازیوں سے۔

۱۸۵۷ء میں ہی اٹلی کے جمہوریت پسندوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا۔ یہ سپری کی مہم کا سال تھا جب سماجی جمہوریت پسند کارلو پیساکین نے جوسف میزنی کی شرکت میں ایک انقلابی تحریک شروع کی تاکہ جنوب[2] کے لوگوں کو رجعت پسند بوربان سرکار کے خلاف اُکسایا جائے۔ اور جنوب سے اتحاد کی تحریک کا آغاز کیا جائے۔ اس کوشش کی ناکامی اور اس بحران سے جو اس نے جمہوری تحریک میں پیدا کیا،[1] اعتدال پسندی کے رجحان کو تقویت ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیڈمانٹ کی شخصی حکومت نے فرانس کے نپولین سوم کی مدد سے آسٹریا کو شکست دی۔ اس طرح اتحاد کا وہ عمل شروع ہوا جو ۱۸۶۰ء میں جوسف گیری بالڈی کی "ایک ہزاری" مہم سے پایۂ تکمیل کو پہنچا۔

ان حالات میں اعتدال پسندوں نے علانیہ برطانیہ کی حمایت کا رویہ اختیار کیا۔ ان کی نگاہ میں برطانوی پارلیمنٹری سسٹم ایک ایسا نمونہ تھا جس پر اٹلی کے سیاسی اداروں کو تعمیر ہونا تھا۔ آسٹریا کے اثر و رسوخ کا مقابلہ کرنے کے لیے انگریزوں کی امداد بھی ضروری سمجھی گئی۔ برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کی تقویت کو ایک قطعی مصلحت تصور کیا گیا جو اٹلی کی سیاست کے لیے سازگار تھی۔

اس کے برعکس جمہوریت پسندوں میں اگرچہ برطانوی پارلیمنٹری نظام کو قبولیت[2] کی نگاہ سے دیکھا گیا، انگریزوں کی نوآبادیاتی پالیسی کی مخالفت اور نکتہ چینی کا عام احساس پایا جاتا تھا۔ اس پالیسی کی بنیاد ظلم اور لوٹ کھسوٹ پر تھی۔ جمہوریت پسندوں کی نگاہ میں جو قومی آزادی کے اصول کو سب سے بڑھ کر عزیز رکھتے تھے، نوآبادیاتی نظام ان عقائد کے منافی تھا کیوں کہ اس کی بہت سی خصوصیات اٹلی میں آسٹریا کی قومی جبر و ستم کی پالیسی سے ملتی جلتی تھیں۔

ان جمہوری حلقوں میں ہندوستان کی قومی تمناؤں کے لیے ہمدردی پائی جاتی تھی۔ "لا انڈیا اینٹکا اے ماڈرنا" (انڈیا، قدیم و جدید)[4] کا مصنف کارلو کیٹینیو اٹلی میں ہم عصر جمہوری اندازِ فکر کا نہایت مسلم الثبوت نمائندہ تھا۔ اپنے عالمانہ اور پُرجوش مقالے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ اور اس کے اخلاقِ قبیحہ کے پرچار کی مذمت کرنے کے بعد کیٹینیو نے بہادر اور سمجھ دار ہندوستانیوں کی

للیانا ڈل نوگارے

اٹلی میں ۱۸۵۷ء کی صدائے بازگشت

۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متعلق اہلِ اٹلی کی رائے اور اُن کے تبصروں کو صحیح پس منظر میں پیش کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اٹلی میں اُس وقت کی صورتِ حال کے بارے میں چند باتیں پہلے عرض کردیں۔

۱۸۵۷ء میں اٹلی ایک متحد اور آزاد قوم کی حیثیت میں نئی بیداری کے انتہائی نازک مرحلے سے گزر رہا تھا۔ یہ ابھی متحد نہیں ہوا تھا اور کئی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اعتدال پسند جماعت اٹلی کی دو نبرد آزما تنظیموں میں سے ایک تنظیم تھی۔ یہ اٹلی کی آزادی اور اتحاد کی قومی تمناؤں کی ترجمان تھی اور وہاں کے متوسط طبقہ اور دولتمند طبقہ کی نمایندہ تھی۔ البتہ وہ کاریگروں، مزدوروں اور کسانوں کی سماجی آرزوؤں سے خائف تھے۔ اس لیے وہ عوامی جدوجہد میں حصّہ لینے سے حتی الامکان اجتناب کرتے تھے۔ چنانچہ اعتدال پسند قومی مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے لیکن کسی قومی اور عوامی انقلاب کے ذریعے سے نہیں بلکہ فرانس اور آسٹریا کے درمیان بڑھتے ہوئے تصادم سے فائدہ اٹھانے کی سیاسی چال کے ذریعے سے۔ اعتدال پسند اس امداد کے احتمال پر بھروسہ رکھتے تھے جو پیڈمانٹ (شمال مغربی اٹلی) انگلستان سے حاصل کرسکتا تھا۔ انگلستان بحیرۂ روم کے وسط میں ایک ایسی ریاست چاہتا تھا جو برطانیہ کی حامی، آسٹریا اور روس کی مخالف ہو۔ شمالی اٹلی میں آسٹریا کے مقامات پر ایک وسیع تر پیڈمانٹ اس منصوبے کے عین مطابق تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ کاؤنٹ کیوور جو اعتدال پسند پالیسی کا بانی تھا، انگلستان پر اعتماد رکھتا تھا۔

اس کے برعکس جمہوریت پسند عام طور پر جوسف میزنی کے عقیدوں اور نقطۂ نظر کی تقلید کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ قومی نصب العین کو لوگوں کے اشتراکِ عمل کے ذریعہ حاصل کرنا چاہیے۔ (یہ یاد رکھنا چاہیے کہ میزنی کے لیے لفظ "لوگ" سے مراد صرف شہری آبادی کے ادنیٰ طبقات تھے جن لوگوں

کی پالیسی کی حمایت اور اس کے ساتھ کھلی ہمدردی کا رویہ اختیار کیا۔ جوسف میسرنی نے جس کا کیوور کی پالیسی کے ساتھ قریبی تعلق تھا، جولائی ۱۸۵۷ء میں ٹیورن[۹] کے "دی ریوزنا کون ٹیمپورینیا" (Con-temporary Review) ۔ میں جو کچھ لکھا اس میں اُس نے ہندوستانی سپاہیوں کی بغاوت کے قومی رنگ سے مطلق ناآشنائی کا ثبوت دیا۔ اس نے لکھا: "بہت سے لوگ مختلف قوموں اور جغرافیہ کو خلط ملط کرتے ہوئے یہ تصور کریں گے کہ ہندوستانی بغاوت آزادی کی ایک کوشش ہے اور ایک ہندوستانی قوم کی تعمیر کی تمنا کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن جو لوگ سمجھدار ہیں اور معاملات کی حقیقی صورتِ حال سے واقف ہیں ایسی ناشں غلطی نہیں کریں گے۔ سپاہیوں کی بغاوت محض فوجی سرکشی ہے جس کی آگ برہمنوں کے مذہبی تعصب سے بھڑک اٹھی۔ آزادی اور نجات کی آرزو کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔"[۱۰]

یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ کیتھولک کیمپ میں ہندوستانی بغاوت کو انگلستان کے خلاف بحث و مباحثہ کا موضوع بنایا گیا۔ یسوعیوں کے سرکردہ اخبار "دی رسولٹیا کیتھولکا" (Catholic Cult Po) نے برطانوی جبر و تشدد سے اس دلیل کا کام لیا کہ اگر انگریزوں کو اپنے تحت علاقے میں قومی شورش کو جبراً کچلنا واجب ہے تو اٹلی کی حکومت کے لیے بھی اپنے تحت لوگوں کو دبانا یکساں طور پر جائز ہے[۱۱]۔

البتہ جمہوریت پسندوں نے شروع سے ہی ہندوستان کی حمایت کا رویہ اختیار کیا۔ جونہی ہندوستانی بغاوت کی وسعت اور ماہیت سے متعلق صحیح اطلاع پہنچی جمہوریت پسند اخباروں نے کھلم کھلا ہندوستانی انقلاب پسندوں کے ساتھ ہمدردی اور ان کی تحسین کا اظہار کیا۔

اس باب میں اس دور کے اہم ترین جمہوری اخبار "اٹیلیا ڈیل پاپولو" جنووا، (People's Italy) کے بیانات پُرمعنی ہیں!۔ اس اخبار نے مورخہ ۸ جولائی کو لکھا تھا: "بغاوت نے انگلستان کو ایسے ناکوں چنے چبوائے ہیں کہ اُسے ہندوستان کے سوا کچھ اور سوچنے کی فرصت نہیں۔ اپنے گھر میں آزادی اور غیر ملکیوں کو غلام بنانے کی پالیسی کے سبب برطانیہ نے امریکہ میں اپنے بہترین علاقے گنوا دیے۔ اب دیکھیے ہندوستان میں کیا گل کھلتا ہے۔ وہ غالباً ان بدبخت لوگوں کی آزاد ہونے کی عظیم کوشش کی آگ کو خون سے بجھا کر لوگوں کے جوش کو ٹھنڈا کر دے گا۔ لیکن ضرب لگائی جا چکی ہے، آگ روشن ہو چکی ہے اور بہر حال بات یہیں پر ختم نہ ہوگی جیسا کہ ہمارا خیال ہے۔ ہندوستان کے بغیر انگلستان پر کیا گزرے گی؟ اس کا جواب ہے: "ٹائر، کارتھیج، اور وینس کے حشر سے بچنے کے لیے انگلستان ایشیا میں ہر ممکن کوشش کرے گا اور یورپ میں ذلیل ترین حرکتوں پر اُتر آئے گا۔"[۱۲]

آنے والی آزادی کی صاف صاف پیش گوئی کی۔ اس نے لکھا: "واقعات کی اندھا دھند قوت ظالموں کی خواہشات کے خلاف خیال اور عمل کا الگ راستہ تیار کر سکتی ہے۔ ہندوستان میں آزادی کے بیج جڑ پکڑ چکے ہیں تاکہ محکوم برہمن حاکم بن جائے اور اپنے آقا کو غلام کا درجہ دے۔" ۵

چند سال بعد فلکس آرسینی نے ان لوگوں پر نکتہ چینی کی جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ اٹلی کے قومی نصب العین کے حصول کے لیے انگلستان پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔ وہ ایک مشہور جمہوریت پسند تھا جو نپولین سوم کی زندگی پر قاتلانہ حملے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اُس نے انقلاب پسند نکولا فابریزی کے نام ایک خط میں لکھا: "لوگ مثال کے طور پر انگلستان کے آزادی اور خود مختاری کے خیالات کا چرچا کرتے ہیں۔ یہ سراسر فریب ہے! جب تک یہ خیالات اس کے اپنے مفاد سے مطابقت رکھتے ہیں، وہ ان کا قائل ہے لیکن جونہی اس کی کوئی غرض باقی نہیں رہتی۔ ان خیالات میں اس کی دل چسپی زائل ہو جاتی ہے۔ کیا آپ دوسری قوموں کی فیاضی کا ثبوت چاہتے ہیں؟ کارسیکا، مالٹا اور یونانی جزائر میں بغاوت کر کے دیکھیے۔ آپ دیکھیں گے کہ فرانسیسی اور انگریز مطلق کوئی خطرہ مول نہ لیں گے اور فوراً گولی چلا دیں گے۔ وہ وہی کچھ کریں گے جو ہیناؤ نے ہنگری میں کیا۔ وہ لوگوں کو پھانسی دیں گے۔" ۶

اس قسم کی بہت سی شہادتوں کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں ایک اور جمہوریت پسند اینٹونیو مارٹینیاٹی کی رائے کا ذکر کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ وہ میزنی کا پیرو تھا۔ اس نے اپنے مقالہ "رسپوسٹا آل پروگراما دی ان پارٹیٹو نیشنیل" (جواب پروگرام نیشنل پارٹی) میں لکھا: "کیا ہم یورپ کی سیاسی حکمتِ عملی کا ذکر کر رہے ہیں؟ مجھے اس سے کافی واسطہ پڑ چکا ہے۔ صاف صاف اور ایمانداری کے ساتھ بات کرو۔ آپ انگلستان کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا اس کی پیش کش خلوص اور صدق دلی پر مبنی ہوگی؟ کیا ہمارے حقوق اور اس کے مفادات میں مطابقت ہے؟ اُسے کہو کہ یونانی جزائر سے ذرا اپنا محافظ بحری بیڑا اور لارڈ ہائی کمشنر تو ہٹالے۔ مالٹا کے مطالبات تو تسلیم کرے۔ چین سے جو اس نے لاکھوں اینٹھے ہیں واپس ادا تو کرے۔ ذرا ایسٹ اور ویسٹ انڈیز سے تو دست بردار ہو تب ہی ہم اس پر اعتماد کریں گے، تبھی ہم باور کریں گے کہ اس کی نیت صاف ہے اور اس کے مفاد سے ہمارے حقوق کو کوئی خطرہ درپیش نہ ہوگا۔ ہم اس ملک سے کوئی امداد نہیں چاہتے جو آئرلینڈ پر ظلم ڈھاتا ہے اور اسے بھوکوں مارتا ہے اور ایک پونڈ روئی یا ایک کنستر چائے کی خاطر بنی نوعِ انسان کو فاقہ کشی پر مجبور کرنے کو تیار ہے۔"

اٹلی کے اعتدال پسند انگریزوں کے حامی تھے اس لیے اُن کے اس رویّے کے پیشِ نظر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ جب ۱۸۵۷ء کی بغاوتِ ہند کا سوال سامنے آیا تو انھوں نے انگلستان کی جبر و تشدد

آخر میں ہندوستان کے واقعات کا حوالہ دیا جاتا ہے تاکہ اٹلی میں بھی انقلابی سرگرمی کے جواز کو ثابت کیا جائے۔" برطانوی اقتدار کی شان کو زبردست دھکا لگا ہے۔ ہماری پارٹی نے بہت پہلے الفاظ اور امثال کے ذریعے پیشین گوئی کی تھی کہ شخصی حکومت اپنی رضا سے دست بردار نہیں ہوتی، ایک قوم کتابوں اور مقالوں کے ذریعے سے نہیں بلکہ محنت و کوشش اور متواتر قربانی سے ہی ترقی کی راہ پر گامزن ہوتی ہے اور آہستہ آہستہ آزادی کا لباس حاصل کرتی ہے اور جس کے پہننے کی اہل ایک دن بن جاتی ہے۔ لگ بھگ سو سال سے کتابوں اور اخبارات میں بھی اور برطانوی پارلیمنٹ میں بھی غریب ہندوستانیوں کے ساتھ انصاف کا تقاضا کیا جا رہا ہے اور کلائیو، ہیسٹنگز اور لاکھوں بے رحم لیڈروں کی مذمت کی گئی ہے جو اس بدبخت ملک کا خون نچوڑتے ہیں اور اس پر جبر و ستم ڈھاتے ہیں۔ تاہم غارت گری اور جور و ستم اب بھی جاری ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ صرف انگریز ہی قصوروار نہیں ہیں۔ جبر و ستم کا جب کسی قوم کے ساتھ تعلق ہوتا ہے تو یہ ایک خوفناک الجھن بن جاتی ہے جو دو عین مساوی اجزا سے مرکب ہوتی ہے، ظالموں کی طرف سے تشدّد اور ناانصافی اور مظلوم کی طرف سے غلامانہ اطاعت اور بزدلی۔ جب مجھے یہ بتایا جاتا ہے کہ تین کروڑ ساٹھ لاکھ فرانسیسی ڈکٹیٹر کے جوئے تلے کراہ رہے ہیں اور ڈھائی کروڑ اہلِ اٹلی آسٹریا، بوربانوں اور پوپ کے ہاتھوں شہید ہو رہے ہیں اور دس کروڑ ہندوستانی تاجروں کی ایک کمپنی کے غلام ہیں تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس قہرِ عظیم کی ذمہ داری ان لاکھوں اطالویوں، ہندوستانیوں اور فرانسیسیوں پر ہے جو اس ذلت کو گوارا کرتے ہیں نہ کہ ان کے آقاؤں پر جن کے پاس سب ملا جلا کر صرف دس لاکھ فوجیوں کی قوت ہے جس سے وہ اپنے احکام کی اطاعت کرواتے ہیں۔ یہ تاریخ کی ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ غلامی کے تئیں بے حسی اور صبر و تسلیم کا رویّہ غلامی کی سختی اور اس کے جاری رہنے کا بڑا سبب ہے۔ حکومت کے غاصبوں سے ایک ذرّہ بھی چھیننے کے لیے جبر و تشدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ۱۸۴۸ء کے آئین جن میں پیڈمانٹ کا آئین بھی شامل ہے نہ تو کسی اصول پرستی کا نتیجہ تھے، نہ مؤدبانہ عرضداشتوں کا، نہ بنی نوع انسان کے دردمندوں کے واویلے کا، اور نہ ہی عقلیت پسندوں کی منطق کا، بلکہ غضب ناک غلاموں کی ہیبت ناک شورش کا۔ مشکل مسائل پر غلط استدلال سے کام لینے والے عالمِ خیال کے مغرور مفکر اور کمینے جریدہ نگار بزدلانہ صبر و تسلیم کی تلقین کے لیے پیڈمانٹ میں اخبارات کی اور خود اس کی آزادی کا استعمال کرتے ہیں حالاں کہ یہ آزادی اس انقلاب کے طفیل ہے جسے وہ رد کرتے ہیں یا باغی غلام کی پُرتشدد سرگرمی کے دم سے ہے جسے وہ نمک حرامی سے کوستے ہیں۔ یہ ثابت کرنے کے لیے

بعد میں ۲۱ اگست کے اداریے میں جس میں ہندوستانی بغاوت کے قومی رنگ کی وقعت کو گھٹایا گیا، اور تحریک کے مذہبی پہلوؤں میں مبالغہ آمیزی کی گئی، اس اخبار نے ہندوستان میں انگلستان کی کارگزاری پر سخت رائے زنی کی۔ ''اس کے اپنے سیاستدانوں کی شہادت کے مطابق انگلستان ہندوستان میں جبر و تشدد کے ایسے طریقوں سے کام لیتا ہے جن کے لیے اس نے ریاکاری کے ساتھ یورپ میں فرڈیننڈ بوربان کی مذمت کی۔ غداری، دغابازی اور تشدد کے ذریعہ اس نے بادشاہ اور والیانِ ریاست کے علاقوں پر قبضہ کر لیا جو اس کے حلیف اور خیر خواہ ہیں۔ معاہدوں کو توڑنے کے لیے وہ قرضے دیتا ہے۔ دوسروں کے علاقے پر ناجائز قبضہ کرنے کے لیے وہ بھائی بھائی میں، باپ بیٹے میں اور ماں بیٹے میں ظالمانہ عداوتیں پیدا کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔ الغرض اس نے پندرہ کروڑ انسانوں کی بد دعائیں اپنے سر لی ہیں جن کی فریاد، اگرچہ وہ وحشی اور کافر ہیں، عرشِ بریں تک پہنچے گی اور انتقام کا تقاضا کرے گی اور ان کا یہ تقاضا پورا ہو گا۔''[۱۴]

اُسی اخبار میں ۱۵ استمبر کو ایک دل چسپ مضمون شایع ہوا جس میں ہندوستانی بغاوت کی قومی ماہیت کو زور دے کر بیان کیا گیا۔ اس مضمون میں مصنف اس رائے کی پُرزور تردید کرتا ہے جو اس وقت صحافیوں میں پائی جاتی تھی کہ ہندوستانی شورش محض ایک فوجی تحریک ہے۔ ''بغاوت میں عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ باغی اپنے افسروں کو ہلاک کرتے ہیں، لوٹتے ہیں اور پھر منتشر ہو جاتے ہیں۔ اُن میں سے بعض اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں اور بعض ڈاکوؤں کے گروہ بنا لیتے ہیں لیکن یہاں یہ ہوا کہ ایک سے زیادہ دیسی رجمنٹیں سازش میں شریک ہوتی ہیں، ایک مقررہ تاریخ پر بغاوت کرتی ہیں اور قدیم پایۂ تخت پر قبضہ کر لیتی ہیں۔ فرنگیوں کے خلاف جنگ کا ڈنکا بجاتی ہیں اور قومی آزادی کا اعلان کرتی ہیں۔ پھر شاہی خاندان سے حکمراں منتخب کرتی ہیں۔ اس کے بعد منشور صادر کرتی ہیں اور ایک نئے نظام کے لیے کوشش کرتی ہیں۔ انھیں لوگوں کی ہمدردی یا کم از کم غیر جانبداری حاصل ہو جاتی ہے۔ اس سب سے ظاہر ہوتا ہے کہ تمام طبقوں میں ہیجان تھا اور وہ سب اگر عملاً نہیں تو نیت کے اعتبار سے بغاوت میں شامل تھے۔''[۱۵] آگے چل کر مصنف نے ایشیا کے لیے اس بغاوت کی حد درجہ اہمیت کو سمجھنے میں دور اندیشی کا اظہار کیا ہے: ''ہندوستان میں برطانوی سلطنت کی بحالی خواہ تیز ہو خواہ سست، خواہ مکمل ہو خواہ نامکمل، یہ ایک مسلم حقیقت ہے کہ دریائے زرد اور دریائے گنگا کے کناروں پر انقلاب کے بھوت کا ظہور ایک عظیم سانحہ ہے اور بہرحال جذبۂ آزادی کے نئے اعلان کی علامت ہے۔''

ہندوستانی بغاوت نے اٹلی میں پیدا کی۔*

حواشی

۱۔ اٹلی میں زرعی مسئلے پر میزنی کے پیروؤں کے انتہائی مبہم رویہ کے لیے بالخصوص ملاحظہ فرمائیں انیٹونیو گرامشی کا تجزیہ "ریس آرجی مینٹو" ٹیورن (ایناندی ۱۹۵۲ء)۔

۲۔ سپری کی مہمات کے ساتھ ساتھ میزنی کے پیروؤں نے جینووا اور لیگھارن میں ایک باغیانہ تحریک منظم کرنے کی کوشش کی مگر یہ تحریکیں ناکام ہوگئیں۔

۳۔ دوسری باتوں کے علاوہ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ بہت سے اطالوی سیاستدانوں (جن میں میزنی بھی تھا) نے برطانیہ میں پناہ لی۔

۴۔ "الکونی سکرتی" جلد دوم میلان (باروفی اے سکاٹی) ۱۸۴۶ء میں کارلو کیٹینیو کا مضمون ملاحظہ فرمائیں۔

۵۔ یہ امر قابلِ ملاحظہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں بغاوتِ ہند کے موقعہ پر میلان کا ایک مالک مطبع پیرو ٹا کیٹینیو کی تصنیف "انڈیا اینٹکا اے ماڈرنا" کا ایک نیا نسخہ شایع کرنا چاہتا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ مصنف اس ملک کے حالیہ ہنگاموں سے متعلق چند سطور کا اضافہ کردے لیکن غالباً اشاعت ناممکن تھی۔ ملاحظہ فرمائیں: کیٹینیو: "ایپسٹولیریو" جلد سوم، صفحہ ۲۹۔ فلارنس (جی باربرا ۱۹۵۴ء)

۶۔ فیلس آرسینی: "لیٹرز" روم (وٹوریانو ۱۹۳۶ء)

۷۔ تاریخی دستاویزات ریاست فلارنس: "آرکیویو سیگریٹو، پری فیٹورا" ۱۹۵۲-۵۴ء "ٹرانزیکشن" ۱۵۴ پوائنٹ ۱، فائل ۸

۸۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ملاحظہ ہے کہ سرکاری حلقوں کی تحریک پر پیڈمانٹ میں ہندوستانی

---

* اہم ترین تصنیفات میں سے مذکورہ ذیل قابلِ ذکر ہیں: جی۔ بی۔ ڈی کرانے لیزا: "لا امپیرو انڈو۔ برٹینکو اے لاسماپوٹینزا ملی ٹیر" (۱۸۵۸ء) ایرس نائنڈ کیلانی: "سین ڈیل لاان سرزن انڈیانا" (۱۸۵۸ء)۔ گائی سیدب لنزیرو: ڈیلا کپنیا اے ڈیلا ڈومینیشن انگلیس نیل انڈی فنوالا کیڈوٹا دی دہلی نیل" (۱۸۵۸ء) اگنیز پور سکو: "ریلیشن سلا ان سرزن ڈیل، انڈیا برٹینکا" (۱۸۵۸ء)۔ مدیرو آرن: "لا انڈیا انگلیس پر آٹما اے ڈِہ پولا ان سرزن ڈیل" (۱۸۵۷ء) (۱۸۵۸ء)۔ فرڈیننڈو ڈی لینائے: "لا انڈیا کونٹیمپوریینیا" (۱۸۵۸ء)۔ گیووانی فلیشیا اے کانسٹیٹینو مرموشی: "لا امپیرو اینگلو۔ انڈیانو" ڈے شیرشن جیوگرافیکا، سٹوریکا" وغیرہ ۱۸۶۳ء

کہ برطانوی حکومت وبالِ جان اور اس کا جوا ناقابلِ برداشت ہے۔ محض عرضداشتوں اور پارلیمنٹری فصاحت سے کام نہیں چلتا بلکہ غلام کی طرف سے ایسے عمل کی ضرورت ہے جس کا اظہار اس عظیم بغاوت میں ہوا۔"

میزنی کے پیرو جمہوریت پسندوں کے خیالات کے علاوہ جن کا اخبار "اٹیلیا ڈیل پوپولو" تھا آزاد خیال عقلیت پسندوں کی تحریک کے بانی آسونیو فرانچی کے زیرِ ادارت اطالوی جریدہ "لا ریزن" نے ہندوستانی واقعات کی جو تاویل پیش کی ہے اس کا ذکر کرنا سود مند ہوگا۔ "دی پولیٹیکل ریویو" مورخہ ۱۵ اگست لکھتا ہے: "مظلوموں نے مورچہ بنانا اور ظالموں کو جلانا سیکھ لیا ہے۔ ہم اس دن کا مسرت کے ساتھ خیر مقدم کریں گے جب ہندوستان "آزاد ترین" انگلستان کی حکومت کے چنگل سے نجات پائے گا۔" اُن انگریزی جرائد کے جواب میں جنھوں نے محاصرۂ دہلی کے دوران برطانوی فوجی دستوں کی شکست سے طیش میں آکر شدید انتقام کا مشورہ دیا تھا" "لا ریزن" نے ۵ ستمبر کو لکھا: "اس ہولناک سبق کے بعد دہلی کو تباہ کرنے کے بجائے اس کا محاصرہ اٹھالینا چاہیے تھا۔ تقریباً تمام انگریزی جرائد الیسی غضبناک بغاوت پر غم و غصہ میں "دی ٹائمز" کی طرح بدبخت مظلوم لوگوں کے خلاف انتقام اور ان کی بیخ کنی کی مہم کا چرچا کرتے ہیں کیوں کہ وہ لوگ ہمیشہ کے لیے اپنی غلامی کی زنجیروں کو توڑ دینا چاہتے تھے۔ ہم خود غرضوں کی فتح کی نسبت لوگوں کے مقدس حق کو زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور دل وجان سے چاہتے ہیں کہ انگریز قوم کو ہمیشہ کے لیے ہندوستان سے نکال دیا جائے۔ ہندوستان میں برطانوی سرکار شاید روئے زمین پر سب سے زیادہ ظالمانہ حکومت ہے اس لیے فرنگیوں کے خلاف ہندوستانیوں کے انتقامی اقدامات پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس نہایت دولتمند اور زرخیز ملک کو لوٹ لوٹ کر کنگال کر دیا ہے۔ یہاں ہر سال کروڑوں انسانوں کو قحط کے سبب مرتے ہوئے حکومت بے رحمی کے ساتھ دیکھتی رہتی ہے کیوں کہ انسان دوست انگلستان نے کروڑوں روپے اینٹھنے کے باوجود ہندوستانی صنعتوں کو نیست و نابود کر دیا ہے اور ان کی جگہ ایک بھی رفاہِ عام کا کام نہیں کیا۔ ہندوستان پر [illegible] مسلمان [illegible] اسلوبی کے ساتھ حکومت کرتے تھے لیکن اب اس پر عیسائیوں کی دہشتناک حکمرانی ہے۔"

جو کچھ اوپر پیش کیا گیا ہے اس سے ہم بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ اطالوی سیاسی حلقوں میں ۱۸۵۷ء کے ہندوستان کے واقعات پر بڑی توجہ مبذول کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے متعلق متعدد تصنیفات جو اس دور میں شایع ہوئیں اس دل چسپی کا بیّن ثبوت ہیں جو

پی۔ شاستی کو

۱۸۵۷ء اور روسی پریس

روس میں ہندوستانی بغاوت کی پہلی اطلاع ۲۷ر جون ۱۸۵۷ء کو پہنچی۔ جب لندن میں متعین روسی سفیر، خریپتووچ نے میرٹھ میں شورش اور دہلی پر باغیوں کے قبضے کی خبر تار کے ذریعے سینٹ پیٹرس برگ کو بھیجی۔ اُسی دن اُس نے امورِ خارجہ کے وزیر، پرنس گورچاکوف کے نام ایک یادداشت لکھی اور اس کے ساتھ لندن کے اخبارات سے اقتباسات شامل کیے۔ لندن میں مقیم روسی ملٹری اٹیچی، کرنل اگناتی یئف نے بھی واقعات کی مفصل روداد بھیجی۔

اگناتی یئف نے لکھا: "ہندوستان میں بغاوت کمپنی کے خلاف صرف کئی دیسی رجمنٹوں کا اتفاقیہ غدر نہیں ہے بلکہ غلامی کے نفرت انگیز غیرملکی جوئے سے اس سرزمین کی آزادی کی خواہش کا اظہار ہے"۔ اگناتی یئف کا خیال تھا کہ "حکومت کی بدعنوانیاں اور کمپنی کی سب کچھ ہڑپ کر جانے کا لالچ بغاوت کے موجب تھے"۔ اگناتی یئف کی رائے میں کمپنی کی پالیسی سے ہندوستان کے جاگیردار رئیسوں میں بھی یہ خیال پیدا ہو گیا کہ جلد یا بدیر ہر موزوں قطعۂ آراضی جو انگریز تاجروں کی دسترس میں تھا اس پر وہ قابض ہو جائیں گے۔"

جب لندن کی سنسنی خیز خبر اخبارات میں شایع ہوئی تو اس نے روسی عوام کی رائے کو بیدار کیا۔ حریت پسند رسالہ "اتیے چست ویی یے" نے اعلان کیا "آج سیاسی دنیا میں شاید ہی ہندوستان کے سوال سے زیادہ اہم، دلچسپ، یا سنجیدہ کوئی مسئلہ ہو۔ ہندوستان کی خبروں کا انتہائی بے تابی کے ساتھ انتظار کیا جاتا ہے۔ سب سے زیادہ سنسنی خیز عنوان یہ ہیں: 'ہندوستان'، 'ہندوستان کی ڈاک'، اور 'کلکتہ کے مراسلات'!"

"آج سب سے زیادہ جاندار مسئلہ ہندوستان کے معاملات کا ہے۔ پانچ مہینے سے سارے یوروپ کی نظریں ہندوستان پر گڑی ہوئی ہیں۔" یہ رائے رسالہ "روسکی ویئینک" کی تھی جو اس نے

بغاوت کے مظلوموں کے لیے چندہ جمع کرنے کی ایک مہم چلائی گئی۔ اور وکٹر امینوئل دوم، کیور اور جنرل لمرمورا نے چندہ دیا۔

۹۔ "ری وزٹا کون ٹیمپو رینیا" ٹیورن، جولائی ۱۸۵۷ء

۱۰۔ بغاوتِ ہند کے حق میں اعتدال پسندوں کے مختلف وطیروں کے لیے ملاحظہ فرمائیں: "دی گزیٹا پیڈمانٹیز" ٹیورن، ۱۸۵۷ء جابجا، اور "گزیٹا دی جینووا" جینووا، ۱۸۵۷ء، جابجا۔

۱۱۔ "بسو لیٹا کیتھولیکا" روم، ۲۷ر جون ۱۸۵۷ء

۱۲۔ "اٹیلیا ڈیل پوپولو" جینووا، ایک اور اہم مائی میزنی روزانہ اخبار "اٹیلیا اے پوپولو" (اٹلی اور اہلِ اٹلی) کے سلسلے کی ہی ایک کڑی تھی جس نے محکمۂ خزانہ کی تعذیب کے نتیجے کے طور پر چند ماہ پیشتر اپنی اشاعت بند کر دی تھی۔

۱۳۔ "اٹیلیا ڈیل پوپولو" ۸ر جولائی ۱۸۵۷ء

۱۴۔ ایضاً ۲۲-۷ر اگست مضمون بعنوان "لا انڈیا اے لا یوروپا"

۱۵۔ ایضاً ۱۵ر ستمبر ۱۸۵۷ء "لیٹر پار ٹیجن ڈیلا ساٹنا اے ڈیلا انڈی"

۱۶۔ "لا ریزن" ٹیورن، ۱۵ر اگست ۱۸۵۷ء

کے واقعات کی باقاعدہ اور مکمل اطلاعات شایع کرتا تھا۔ ۱۲ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو اس اخبار نے سرگے برگ کا ایک طویل مضمون بعنوان "ایسٹ انڈیز ایفیرز" شایع کیا۔ مصنف کی ہمدردی سراسر باغی ہندوستانیوں کے ساتھ تھی۔ "برطانوی شیر، ریاستوں کے سیاسی اجسام کو نوچنے کا عادی ہے۔ اس بار جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے اُسے اپنی خونخواری کی خصلت کو قابو میں رکھنا ہوگا۔" سرگے برگ کی نظر میں بغاوت کا سبب "ہندوستانیوں کے ساتھ انگریزوں کا وحشیانہ سلوک (خاص طور پر ٹیکس کی وصولی میں) اور انسانی حقوق سے اُن کی مطلق چشم پوشی تھا۔"

مقبولِ عام اخبار "پتربرگسکی ودوموستی" زیرِ ادارت اے اے۔ کرائسکی، رکن انجمن سیاسی المعروف "اہلِ غرب" بھی اپنے قارئین کو بخوبی مطلع رکھتا۔۔۔ ۳۰ جولائی کو اخبار نے ایک سلسلۂ مضامین بعنوان "لیٹرز اباؤٹ ایسٹ انڈیز ان ڈگنیشن" شروع کیا۔ اس میں مصنف نے اپنے قارئین کو مشورہ دیا کہ وہ لندن کے اخبارات پر تنقیدی نگاہ ڈالیں کیوں کہ اس کے قول کے مطابق "انگریز اپنی ناکامیوں کو چھپانے یا ان سے انکار کرنے کا فن جانتے ہیں۔" جس طریقے سے ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئی اس کی تاریخ سے مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "خود انڈو برٹش سلطنت کی تعمیر میں تخریب کا تخم موجود ہے" اس نے برطانوی صحافیوں کے اُن دعووں کو مہمل قرار دیا کہ بغاوت کا سبب یہ تھا کہ افسروں نے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو نظر انداز کیا۔

جہاں تک اُن لوگوں کا تعلق ہے جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ "روشن خیال مہذب یورپ" "پس ماندہ جاہل ایشیا" میں تمدن پھیلانے کا مقصد رکھتا تھا۔ "پتربرگسکی ودوموستی" نے اس نظریے کو بے باکانہ ریاکاری کا نام دیا۔ اس نے یہ معقول دلیل پیش کی کہ "انگلستان نے ایک وسیع سلطنت حاصل کی لیکن اس میں تہذیب پھیلانے کے لیے نہیں بلکہ اسے ہڑپ کرنے کے لیے۔"

ایشیا میں یورپ کے تہذیب پھیلانے کے پارٹ پر روسی مصنفوں کے اس قدر توجہ دینے کا سبب یہ تھا کہ نوآبادکاروں کی کھلم کھلا اور ظاہرا بداعمالیوں کو جائز ٹھہرانے کے لیے اس دلیل سے کام لیا جاتا تھا۔ روس میں رجعت پسند حلقوں نے بھی اس ریاکاری کے حربے کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔ "روسکی ویتنک" نے ان حلقوں کی رائے کی عکاسی کی جب اس نے یہ بیان کیا کہ "ہمیں انگلستان کی خارجہ پالیسی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ اس کے ساتھ ہمارے اختلافات کے کئی نکتے ہیں لیکن ہم ہمیشہ فراخدلی اور ایمانداری کے ساتھ تسلیم کریں گے کہ ہمارے کئی مقاصد یکساں ہیں! انگلستان اور روس دونوں پر فرض ہے کہ وہ پچھڑے ہوئے ایشیا کی اخلاقی تاریکی میں یورپی طرز زندگی کی

اپنے قارئین پر ظاہر کی۔

اخبارات اور رسائل میں بغاوت کی نسبت روسی رویے پر شدید بحث چھڑ گئی۔ بغاوت کے اسباب کیا تھے اور یہ کس طرح پھیل رہی تھی؟ عوام کے لیے اس کا صحیح تصور کرنا مشکل ہو گیا کیوں کہ روسی اخبارات اس موضوع پر اپنا بیشتر مواد انگریزی اخبارات سے اخذ کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف مختلف رسائل اور اخبارات کے نقطۂ نظر میں اختلاف اور انتشار تھا بلکہ مختلف صحافیوں کے خیالات میں بھی۔

بغاوت سے متعلق سب سے زیادہ واضح اور قطعی رائے بے شک صرف روسی انقلاب پسند جمہوریت پرستوں میں پائی جاتی تھی۔ اُن کے خیالات کا اظہار این۔ اے۔ دوبرولیوبوف کے ایک مضمون میں کیا گیا جس کا عنوان "ایسٹ انڈیا کمپنی کی تاریخ اور اس کی معاصرانہ صورتِ حال کا جائزہ" تھا اور جو رسالہ "سووریمینک" کے پرچہ ستمبر میں شایع ہوا۔ ادیب اور فلسفی اور روسی انقلاب پسند جمہوری تحریک کے رہنما این۔ جی۔ چرنی شیوسکی کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ "مضمون واقعی اچھا نکلا"۔

موضوع سے متعلق نظریے کی پختگی دوبرولیوبوف کے مقالے کی امتیازی خصوصیت تھی۔ اس کی نگاہ میں بغاوت بے اطمینانی کی ایک اتفاقیہ لہر نہیں تھی بلکہ وہ تاریخی طور پر ایک ناگزیر واقعہ تھا۔ دوبرولیوبوف نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی لوٹ کھسوٹ کی مشینری کے کل پرزوں کی تحقیق کے ساتھ بغاوت کے اسباب کا مطالعہ شروع کیا۔ یہ مشینری ڈاکو کی بے باکی اور حقیر تاجرانہ حرص سے مرکب تھی۔

دوبرولیوبوف نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے قیام کی تاریخ کی چھان بین کی اور اس امر کی بھی تحقیق کی کہ کس طرح منچلے بیوپاریوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی ترقی کرکے تجارتی سالاروں کی حکمراں جماعت بن گئی۔ اُس نے اُن مورخوں اور صحافیوں کے دعوے کو قطعاً رد کر دیا جو سادہ لوحی یا ریاکاری سے انگریزوں کے تہذیبی مقصد کے قائل تھے۔ دوبرولیوبوف نے لکھا: "انگلستان کا آخری مقصد حکومت قائم کرنا اور نجی منافع کمانا ہے نہ کہ تہذیب پھیلانا۔"

بغاوت کا جائزہ لینے میں دوبرولیوبوف اُن لوگوں کا طرفدار تھا جو اسے متعصب ہندوؤں کی مذہبی شورش یا بے قابو سپاہیوں کا غدر تصور نہیں کرتے تھے بلکہ اسے آزادی کے لیے لوگوں کی بغاوت سمجھتے تھے جو بغیر کسی ذاتی غرض کے حملہ آوروں کے مقابلے پر آئے۔ وہ سمجھ گیا کہ لوگوں نے بغاوت کی کیوں کہ انھوں نے بالآخر برطانوی حکومت کے نظام میں خرابی پائی۔

اُس وقت روس کا سرکاری نظریہ اخبار "روسکی ان ویلڈ" میں پیش کیا گیا جو ہندوستان

یوشینگ وُو۔ چانگ چین کن

چین اور ہندوستان انیسویں صدی کے وسط میں

(۱)

انیسویں صدی کے وسط کا زمانہ مختلف ایشیائی ملکوں میں قومی آزادی کی تحریکوں کے لیے عام شورش کا ایک عظیم عہد تھا۔ انقلابات یکے بعد دیگرے برپا ہوئے۔ چین میں تائی پنگ انقلاب اور دوسری جنگِ افیون، ہندوستان میں عوامی بغاوتیں، ایران میں بابیوں کی شورش اور اینگلو ایرانی جنگ، شام اور لبنان میں کسانوں کی سرکشی، بورنیو میں نوآبادیاتی نظام کے خلاف لوگوں کی جدوجہد وغیرہ۔ غرضیکہ ایک زبردست سیلاب تھا جو نوآبادیاتی نظام کی بدنما قوتوں کو بہالے گیا۔ عوامی انقلابات کی اس امنڈتی ہوئی لہر میں غیر ملکی جارحیت اور جبر وستم کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کی جدوجہد سب سے زیادہ وسیع تھی۔ بعد میں آنے والی ایشیائی قوموں کی آزادی کی تحریکوں پر اُن کا نہایت گہرا اثر پڑا اور غیر ملکی سرمایہ دار حملہ آوروں اور جاگیر دار قوتوں کو بہت سخت دھکا لگا۔ ہندوستان کی جدوجہد اور چین کی شورش ایشیا میں قومی تحریکِ آزادی کی دو بڑی لہریں تھیں۔

گذشتہ صدی کے وسط میں ایشیا کی قومی آزادی کی تحریکوں کا آغاز دراصل مغربی سرمایہ دار حملہ آوروں کی نوآبادیاتی پالیسی کا براہِ راست نتیجہ تھا۔ قوت اور سازش دونوں سے کام لے کر انھوں نے ایشیائی قوموں کو لوٹا اور غلام بنایا۔ انھوں نے ایشیائی ملکوں کے اُس وقت کے اقتصادی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ ڈالا اور انھیں نوآبادیوں یا نیم نوآبادیوں کی حیثیت سے دنیا کی سرمایہ دارانہ منڈی میں دھکیل دیا۔ اپنے روایتی حقوق سے محروم اور بڑھتی ہوئی بھوک اور تنگدستی کا شکار ہونے کے بعد ایشیائی قومیں آزادی اور خود مختاری کی جانب صحیح اور واحد راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہو گئیں ـــــ یعنی غیر ملکی حملہ آوروں کے خلاف مصمم ارادے کے ساتھ جدوجہد

روشنی پھیلائیں۔ اس میدان میں ہم حلیف ہیں۔ یہاں ہم میں یکجہتی پائی جاتی ہے۔

البتہ انصاف اس حقیقت کا مطاحظ کرنے کا تقاضہ کرتا ہے کہ "روسکی ویتینک" کو روسی عوام کی حمایت حاصل نہ ہوئی۔ اس کو سمجھنا کچھ دشوار نہیں۔ آزادی اور خود مختاری کے لیے جدوجہد میں ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی رکھنے کے علاوہ روسی عوام خود ابھی اس ضرب سے پیچ و تاب کھا رہے تھے جو ۱۸۵۴ء کی جنگِ کریمیا میں برطانوی اور فرانسیسی ہتھیاروں نے ان کے قومی فخر پر لگائی تھی۔ اس لیے ان کی ہمدردی ان لوگوں کے ساتھ تھی جو ہندوستان کو غلامی کے نوآبادیاتی جوئے سے نجات دلانے کی کوشش کرتے تھے۔

ہندوستان کے طوفان کی المناک صدائے بازگشت ہمالیہ کی برفانی چوٹیوں کے اوپر سے لڑھکتی ہوئی روس کے میدانوں کو عبور کرکے سینٹ پٹرسبرگ تک جا پہنچی۔ روسی عوام کے ترقی پسند طبقے نے اس طوفان میں بہار کے اس پہلے جھونکے کی قوت کو دیکھا جو آزادی کی آنے والی آندھی کا پیش خیمہ تھا۔

روسی عالم ۵۹-۱۸۵۷ء کی ہندوستانی بغاوت کی تاریخ کا بڑی دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں۔ یہ دلچسپی تاریخ کو داخلی نظریات کا مجموعہ سمجھنے پر مبنی نہیں ہے بلکہ خارجی قوانین کا منطقی نتیجہ سمجھنے پر۔ ان خارجی قوانین کے مطالعے سے اس رُخ کو سمجھنا ممکن ہو جاتا ہے جس میں سماج حرکت کر رہا ہے۔ ماضی میں ہندوستانیوں کی بہادرانہ جدوجہد، حال میں ایک بڑی قوت کی حیثیت سے ہندوستان کے ظہور اور مستقبل میں اس کی ترقی کے امکانات سے تاریخِ ہند کا مطالعہ بڑا دل آویز اور مؤثر ہو جاتا ہے۔

روسی علما کی رائے کے مطابق ہندوستانی بغاوت کوئی الگ تھلگ واقعہ نہیں ہے۔ ہندوستان کی بغاوت، چین میں تائی پنگ شورش، ایران میں بابیوں کی تحریک اور انڈونیشیا میں تحریکِ آزادی کا ظہور — یہ سب کچھ ان ملکوں کو نوآبادیوں میں بدلنے کی کوششوں کا عوامی ردِّعمل تھا۔

ہندوستانی بغاوت برطانوی حکومت کے خلاف منظم کی گئی اور کسان، کاریگر اور سپاہی اس کی روحِ رواں تھے۔ اس قوت کے علاوہ جاگیرداروں کی بھی ایک جماعت تھی جس کی قیادت ان رؤسا نے کی جنھیں انگریزوں نے معزول کر دیا تھا اور جنھوں نے اپنے کھوئے ہوئے حقوق اور اختیاراتِ خصوصی دوبارہ حاصل کرنے کے لیے موقعہ کو غنیمت جانا۔ ظاہر ہے کہ بغاوت میں بڑی خامی تنظیم کی کمی تھی۔

اس کے باوجود کہ بغاوت کو دبا دیا گیا اس نے ہندوستان میں قومی شعور پیدا کرنے میں نہایت اہم پارٹ ادا کیا اور نوآبادیاتی نظام کی مخالف قوتوں کی طرف سے بلالحاظِ مذہب، ذات اور زبان متحدہ جدوجہد کے لیے ایک مستحکم بنیاد رکھی۔

اس بات کے کہ اس وقت کے حالات کی وجہ سے دونوں ملکوں میں براہِ راست تعلقات قائم کرنے کی راہ میں آج کی نسبت بڑی رکاوٹیں درپیش تھیں۔ درحقیقت ہندوستانی اور چینی عوام مشترکہ دشمن کے خلاف اپنی جنگ میں ایک دوسرے پر اثر انداز تھے اور ایک دوسرے کے معین تھے۔

دوسری جنگِ افیون اُس وقت چھڑی جب برطانوی حملہ آوروں نے (جو چوری چھپے مال لے جانے والوں کے جہازوں کو پناہ دے رہے تھے) کینٹن کے پُرامن باشندوں کی بڑی تعداد کو قصداً قتل کیا۔ بحری ڈاکو یعنی نام نہاد "مہذب لوگ"، جن کی پشت پر توپخانہ اور توپوں سے لیس جنگی کشتیاں تھیں، دریائے پرل سے اوپر کی طرف اودھم مچاتے کینٹن تک چڑھ آئے۔ ۲۷ اکتوبر ۱۸۵۶ء سے انھوں نے پُرامن شہر پر متواتر بم برسائے۔ اُن کے بحری فوجی دستے شہر میں گھس گئے اور بے حد مظالم ڈھائے۔ زنا بالجبر، اغوا، قتل، اور ان مکانوں اور جائدادوں کو آگ کی نذر کرنا جن پر وہ ہاتھ ڈال سکے۔ حملہ آوروں کا خیال تھا کہ طاقت کے اس مظاہرے سے چینی عوام ڈر کر اطاعت پر مجبور ہو جائیں گے۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ لوگوں نے دشمن کے حملے کا جم کر مقابلہ کیا۔ برطانوی جنگی جہاز جو دریائے پرل میں گھس آئے تھے، طاقت کا مظاہرہ کرنے میں ناکام ہوئے اور مدافعت کرنے والوں کے زبردست جوابی حملوں سے جلد ہی کینٹن کے گرد و نواح سے تیزی کے ساتھ پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔

اس الجھن سے نجات پانے کے لیے اور جنگ کو وسعت دینے کے لیے شکست خوردہ حملہ آوروں نے ہندوستان سے فوجی دستے بھیجنے کی تدبیر سوچی۔ ۱۰ جنوری ۱۸۵۷ء کو برطانوی وزیر چین جے باؤرنگ نے ہانگ کانگ سے ہندوستان کے برطانوی گورنر جنرل، کیننگ کے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا۔ اس میں یہ التجا کی گئی کہ "اگر ممکن ہو تو ملکہ معظمہ کے پانچ ہزار فوجی جوان کسی قدر توپخانے کے ساتھ بلاتاخیر ہندوستان سے چین لڑنے کے لیے بھیج دیے جائیں۔"[۲] مشرقِ بعید کے برطانوی بحری بیڑے کے کمانڈر ایم۔ سیمور نے بھی کیننگ سے یہی درخواست کی۔

لیکن حملہ آوروں کا اندازہ پھر غلط نکلا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان اس قابل نہیں تھا کہ چین کے خلاف برطانیہ کی جارحانہ جنگ کے لیے کوئی کمک بھیج سکے۔ ہندوستان میں برطانیہ کی بے رحمانہ نوآبادیاتی پالیسی نے نفرت کے شعلے بھڑکا دیے تھے۔ اب ہندوستانی عوام مزید ظلم اور غلامی کی حالت کو برداشت نہ کر سکتے تھے۔ انگریز دشمنی کے بڑھتے ہوئے جذبات اُن ہندوستانی فوجیوں میں بھی پائے جاتے تھے جنھیں خود انگریزوں نے فوجی تربیت دی تھی۔ ۱۸۵۷ء کے موسم بہار میں

کرنے اور ان بیڑیوں کو توڑنے پر مجبور ہو گئیں جن میں انھیں جبراً جکڑا گیا تھا۔

چنانچہ ایشیا میں مغربی سرمایہ داری کی جارحانہ قوتوں کے بڑھنے اور پھیلنے پر نوآبادیاتی نظام کے خلاف جد وجہد ایک روزمرّہ کا واقعہ بن گیا اور اس نے لاچار مظلوم اور غلام ایشیائی قوموں کی ایک عظیم مشترکہ مہم کی صورت اختیار کر لی۔ جد وجہد کے یکساں نتائج، مفاد اور نصب العین نے ایشیائی قوموں کو ایک دوسرے سے وابستہ کر دیا اور ایشیا کی قومی آزادی کی تحریکوں میں نہایت قریبی رابطہ پیدا کر دیا۔ ہندوستان میں ۵۹-۱۸۵۷ء کی بغاوت پر بحث کرتے ہوئے مارکس نے بتایا کہ "قومی آزادی کی یہ ملک گیر جنگ اُس وقت شروع ہوئی جب ایشیا کی عظیم قومیں انگریزی اقتدار کے خلاف عام نفرت کا اظہار کر رہی تھیں۔ بلاشبہ بنگال کی فوج کی بغاوت کا ایران اور چین کی جنگوں کے ساتھ گہرا تعلق تھا۔"[17]

برطانوی فوجوں کے اینگلو ایرانی جنگ میں الجھنے سے ہندوستان کی عظیم بغاوت کے لیے سازگار حالات پیدا ہو گئے۔ برطانوی اور فرانسیسی حملے کے خلاف چینی لوگوں کی دوسری جنگِ افیون اور ہندوستانی بغاوت دونوں کا دراصل یہ اثر ہوا کہ دشمن بڑھنے سے رُک گیا جس سے دونوں کو فائدہ پہنچا۔ کسی ایشیائی ملک کی قومی آزادی کے لیے جد وجہد کی کامیابی اور ناکامی کا دوسرے ملکوں کی قومی آزادی کی تحریک پر دور رس اثر پڑتا تھا۔ یہ قریبی تعلق موجود تھا اگرچہ اس وقت ایشیا کے لوگوں نے اس کی اہمیت کو نہ سمجھا۔

(۲)

چین کے خلاف برطانیہ اور فرانس کی ۶۰-۱۸۵۶ء کی دوسری جنگِ افیون غارت گری کی جنگ تھی جو چین پر اپنے غلبے کو بڑھانے کے لیے مغربی سرمایہ دار لٹیروں نے شروع کی۔ خارجی حملے کے خلاف چینی عوام کی مزاحمت ایک برحق قومی جنگ میں بدل گئی۔ دراصل کئی پہلوؤں سے یہ پہلی جنگِ افیون کا ہی اعادہ اور حصہ تھی جو ۴۲-۱۸۴۰ء میں شروع ہوئی تھی۔ لیکن اُس وقت کی عالمی صورتِ حال کے پیشِ نظر ان دو جنگوں کے فرق کو سمجھنا ضروری ہے۔ پہلی جنگِ افیون کے دوران چینی لوگوں کو کوئی بلاواسطہ یا بالواسطہ امداد نہ ملی لیکن دوسری جنگِ افیون کے دوران ہندوستانی عوام رفیق اور بھائی بن کر ان کی مصیبت کی گھڑی میں آڑے آئے جب کہ وہ خود ۵۹-۱۸۵۷ء میں برطانوی نوآبادیاتی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے بہادری کے ساتھ جد وجہد کر رہے تھے۔ باوجود

ہے۔ باغیوں کے لیے میدان صاف ہوگا اور ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ کس طرح موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بغاوت کا یہ شعلہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل جائے گا اور بغیر دبے بھڑکتا رہے گا۔ جب تک دہلی باغیوں کے قبضے میں رہے گی کسی نہ کسی جگہ نت نئی بغاوت رونما ہوگی۔ یہ صورت حال خطرناک ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض نہایت اہم چھاؤنیوں میں جن کا میں نے ذکر کیا ہے، دیسی رجمنٹیں بگڑی ہوئی ہیں۔[۲]

اس نازک صورتِ حال کی اصلاح کے لیے کیننگ نے ایلگن کو لکھا کہ وہ بنگال میں لڑکھڑاتے ہوئے برطانوی نظام کو سہارا دینے کے لیے اپنی فوجیں کلکتے کی جانب بھیج دے۔ ایک سرکاری دستاویز میں یہ قلمبند ہے کہ گو ایلگن چین میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے بے تاب تھا لیکن اُسے کیننگ کی درخواست کی تعمیل کرنا پڑی۔ اس طرح بہادر ہندوستانیوں نے چین کی جانب بھیجی گئی برطانیہ کی مہماتی فوج کو راستے ہی میں روک لیا۔

آزادی اور خود مختاری کے لیے ہندوستانی لوگوں کی مصمم جدوجہد انگریزوں کے حملے کے خلاف چینی جنگِ مزاحمت کے لیے پھر سازگار ثابت ہوئی۔ ۲۰ اپریل ۱۸۵۷ء کو برطانوی وزیرِ خارجہ کلیرنڈن کی جاری کی ہوئی ہدایات کے مطابق یہ تجویز تھی کہ ایلگن چین میں وارد ہوتے ہی اپنی مہماتی فوج کے ساتھ شمال کی جانب چڑھائی کرے گا اور منچو سرکار کو سنگینوں کے زور سے نئے غیر مساوی معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے مجبور کرے گا لیکن ہندوستانی شورش کے سبب یہ جارحانہ مقصد ایک سال تک پورا نہ ہو سکا۔

ہندوستانی بغاوت نے چین میں حملہ آور فوجوں کو جانے والی کمک کو روک لیا۔ یہ تصویر کا ایک رُخ ہے۔ دوسری طرف برطانوی حملے کے خلاف چینی عوام کی جنگ ہندوستانی لوگوں کی جدوجہد کے حق میں جوابی امداد ثابت ہوئی اور اس نے دشمن کو روکنے میں مدد دی۔ ہندوستانی بغاوت کے پھوٹنے کے بعد انگریزوں نے مشرق بعید میں اپنی تمام فوجوں کو اکٹھا کرنے کی کوشش کی تاکہ پہلے ہندوستانیوں کی سرکوبی کی جائے اور پھر چین سے نپٹا جائے۔ لیکن چینی عوام کی مسلسل جدوجہد نے ان کی یہ تدبیر ناکام کر دی۔ اگرچہ ایلگن نے چین کو جانے والی برطانوی فوج کا کچھ حصہ ہندوستان کو بھیج دیا پھر بھی چینیوں نے برطانوی بحری اور برّی فوجوں کی خاصی تعداد کو الجھائے رکھا۔ اپنی ڈاکہ زنی کے مفاد کے تحفظ کی خاطر حملہ آور چین میں اُن فوجوں کو رکھنے پر مجبور تھے۔

جون ۱۸۵۷ء میں ہندوستانی بغاوتوں کے شعلے میرٹھ اور دہلی سے گنگا کی وادی میں دوسرے مقامات تک پھیل گئے۔ کلکتے میں بھی شورش کی آگ سُلگ رہی تھی۔ برطانوی حکمراں خوف

ہندوستانی فوجیوں نے جو بیدار ہو چکے تھے، انگریزوں کے خلاف یکے بعد دیگرے کئی ایک چھوٹی موٹی بغاوتیں بپا کیں۔ یہ آنے والے انقلابی طوفان کے آثار تھے۔ اُن حالات کے پیش نظر ہندوستان میں برطانوی حکّام کی حالت چین میں حملہ آوروں کی نسبت کسی طور بہتر نہ تھی۔ چین کے خلاف حملے کے لیے ہندوستان سے فوجی دستے بھیجنا خام خیالی تھی۔ کیننگ کے نام باوُرنگ کی اپیل قدیم تاریخی دستاویزات کے انبار میں اس طرح کھو گئی جیسے کنکر سمندر میں کھو جاتا ہے۔

پس دوسری جنگِ افیون کے آغاز سے ہی چینی لوگوں کو ہندوستانی بھائیوں سے عملی طور پر امداد ملنی شروع ہو گئی تھی۔ مدافعت، آزادی اور خود مختاری کے لیے اپنی اپنی جدوجہد میں دونوں قوموں نے ایک دوسرے کی مدد کرنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا شروع کر دیا اور دونوں نے مل کر دشمن کا مقابلہ کیا۔

مارچ ۱۸۵۷ء میں برطانوی سرکار نے ماریشس اور برطانیہ سے کمک بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ نوآبادیاتی حکومت کے مسلّم الثبوت استاد لارڈ ایلگن کو جو بعد میں ہندوستان کا گورنر جنرل بنا اور طویل عرصے تک اس عہدے پر مامور رہا، چین میں سفیرِ خصوصی مقرر کیا گیا۔ اس کے ذمّہ یہ کام تھا کہ بڑے پیمانے پر مسلّح قوت کا مظاہرہ کر کے دشمن کو مرعوب کرے۔ لیکن جب ہندوستانی لوگوں نے بڑی حد تک اس نئے جارحانہ منصوبے میں روڑا اٹکا دیا تو نوآبادکاروں کو بڑی ذہنی کوفت ہوئی۔ ۱۰ مئی کو جب برطانوی مہاتی فوجوں نے مشرق کی جانب حرکت کی تو بہادر ہندوستانیوں نے برطانیہ کے خلاف عظیم بغاوت کا بگل بجا دیا۔ دہلی پر فی الفور قبضہ کر لیا گیا۔ نوآبادیاتی حکومت کو خطرہ درپیش ہوا کہ کہیں اس کا تختہ نہ الٹ جائے۔ اس سے تھوڑی دیر ہی پہلے باوُرنگ نے کیننگ سے امداد کے لیے درخواست کی تھی۔ اب کیننگ کی باری تھی کہ ایلگن سے مدد مانگے۔ جب ایلگن سنگاپور کے راستے سے چین کو جا رہا تھا تو ۳ جون ۱۸۵۷ء کو لارڈ کیننگ کی طرف سے اُسے ایک مراسلہ ملا۔ اس میں ہندوستان کی دور دور تک پھیلی ہوئی بغاوت کا بیان اور انگریزوں کی نازک حالت کا ذکر تھا۔ کیننگ نے لکھا:

”گنگا کی وادی میں کلکتہ اور آگرہ کے درمیان ۷۵۰ میل لمبے علاقے میں بمشکل سے ایک ہزار فرنگی فوج موجود ہے جب کہ کئی اہم شہر اور چھاؤنیاں ایسی ہیں جہاں قلعے، فوجی گودام، خزانے اور فرنگیوں کی بڑی شہری آبادیاں ہیں۔ ان پر صرف دیسی فوجی دستے متعین ہیں۔ اگر ان میں سے کسی مقام پر بغاوت رونما ہوئی تو حکومتِ ہند کے پاس سچ مچ اس کو دبانے کے لیے کوئی فوج نہیں

کس طرح ہندوستانی بغاوت پر خوشیاں منائیں۔" اس وقت ہانگ کانگ کے کچھ لوگوں نے بتایا کہ انگریزوں کو روپے کی اس قدر تنگی کا سامنا ہے کہ نہ صرف فوجیوں کو تنخواہیں دیر سے ملتی ہیں بلکہ انھیں اپنے روزمرہ کے اخراجات پورے کرنے میں بھی مشکل پیش آتی ہے۔ انھیں چین کے ساتھ تجارت کرنے کی سخت ضرورت ہے۔" کچھ اور لوگوں نے یہ بیان کیا کہ ہمیں پتہ چلا ہے کہ برطانوی صوبہ بنگال نے بغاوت کر دی ہے اور انگریز فوجی دستوں کو شکست ہوئی ہے۔ ایک دو مہینے کے بعد پھر یہ افواہ پھیلی کہ انگریزی فوجی دستے گھات میں چھپے بیٹھے تھے اور ان کو کلیۃً نیست و نابود کر دیا گیا ہے۔ ایک سپہ سالار اور بعض لوگوں کے قول کے مطابق شہنشاہی خاندان کا ایک داماد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ دوسرے جرنیل اس قدر دہشت زدہ تھے کہ ان کو کچھ نہ سوجھتا تھا کہ کیا کریں۔ یہ خبریں لب بہ لب پھیلتی تھیں اور ہر کوئی ایک ہی بات کہتا تھا۔ جب گورنر جنرل یے۔ منگ۔ شین سے اصلی حالت کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ مجھے بھی مختلف اطراف سے اسی قسم کی اطلاعات ملی ہیں۔ حسنِ اتفاق سے ہانگ کانگ کے تاجروں سے جو خطوط آتے اُن میں بھی یہی داستان ہوتی۔ لوگ خوشی سے پھولے نہ سماتے۔" ۶

اگرچہ ہندوستان کے واقعات کا یہ بیان کلیۃً صحیح ثابت نہ ہو (اور اس وقت یہ بات ناگزیر تھی) پھر بھی بغاوت سے متعلق کوانگ تنگ کے لوگوں کی شدید بے تابی اور یہ خواہش ظاہر ہے کہ ان کے ہندوستانی بھائی کامیاب ہوں۔ اس وقت برطانوی حملے کے خلاف کوانگ تنگ جنگ کا سب سے اگلا محاذ تھا۔ یہ نسبتاً ہندوستان کے قریب تھا اور ہانگ کانگ اس کے عین پڑوس میں تھا۔ اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ کوانگ تنگ کے لوگ سب سے پہلے ہندوستانی واقعات کی خبریں پاتے اور ان سے متاثر ہوتے۔

نہ صرف چینی عوام ہی ہندوستانی بغاوت کے واقعات میں گہری دل چسپی رکھتے تھے بلکہ یے ہنگ۔ شین بھی جو اس وقت کوانگ تنگ اور کوانگسی صوبوں کا گورنر جنرل اور صوبہ کوانگ تنگ میں برطانوی حملہ آوروں کے خلاف جنگ کا سپہ سالار تھا، ہندوستانی لوگوں کی جد وجہد پر پوری پوری توجہ دیتا تھا۔ شہنشاہ کے نام عرضداشتوں میں وہ بار بار ہندوستانی بغاوت کی کامیابی کا ذکر کرتا اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچتا کہ "غیر ملکیوں کا حشر کسی طور اچھا نہ ہوگا۔" یہی اہم وجہ تھی کہ برطانوی حملہ آور "کمک نہ بھیج سکے۔" ۱۸۵۹ء میں سن کیانگ کے تاتاری جرنیل، چلا فینتا اور ماندرین فاہنو لی نے سن کیانگ کے روسی قونصل کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے رسمی طور پر یہ مشورہ دیا کہ برطانیہ کے خلاف معاہدہ کرنے

سے حواس باختہ ہو گئے۔ بار بار کیننگ نے ایلگن (جو ہانگ کانگ میں پہنچ چکا تھا) سے زیادہ فوجی امداد بھیجنے کا تقاضہ کیا۔ اوّل الذکر کے بار بار مدد کے لیے اپیل کرنے کے باوجود ایلگن جو خود شکل میں تھا، چینی علاقے سے ایک بھی سپاہی نہ ہٹا سکتا تھا۔ اُسی سال ۲۹ جولائی کو اس نے کلیرنڈن کی خدمت میں مذکورہ ذیل رپورٹ بھیجی:

"لارڈ کیننگ کی درخواست کی حتی المقدور تعمیل کی غرض سے ان وسائل کا ملاحظہ کرنے کے بعد جو میرے اختیار میں ہیں میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ایک طرف تو ہانگ کانگ میں مامور قلیل قلعہ دار فوج کے کسی حصّے کو ہندوستان کی جانب بھیجنے کی کوشش بے سود ہوگی، دوسری طرف بحری فوج میں ٹھوس کمی کرنا کافی خطرے کا موجب ہوگا کیوں کہ مختلف معاہداتی بندرگاہوں میں مقیم ہموطنوں کی حفاظت اور کینٹن کے ساتھ سلسلۂ رسل و رسائل کے قیام کے لیے اسی فوج پر ہمارا مدار ہے۔"[۴]

آخر کار ایلگن نے کیننگ کو "اخلاقی امداد" دینے کا انوکھا ڈھنگ اختیار کیا، وہ تن تنہا کلکتے گیا۔ اس نے اپنی آمد کی یہ وضاحت کی کہ اس کی وجہ سے برطانوی فوجیوں کا حوصلہ بڑھے گا کیوں کہ اس کی موجودگی کو چین سے بھاری کمک کا پیش خیمہ سمجھا جائے گا۔[۵] چینی اور ہندوستانی عوام کی مشترکہ ضربوں سے برطانوی حملہ آوروں کی حالت ڈانوا ڈول اور نازک ہو گئی ہوگی۔

چینی عوام کو اپنے لڑنے والے ہندوستانی بھائیوں کے ساتھ گہری ہمدردی تھی اور اُن کی کامیابیوں سے ان کے حوصلے بلند ہوئے لیکن ہندوستانی نصب العین کے حق میں ہمدردی کا یہ احساس مؤثر طور پر ظاہر نہ ہو سکا کیوں کہ اس وقت چین کے اپنے کوئی اخبار نہیں تھے اور جو تحریری دستاویزات اُس کے ہاتھ لگیں اُن کی تعداد محدود تھی۔ پھر بھی حکمران طبقے کی چھوڑی ہوئی متفرق تحریروں سے یہ پتہ چلانا مشکل نہیں کہ ہندوستانی بغاوت کے تئیں چینی لوگوں کا رویّہ کیا تھا۔ ایک مضمون بعنوان "کینٹن میں یے منگ شین کی انگریزوں کے ہاتھوں گرفتاری کے کوائف" میں سوئے خو۔ چینگ نے۔ جو سفارت کا ایک رُکن تھا، یہ لکھا، "کینٹن کے لوگ انگریزوں سے نفرت رکھتے ہیں۔ یہ افواہیں پھیلی ہوئی ہیں کہ انگریزوں کے تحت ملک ہندوستان نے بغاوت کر دی ہے اور برطانوی فوجوں کو شکست ہوئی ہے اور وہ کئی کمانڈروں سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔" اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ صوبہ کوانگ ٹنگ کے عوام کس طرح سرگرمی کے ساتھ ہندوستانی بغاوت کی خبریں حاصل کرتے رہے۔ ہوانگ پھے، مجسٹریٹ ضلع نہائی، صوبہ کوان ٹنگ اپنی تصنیف "غیر ملکیوں کے ساتھ راہ و رسم کی داستان" میں اپنے ذاتی تجربے کو بیان کرتے ہوئے کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ کوان ٹنگ کے عوام نے

نوآبادیاتی نظام کے خلاف اُن کی جد وجہد کمزور ہو جائے، صحیح راستے سے ہٹ جائے اور بالآخر ناکام ہو جائے۔ ۱۸۵۷ء میں ہی جب ہندوستانی بغاوت کی آگ تیزی سے بھڑک رہی تھی "ٹائمز" کے ایک نامہ نگار نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ غیر معتبر ہندوستانی فوجیوں کو چینیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیج دیا جائے۔ اس نے کہا: "بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ہندوستان میں تادیبی اقدامات کو عمل میں لانے اور ساتھ ہی چین کے ساتھ جنگ کو جاری رکھنے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے گی۔ بے شک بعض ایسی سپاہی رجمنٹیں ہیں جو بظاہر باغی نہیں ہیں لیکن ان کے ہم مذہبوں کے خلاف کارروائی کرنے میں اُن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ان کو چین میں کیوں نہ بھیج دیا جائے؟" فی الواقع دوسری جنگِ افیون کے آخری مراحل میں برطانوی حکام نے کچھ ہندوستانی فوجیوں کو چین بھیجا۔

جب ہندوستانی بغاوت پوری طرح دب گئی تو انگریزوں اور منچو حکمرانوں میں گاڑھی چھننے لگی۔ انگریزوں نے ہندوستانی فوجی بھیجے تاکہ وہ توپوں کا نشانہ بن کر چینی انقلاب پسندوں کی سرکوبی میں منچو فرمانرواؤں کی مدد کریں۔

انگریزوں کو ایشیائیوں کے ساتھ ایشیائیوں کو لڑانے کا ناپاک منصوبہ سوجھا لیکن واقعات ان کی حسب خواہش رونما نہ ہوئے۔ جب وہ سیکڑوں ہندوستانی فوجیوں کو تائی پنگوں کے خلاف میدانِ جنگ میں جھونک رہے تھے تو کچھ باشعور ہندوستانی انقلاب پسندوں کے ساتھ شامل ہو گئے اور ان کے دوست بن گئے۔ انھوں نے اپنی توپوں کا منھ تمام غیر ملکی دخل انداز فوجیوں کی طرف موڑ دیا جن میں برطانوی فوجی دستے بھی شامل تھے۔ چینی ہندی تعلقات کی تاریخ میں یہ ایک سنہرا ورق ہے اور نوآبادیاتی نظام کے خلاف جنگ میں چینی اور ہندوستانی عوام کے مابین یہ سیدھے تعاون کا آغاز تھا۔

جہاں تک دستیاب مواد سے ہمیں معلوم ہے تائی پنگوں کی صفوں میں ہندوستانیوں کی شمولیت کا ذکر پہلی بار سینگ کو فان کے ایک خط میں کیا گیا جو تائی پنگوں کا جانی دشمن تھا۔ ایک اور جرنیل ہوتن اوّل کے خط کے جواب میں اس نے لکھا: "میں نے سُنا ہے کہ صدر مقام ضلع یوشان کا محاصرہ کرنے میں باغی وفادار پرنس لی سو۔ چینگ کے سپاہیوں میں کچھ کالی چمڑی والے غیر ملکی بھی شامل تھے۔"[۱۱]

جس چیز کا ذکر یہاں سینگ کر رہا ہے وہ ۱۸۶۱ء کے شروع میں نامور سالار لی سو۔ چینگ کے زیرِ کمان تائی پنگ فوجوں کا صوبہ کیانگسی میں صدر مقام ضلع یوشان کا محاصرہ ہے۔ "کالی چمڑی والے غیر ملکی ضرور ہندوستانی ہوں گے کیوں کہ منچو حکمران عام طور پر ہندوستانی فوجیوں کو "ہیں چو (ہندوستان) کے کالی چمڑی والے فوجی" کہتے تھے۔

کے لیے ایک خاص وفد ہندوستان کو بھیجا جائے۔ یہ ایک ایسی اعلیٰ مہم تھی جو اُن کی رائے میں دشمن پر فتح کی موجب ہوگی۔ شہنشاہ کے نام یادداشت میں چلا ینتا اور فا ہقولی نے روسی قونصل کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

"اب برطانیہ اور فرانس دونوں اپنی فوجوں کو منظم کر رہے ہیں۔ وہ جنگی جہازوں کی بھی مرمت کر رہے ہیں۔ وہ انتقام کی غرض سے اگلے سال فروری یا مارچ میں اپنی متحدہ افواج کے ساتھ ٹائنسن پر چڑھائی کرنے کے لیے تیار ہو رہے ہیں۔ اس وقت مصلحت کا تقاضہ یہ ہے کہ انھیں کی لاٹھی سے اُن کا سر کچلا جائے۔ ہندوستان ایک زرخیز ملک ہے اور برطانوی مقبوضات میں نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ گو وہاں قلعوں میں برطانوی فوجیں متعین ہیں لیکن وہاں عوام کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف شدید نفرت کا جذبہ پایا جاتا ہے اور عرصے سے بغاوت کی آگ سُلگ رہی ہے۔ ہمارے لیے یہ موقعہ غنیمت ہے۔ اگر کوئی قابل شخص خفیہ طور پر وہاں بھیجنا ممکن ہو اور ہندوستانیوں سے تعاون کرنے کا وعدہ لیا جا سکے تو انگریز اُن کے مقابلے پر نہ ٹھہر سکیں گے۔ اس طرح انگریزوں پر اندرونی ہنگامے کا خوف طاری ہو جائے گا اور پھر شاید چین کے ساتھ جنگ کا خطرہ ٹل جائے گا۔"[۸]

ایک اور یادداشت میں چلا ینتا اور فا ہقولی نے پھر اس بات پر زور دیا کہ "جو کچھ روسی قونصل نے کہا ہے وہ بالکل درست ہے اور اس کی تجویز قطعاً قابلِ عمل ہے"[۹] انھوں نے شہنشاہ سے درخواست کی کہ اس تجویز کو قبول کیا جائے۔ اگرچہ اس زمانے کی مجبوریوں کے سبب اس تجویز کی تعمیل ناممکن تھی تاہم یہ بات محلِ غور ہے کہ سو سال پہلے چین میں غیر ملکی حملے کے خلاف مشترکہ مزاحمت کے لیے ہندوستان کے ساتھ معاہدہ کرنے کا خیال موجود تھا۔

(۳)

اگرچہ برطانوی نوآبادکاروں نے ہندوستانی لوگوں کی بغاوت کو بے دردی کے ساتھ دبا دیا اور دوسری جنگِ افیون میں چین نے شکست کھائی پھر بھی ان دونوں ملکوں کی قومی آزادی کے لیے جدوجہد پورے زور کے ساتھ جاری رہی۔ جن دور اندیش اور دلاور ہندوستانیوں نے چینی عوام کے انقلاب میں حصہ لیا ان کے بہادری کے کارناموں کا علم بھی اسی وقت ہوا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ چینی اور ہندوستانی لوگوں کا باہمی رابطہ برطانوی حملہ آوروں کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا کیوں کہ وہ چاہتے تھے کہ یہ دو بڑی ایشیائی قومیں باہم نفرت کریں اور لڑیں مریں تاکہ

نے جو سابقہ" پانچویں بمبئی نیٹو انفینٹری سے تعلق رکھتے تھے' تائی پنگوں کے ساتھ لڑتے لڑتے اپنی جان دی"۔[۱۵]

اسی سال ۷ اکتوبر کو صوبہ چیکیانگ میں ہینچو اور یو ہانگ کے درمیان بمقام شہلی چانگ۔ چیچ ایک لڑائی میں منچوؤں اور فرانسیسیوں کی متحدہ فوج نے "چند لٹیروں کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا۔ ان میں ایک کالی چمڑی والا اجنبی بھی تھا"۔[۱۶]

تائی پنگوں میں کالی چمڑی والے اجنبیوں کی موجودگی کی اور مثالیں بھی مل سکتی ہیں۔[۱۷] مذکورہ بالا تین مثالوں میں تائی پنگ فوجیں لی سو چینگ کے زیر کمان تھیں جو غیر ملکی مداخلت پسندوں کے مقابلے پر انقلاب پسندوں کے کیمپ میں سب سے زیادہ مستقل مزاج اور باہمت سپہ سالار تھا۔ اس لیے اس بات کا پورا احتمال ہے کہ غیر ملکی فوجی دستوں کے خلاف متواتر جنگوں میں کچھ ہندوستانی سپاہی اس کی فوجوں میں چلے آئے۔

جو ہندوستانی سپاہی چین میں برطانوی فوجی حکام کی سخت نگرانی اور دباؤ کے تحت تھے' ان کے لیے تائی پنگوں کی طرف چلے آنا کس طرح ممکن تھا؟ جو تاریخی مواد دستیاب ہے اس کے مطابق اس بات کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ جن گرفتار شدہ ہندوستانیوں نے میدانِ جنگ میں ہتھیار ڈال دیے تھے وہ انھی میں سے تھے جو انقلاب پسندوں کے ساتھ مل گئے تھے۔ چین میں برطانوی وزیر کے نام ایک خط مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۲ء میں شنگھائی کے برطانوی قونصل نے لکھا: "ایک دو دن ہوئے سُوچو سے بلجیم کا ایک بھگوڑا آیا تھا۔ اس نے کہا: میں نے شہر میں دو فرنگیوں کو دیکھا جو اسلحہ اور گولہ بارود کے نفع بخش کاروبار کا ذکر کر رہے تھے۔ انھوں نے مجھے بتایا کہ جو چار سپاہی گذشتہ مئی میں میدانی توپ پر قبضہ کرنے کے وقت قیدی بنائے گئے تھے ابھی زندہ ہیں اور سُوچو میں موجود ہیں"۔[۱۸]

نیز اور بھی ہندوستانی فوجی ہوں گے جو اُن چار سپاہیوں کی طرح گرفتار ہو کر آہستہ آہستہ عملی زندگی کے مشاہدے اور تجربے سے روشن خیال ہو گئے اور بعد میں انھوں نے رضاکارانہ اپنی خدمات چینی انقلاب پسندوں کو پیش کیں۔

ہندوستانیوں کی کچھ کمتر تعداد مختلف طریقوں سے تائی پنگوں کے ساتھ شامل ہوئی۔ آگسٹس لنڈے نام کے ایک انگریز نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ وہ خود اور ایک "ہندوستانی ساتھی" کس طرح اکتوبر ۱۸۶۳ء میں تائی پنگوں کے ساتھ شامل ہونے کے لیے شنگھائی سے سُوچو گئے۔[۱۹] بظاہر یہ "ہندوستانی ساتھی" ایک رضاکار تھا جو تائی پنگ تحریک کا حامی تھا۔ یہ کتاب ایک برطانوی

جن حالات میں ہندوستانی لی سوچینگ کے زیر کمان خدمت بجالانے کو آئے وہ پردۂ تاریکی میں ہیں لیکن ہم یہ بات یقیناً جانتے ہیں کہ اگست ۱۸۶۰ء میں جب لی نے شنگھائی پر فوج کشی کی تو برطانوی حملہ آوروں نے کھلم کھلا مداخلت کی اور ہندوستانی فوجی دستوں کو تائی پنگوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا۔[۱۲] جلد بعد لی کے فوجی دستے کیانگسی میں گھس گئے۔ اس بات کا قوی احتمال ہے کہ جو ہندوستانی ان میں شامل تھے وہ قلعہ شنگھائی کی برطانوی فوج سے آئے ہوں گے۔

یہ حقیقت قابلِ غور ہے کہ جب برطانوی حکام تائی پنگوں کی سرکوبی میں براہِ راست حصہ لینے لگے تو اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد ہندوستانیوں نے تائی پنگوں کے ساتھ مل کر لڑائی کی۔ اس سے ظاہر ہے کہ بعض دور اندیش ہندوستانی چین کی قومی آزادی کے نصب العین کے حامی تھے اور برطانوی حملے کے خلاف جدوجہد میں براہ راست شامل ہو گئے۔ انہوں نے برطانوی مداخلت پسندوں کے برعکس روش اختیار کی۔ انہوں نے نوآبادیاتی نظام کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کے مابین سیدھے تعاون کی بنیاد رکھی۔ اُن کی یہ دین ہمیشہ یادگار رہے گی۔

تھوڑی مدت کے بعد ہی مزید ہندوستان فوجیوں کو تائی پنگ تحریک کے انقلاب پسندوں کے قتلِ عام کو زیادہ شدت کے ساتھ انجام دینے پر مجبور کیا گیا۔[۱۳] یہ واقعی افسوس کا مقام تھا۔ البتہ تائی پنگوں اور مداخلت پسندوں کے مابین جدوجہد کے تلخ ترین برسوں (۱۸۶۲-۶۳ء) کے دوران باشعور ہندوستانیوں کی روز افزوں تعداد میدانِ جنگ میں بھی انقلاب پسندوں کا ساتھ دینے لگی جہاں انتہائی گھمسان کی لڑائیاں لڑی گئیں (کیانگسی اور چیکیانگ کے صوبوں کے مختلف علاقوں میں) چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱۹ر فروری ۱۸۶۳ء کو شاؤ ہسنگ صوبہ چیکیانگ کی ایک لڑائی میں تائی پنگوں کے ساتھ صف آرا ہندوستانیوں نے ایک فرانسیسی افسر تاردو مواد رے کا کام تمام کرنے میں مدد کی۔ یہ افسر منچوؤں کا مددگار تھا۔ منچو سرکار کی دستاویزات کے مطابق منچوؤں اور غیر ملکیوں کی متحدہ فوجوں نے اس دن "سی کو گیٹ کے باہر سے شاؤ ہسنگ پر بمباری کی، شہر کی سو فٹ سے زیادہ بلند دیوار کو گرا دیا اور بے شمار قزاقوں کو ہلاک کر دیا۔ تاردو اکیلا پُل پر کھڑا تھا اور اپنے فوجی دستوں کو شہر کی دیوار پر چڑھنے کی تاکید کر رہا تھا۔ پتھر کلا بندوقوں اور کنکروں کے ساتھ لیس باغی شنگافوں کی حفاظت پر مامور تھے۔ پچاس ساٹھ کالی چمڑی والے اجنبیوں نے باغیوں کی امداد میں تاردو پر سیدھی بندوق سر کی اس کے سر میں گولی لگی اور جان بحق ہوا۔"[۱۴]

اُسی سال ۲ر مئی کو کیانگ سو صوبہ کے ضلع تائی سانگ میں ایک مٹھ بھیڑ کے دوران نین سیاہیوں

اُن کی غیر فانی روح کے وارث ہیں۔ ان میں سے کئی ایک نے چینی عوام کے انقلابی مقصد کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔

البتہ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اُس وقت ہندوستان اور چین کی عظیم قوموں کے درمیان تعاون عام اور مکمل نہ تھا بلکہ ابھی ابتدائی حالت میں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ برطانوی حملہ آوروں نے جو اُس وقت سختی کے ساتھ ہندوستان پر حکومت کرتے تھے ہندوستانیوں کو چین میں جاکر اپنے مفاد کے لیے لڑنے پر مجبور کیا۔ اس سے ہندوستانی اور چینی عوام کے بیچ زیادہ دوستانہ رابطہ اور مفاہمت کے قیام میں رکاوٹ پڑی۔ جن ہندوستانی فوجیوں کو چین میں بھیجا گیا وہ بے شک برطانوی جارحانہ پالیسیوں کا شکار تھے۔ ان کا حشر یہ ہوا کہ وہ برطانوی فوجی حکام کے حکم کے بندے اور غلام بن کے رہ گئے۔ یہ بھی برطانوی نوآبادیاتی نظام کا قصور تھا۔

اب تاریخ نے اپنے فیصلے کا اعلان کر دیا ہے اور صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔ جس طرح سو سال پہلے نوآبادکار حکم چلا سکتے تھے اور حسب مرضی بلا روک ٹوک منصوبے باندھ سکتے تھے آج ممکن نہیں۔ ہندوستان اور چین کے لوگ آزاد اور متحد ہیں اس لیے اب وہ نوآبادیاتی نظام کے مقابلے پر طاقتور حریفوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہماری دو قوموں کے درمیان براہِ راست اور وسیع تعاون کی بنیاد رکھ دی گئی ہے اور شہنشاہیت پرستوں کی طرف سے ہمارے عوام میں نفاق ڈالنے کی کوشش ناکام ہو گی۔ جب ہمیں اُن شہیدوں کا خیال آتا ہے جنھوں نے جبر و ستم کے خلاف جدوجہد میں اپنی جانیں قربان کیں تو ہمارے دل فخر اور شکرگزاری کے جذبات سے معمور ہو جاتے ہیں۔

حواشی

۱۔ انڈیا ٹوڈے، "مارکس آن ریوولٹ آف ۱۸۵۷ء" جلد دوم، نمبر ۳ صفحہ ۲۴

۲۔ "دی سیکنڈ چائنا وار، ۶۰-۱۸۵۶ء" مرتبہ ڈی۔ بانر تھ و ای۔ لبی۔ صفحہ ۱۶۲

۳۔ "بلیو بک": کارس پانڈنس ریلیٹو ٹو دی ارل آف ایلگن، س سپیشل مشنز ٹو چائنا اینڈ جاپان ۵۹-۱۸۵۷ء، صفحہ ۸

۴۔ ایضاً صفحہ ۲۶

۵۔ ایضاً صفحہ ۲۶

۶۔ ہُوا ٹنگ چی (چن کو چوجین)، "این اکاؤنٹ آف کنٹیکٹ وِد فارنرز" جلد دوم، از

ایسٹ انڈین باشندے" کا بھی ذکر کرتی ہے جس کا ارادہ یہ تھا کہ ایچ۔ اے۔ برجوائن وغیرہ کے ساتھ صوبہ فوکین میں تائی پنگوں کی پارٹی میں شامل ہو جائے۔[۲۰]

جن ہندوستانیوں نے رضا کارانہ طور پر تائی پنگوں کا ساتھ دیا وہ اُن عوام کے عالی نمائندے تھے جنھوں نے سو سال پہلے غیر ملکی حملے کے خلاف چینی اور ہندوستانی عوام کی مشترکہ مزاحمت کی مشعل روشن کی۔ ان کے دلوں میں چینی انقلاب پسندوں کے لیے گہری ہمدردی تھی یہ ہمدردی ان کے نجی تجربے کا نتیجہ تھی اور انھوں نے غیر ملکی جابروں کے خلاف چینی انقلاب پسندوں کے ساتھ شامل ہونے کے پہلے موقعہ ہی کو غنیمت جانا۔ جہاں تک اُن ہندوستانی فوجیوں کا تعلق ہے جو گرفتار ہونے کے بعد تائی پنگ تحریک کو سمجھنے اور اس کی حمایت کرنے لگے اُن میں لازماً خیالات کی تبدیلی پیدا ہوئی ہوگی۔ اس کا ایک اہم سُراغ لنڈلے نے چھوڑا ہے۔ اس نے لکھا: "جو لوگ تائی پنگوں کی امداد کرنے میں مصروف تھے اُنھوں نے تمام مصائب اور خطرات کے باوجود اس راستے کو کیوں پسند کیا۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ انقلاب پسندوں کے ساتھ ایک ہی ملاقات سے منچوؤں پر ان کی برتری ظاہر ہو جاتی اور اس بنا پر وہ اُن کی ہمدردی اور عملی امداد حاصل کر لیتے۔"[۱]

لنڈلے یورپی ہمدردوں کا ذکر کر رہا ہے۔ اگر فرنگیوں کی صورت میں یہ درست تھا تو ہندوستانیوں کی حالت میں تو یہ اور بھی زیادہ صحیح تھا کیوں کہ وہ روایتاً حق اور حریت کے دل دادہ تھے اور غیر ملکی حملہ آور اُن کی مادرِ وطن اور ان کے بھائیوں کو پامال کر رہے تھے۔ جوں ہی انھوں نے برطانوی فوج کی قید سے نجات پائی چینی انقلاب پسندوں کی عملی جدوجہد سے اُن کی آنکھیں کھلیں اور اُن کا سیاسی شعور بڑھا۔ وہ مشترکہ دشمن کے خلاف آزادی کے مجاہدین بن گئے۔ اس لیے چینیوں کی قومی آزادی کی تحریک کے حق میں اُن کی امداد نہ صرف دونوں قوموں کے مابین دوستانہ تعلقات کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے بلکہ اس سے اُن کی اپنی زندگی میں نئے معنی پیدا ہوئے۔ اس مثال سے اس حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ جب مظلوم لوگ ایک دوسرے کے دست گیر ہوتے ہیں تو تبھی وہ اپنی قوم اور خود اپنے لیے نجات کا راستہ پا لیتے ہیں۔

تائی پنگوں کے ہندوستانی ساتھی چینی انقلاب پسندوں کے دوش بدوش لڑتے ہوئے اس نفرت کا اظہار کرتے جو چینی اور ہندوستانی عوام مشترکہ طور پر غیر ملکی جابروں کی نسبت رکھتے تھے۔ وہ دونوں قوموں کے مشترکہ مفادات کے ترجمان تھے جو قومی آزادی کی خاطر جدوجہد کر رہی تھیں۔ وہ بجا طور پر ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے سورماؤں کے جانشین، اُن کے ناتمام نصب العین اور

ہسٹاریکل سوسائٹی۔

۱۸۔ ایس۔او۔ ۲۲۹/۲۲۸، مراسلہ ڈبلیو۔ایچ۔ ہیدھرسٹ۔ بنام ایف۔بروس، مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۸۶۲ء

۱۹۔ آگسٹس بلٹے: بحوالہ تصنیف جلد دوم، صفحات ۳۶-۶۲۲

۲۰۔ ایضاً ؍ ؍ ؍ صفحہ ۸۰۰

۲۱۔ ایضاً ؍ ؍ ؍ صفحات ۷۷-۴۷۶

"وی ڈیٹا فروم ماڈرن ہسٹری" مرتبہ دی ہسٹاریکل انسٹی ٹیوٹ آف دی چائنیز اکاڈمی آف سائنسز، نمبر ۲، ۱۹۵۶ء، صفحہ ۱۰۸

۷۔ "اے کمپلیٹ اکاؤنٹ آف دی ٹرانزیکشن آف فارن الیفیرز" بعہد حکومت سین فینگ، منچو خاندان جلد ۱۵ ویں صفحہ ۶

۸ ایضاً جلد ۴۷ ویں صفحہ ۱۷

۹۔ ایضاً جلد ۴۷ ویں صفحہ ۱۸

۱۰۔ جی۔ ڈبلیو۔ گک: "چائنا" صفحہ ۳۷

۱۱۔ "کارس پانڈنس آف سینگ کواوفان"، صفحہ ۱۴۸ از "دی کمپلیٹ ورکس آف سینگ کواوفان" جلد سوم، مطبوعہ ورلڈ بک کمپنی۔

۱۲۔ ایل برائن، "دی تائی پنگ ری بلین ان چائنا" صفحات ۵۵ - ۲۵۴

۱۳۔ شنگھائی کے گرد و نواح میں پانچویں بمبئی این۔ آئی۔ اور بائیسویں پنجاب این۔ آئی کے فوجی اقدامات برطانوی حکام کے زیر ہدایت ۱۸۶۲ء کے بعد عمل میں آئے۔

۱۴۔ "میموریلز آف لی ہنگ۔ چنگ" جلد سوم، صفحات ۶ - ۵۔ اس مٹھ بھیڑ میں برطانوی افسر ٹھنانگ جو منچوؤں کی طرف سے لڑا، بھلک۔ طور سے زخمی ہوگیا۔ اس کی موت سے انگریزوں میں اضطراب پیدا ہوگیا۔ ملاحظہ فرمائیں: جلد دوم، صفحات ۸۹ - ۵۸۷، "تائی پنگ تین واہ"، مصنف لینلے (تاریخ بغاوت تائی پنگ)۔ کلمات "ڈاکو" اور "باغی" جو اقتباسات میں استعمال کیے گئے ہیں جو نفرت کے کلمے ہیں جو منچو عدالت نے تائی پنگوں کو رسوا کرنے کے لیے استعمال کیے۔

۱۵۔ اے۔ ولسن: "دی ایور وکٹوریس آرمی" صفحہ ۱۵۲

۱۶۔ "میموریلز آف سو سنگ ٹانگ" جلد گیارھویں، حصہ اول، صفحہ ۵۔

۱۷۔ "سیاؤ سانگ سنگ چی" (تغیر پذیر مناظر کے کوائف) مصنف یو۔ یاؤ چی رقمطراز ہے کہ ۸ نومبر ۱۸۶۳ء کو "ایک غیر ملکی افسر نے شہر سے باہر تائی پنگوں کے تین ترجمانوں کے ساتھ دو اجنبیوں کو بھی گرفتار کیا، ایک گورا اور دوسرا کالی چمڑی والا اور انھیں ضلع لاؤ ہیسن کے حکام کے حوالے کردیا۔"

ملاحظہ فرمائیں "تائی پنگ تین کواؤ" جلد ششم، صفحہ ۵۲۶، مرتبہ "چائنیز

۱۲ر: فتح گڑھ میں جوالا پرشاد اور ٹکا سنگھ کے زیر کمان نانا صاحب کے فوجی دستوں کو شکست۔

۱۶ر: کانپور کی لڑائی اور بٹھور کی جانب نانا صاحب کی فوجوں کی پسپائی۔

۲۷ر: آرہ پر کنور سنگھ کا قبضہ۔

ماہ اگست

۳ر: انگریزوں کی طرف سے آرہ کی خلاصی

۱۳ر: جگدیش پور میں کنور سنگھ کی شکست

۱۶ر: بٹھور میں تانتیا ٹوپے کی شکست

ماہ ستمبر

۱۳ر: سر کولن کیمپ بیل کا فوج کی چیف کمان سنبھالنا۔

۱۴ر: انگریزوں کا کشمیری دروازہ، دہلی کو توپوں سے اڑانا۔

۱۹ر: لاہوری گیٹ برج، دہلی پر انگریزوں کا قبضہ۔

۲۰ر: دہلی پر دوبارہ انگریزوں کا قبضہ

۲۱ر: مقبرہ ہمایوں میں بہادر شاہ کا انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈالنا۔

۲۲ر: میجر ہڈسن کا بہادر شاہ کے بیٹوں کو گرفتار کر کے قتل کرنا۔

ماہ اکتوبر

۲۳ر: انگریزوں کا سکندر باغ میں سے گھس کر لکھنؤ پر دوبارہ قبضہ کرنا۔

۲۶ر: پانڈو کے کنارے تانتیا ٹوپے کو شکست

۲۷ر: تانتیا ٹوپے کا کانپور سے انگریزوں کے پاؤں اکھیڑنا اور اس پر قبضہ کرنا۔

ماہ دسمبر

۶ر: کیمپ بیل کے ہاتھوں کانپور سے تانتیا ٹوپے کے پاؤں اکھڑنا اور اس کا لکشمی بائی کے ساتھ جا ملنا۔

۹ر: کالپی کی لڑائی، تانتیا ٹوپے کی پسپائی۔

سنہ ۱۸۵۸ء، ماہ مارچ

۵ر: مہدی حسین او گونڈہ اور چہروہ کے راجاؤں کا چندا میں برطانوی کیمپ پر حملہ۔

جدول تواریخ

۱۸۵۷ء

ماہ مئی

۹ر: میرٹھ کی ایک رجمنٹ ۔ کے ۸۵ سپاہیوں کا کورٹ مارشل، جنھوں نے چربیلے کارتوسوں کو چھونے سے انکار کیا۔ اُن سپاہیوں کو دس سال قید بامشقت کی سزا دی گئی۔

۱۰ر: میرٹھ کی تین رجمنٹوں کی بغاوت، قیدی سپاہیوں کو آزاد کرانے کے بعد ان کا دہلی کی طرف کوچ۔

۱۱ر: دہلی پر سپاہیوں کا قبضہ، بہادر شاہ کے شہنشاہ ہونے کا اعلان

۱۳-۳۱ر: بغاوت کا مذکورہ ذیل مقامات میں پھیلنا:- فیروزپور، مظفر نگر، علی گڑھ، نوشہرہ اٹاوہ، مین پوری، رڑکی، ایٹہ، نصیرآباد، متھرا، لکھنؤ، بریلی اور شاہجہان پور

ماہ جون

۱-۵ر: مرادآباد، بداؤں، اعظم گڑھ، سیتاپور، نیمچ، بنارس، کانپور اور جھانسی میں شورش۔

۶ر: ناناصاحب کانپور کا محاصرہ کرتا ہے۔

۷-۸ر: جھانسی پر قبضہ، رانی لکشمی بائی کا اقتدار بحال، بادلی سرائے کی لڑائی اور دہلی کے نزدیک رج (پہاڑی) پر انگریزوں کا قبضہ۔

۹-۱۴ر: دریاباد، فتح پور، نوگانگ، گوالیار اور فتح گڑھ میں بغاوتیں۔

۲۶-۲۷ر: ناناصاحب کا کانپور کو فتح کرنا۔

ماہ جولائی

ار: ہتھرس اور اندور میں بغاوت، باغیوں کی طرف سے لکھنؤ ریذیڈنسی کا محاصرہ۔

ماہ اکتوبر

۱۷-۱۹ ء : انگریزوں کا جگدیش پور کا محاصرہ جس کی مدافعت کنور سنگھ کا بھائی امر سنگھ کر رہا تھا۔ امر سنگھ کا بمقام نیناوی شکست کھانا۔

۱۸۵۹ء

ماہ جنوری

۲۱ ء : سیکر کی لڑائی، تانتیا ٹوپے کی شکست

ماہ اپریل

۷ ء : تانتیا ٹوپے کے تئیں راجہ مان سنگھ کی غداری، اور تانتیا ٹوپے کی گرفتاری اور اس کا قیدی بن جانا

۱۸ ء : تانتیا ٹوپے کو پھانسی دی گئی۔

ماہ اکتوبر تا ماہ دسمبر

شمالی اودھ اور نیپال میں باغیوں کے خلاف آخری فوجی کارروائی اور دسمبر میں نانا صاحب کے چار ہزار پیروؤں کی گرفتاری۔

۲۱ر: لکھنؤ پر انگریزوں کا مکمل اختیار
۲۲ر: کنور سنگھ کا اعظم گڑھ پر قبضہ

ماہ اپریل

ار: تانتیا ٹوپے کا بائیس ہزار جوانوں کے ساتھ لکشمی بائی کی مدد کو پہنچنا اور بیٹوا کے کنارے انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانا۔
۳-۵: انگریزوں کا جھانسی پر دھاوا، قلعہ جھانسی کا مفتوح ہونا، لکشمی بائی کا فرار ہونا، اعظم گڑھ میں کنور سنگھ کا انگریزوں کو دوبارہ شکست دینا۔
۲۳ر: جگدیش پور میں کنور سنگھ کا انگریزوں پر ایک اور فتح حاصل کرنا۔
۲۶ر: کنور سنگھ کی وفات۔

ماہ مئی

۶ر: بہادر خاں سے انگریزوں کا بریلی کو فتح کرنا
۱۱ر: انگریزوں کی طرف سے شاہجہانپور کا محاصرہ، جس کی مدافعت مولوی احمد اللہ شاہ کر رہا تھا۔
۲۲ر: کالپی کی دوسری لڑائی لکشمی، نواب باندہ اور راؤ صاحب (بھتیجا نانا صاحب) باغیوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔
۲۴ر: کالپی پر انگریزوں کا قبضہ۔

ماہ جون

ار: رانی لکشمی بائی، راؤ صاحب اور نواب باندا سندھیا گوالیار کو شکست دیتے ہیں گوالیار پر قبضہ کر کے نانا صاحب کے پیشوا ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔
۱۷ر: انگریزوں کا محاصرۂ گوالیار، گوالیار میں رانی جھانسی کا لڑتے لڑتے مارا جانا، تانتیا ٹوپے کا فرار۔
۲ر: انگریزوں کا گوالیار پر دوبارہ قبضہ

ماہ اگست

۲ر: ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات کا برطانوی تاج کے حق میں انتقال
۱۴ر: کواڑا کی لڑائی (ادھے پور) اور تانتیا ٹوپے کی شکست۔

ہماری مطبوعات

جنت سنگار	پروفیسر سیدہ جعفر	180/-
ہندوستان کے دورِ وسطیٰ کے مؤرخین	پروفیسر محب الحسن / مسرور علی ہاشمی	45/-
چکبست	رام لال نابھوی	18/-
چے خف (دوسری طباعت)	ظ۔ انصاری	10/-
حیات جاوید (تیسری طباعت)	الطاف حسین حالی	48/-
خسرو شناسی (دوسری طباعت)	ظ۔ انصاری / ابوالفیض سحر	24/-
دانتے	زیڈ۔ اے۔ عثمانی	8/25
دستنبو (غالب)	(مترجم) پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	12/-
درس بلاغت (تیسری طباعت)	قومی اردو کونسل	47/-
قدیم اردو نظم (حصہ اول)	ڈاکٹر فہمیدہ بیگم	40/-
دکن میں اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	42/-
دکنی ہندو اور اردو	پروفیسر نصیر الدین ہاشمی	15/50
دکنی نثر کا انتخاب	پروفیسر سیّدہ جعفر	45/-
انیس کے سلام	علی جواد زیدی	60/-
انیس کے مرثیے اوّل (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	36/-
انیس کے مرثیے دوم (دوسری طباعت)	صالحہ عابد حسین	40/-
بہار میں اردو زبان وادب کا ارتقاء	پروفیسر اختر اورینوی	18/-
بیسویں صدی میں اردو ناول	ڈاکٹر یوسف سرمست	58/-



Price : Rs. 75/-